جلد سوم

بابت اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء

اردو

انجمن ترقی اردو

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرست مضامین

تنقید شعر العجم

از

جناب حافظ محمود صاحب شیرانی

و

پروفیسر ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا

چوتھا دور

قولہ "اُس عہد میں فارسی زبان کی ترقی کی ایک اور وجہ یہ ہوئی کہ اب تک تمام اسلامی سلطنتوں کی علمی اور دفتری زبان عربی تھی، سلطان محمود اپنے ملکی اور فوجی خصوصیات کا بت ؟ لداد ؟ تھا، تاہم دفتر کی زبان اس کے عہد میں بھی عربی رہی۔ فرامین اور توقیعات تک اسی زبان میں لکھے جاتے تھے، لیکن الپ ارسلان سلجوقی جب تخت نشین ہوا تو اُس نے حکم دیا کہ دفتر کی زبان فارسی کر دی جائے۔" (ص ۲۰۹ شعر العجم)

سلطان محمود کے دَور میں ابتدائی دس گیارہ سال تک دفتر کی زبان فارسی تھی، کیونکہ سلطان کے وزیر اول ابو العباس فضل بن احمد کو عربی کا علم نہ تھا، اس لیے تمام تحریرات فارسی ہی میں تھیں ۴۰۱ھ سے ابو القاسم احمد بن حسن میمندی وزیر ہوئے چونکہ وہ عربی داں تھے، اس لئے فارسی ترک کر دی گئی

اور عربی کا رواج ہوا۔ تاہم فارسی کا استعمال قطعاً متروک نہیں ہوا۔ اور ایسی حالتوں میں جب کہ مکتوب الیہ فارسی داں ہوتا تمام تحریرات فارسی ہی میں بھیجی جاتی تھیں۔

گزشتہ بالا بیان میں نے تاریخ یمینی سے نقل کیا ہے، لیکن تاریخ بیہقی کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان مسعود کے زمانے میں، دربار غزنہ کی زبان فارسی ہی تھی، میرا مطلب یہ ہے کہ دربار میں عربی سے زیادہ فارسی کا رواج تھا۔ جب خلیفہ قادر باللہ وفات پاتا ہے، اور قائم بامر اللہ اس کا جانشین ہوتا ہے، بارگاہ خلافت سے ایک سفیر مع فرمان خلیفہ آتا ہے، یہ فرمان عربی میں تھا، چنانچہ اس کو اصل عربی میں سنائے جانے کے بعد سلطان مسعود کی خواہش پر اس کا فارسی ترجمہ سنایا جاتا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ غزنین میں عربی کم سمجھی جاتی تھی۔ بیہقی کے الفاظ یہ ہیں:

"امیر خواجہ بونصر را آواز داد، پیش تخت شد، ونامہ بستد، و بازپس آمد، وروے فرا تخت بایستاد، وخریطہ بگشاد، ونامہ بخواند، چوں بپایاں آمد، امیر گفت، ترجمہ اش بخواں، تا ہمگنان را مقرر گردد، وبخواند بپارسی، چناں کہ اقرار دادند شنوندگان کہ کسے را ایں کفایت نیست" (ص ۳۹۲)

اسی طرح سلطان مسعود اپنے بیعت نامہ کی جب دربار عام میں تصدیق کرتا ہے تو ابونصر مشکانی اصل عربی کو پڑھکر سناتا ہے لیکن اس کے فارسی ترجمہ کو خود سلطان مسعود پڑھکر حاضرین کو سناتا ہے چنانچہ:۔

"امیر گفت، شنودم وجملہ آں مرا مقرر گشت، نسخۂ پارسی مرا دہ، بونصر بدو بازداد و امیر مسعود خواندن گرفت و از بادشاہان ایں خاندان رضی اللہ عنہم ندیدم کسے کہ پارسی چناں خواندے و نبشتے کہ وے نسخۂ عہد را تا آخر بزبان راند، چناں کہ ہیچ قطع نہ کرد، وپس دوات خاصہ پیش آوردند، ودر زیر آں بخط خویش تازی و پارسی ہم زیر آنچہ از بغداد آوردہ بودند وہم زیر آنچہ استادم ترجمہ کردہ بود نبشت۔"

بیعت نامہ کا اصلی عربی مسودہ اگرچہ بغداد سے طیار ہوکر آتا ہے، لیکن سلطان مسعود عہد بیعت کرتے وقت اس کے فارسی ترجمہ کو ترجیح دیتا ہے، چنانچہ فارسی عہدنامہ کو سر دربار پڑھکر سناتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دربار غزنہ میں فارسی ہی درباری زبان مانی جاتی تھی، علاوہ ازیں بیہقی میں اور

بیسوں خطوط ہیں جو سلجوقیوں، غزنویوں اور طبرستانیوں کے درمیان آتے جاتے ہیں، لیکن یہ سب فارسی میں ہیں، جس سے بوثوق کہا جاسکتا ہے کہ کم از کم مسعود کے دور میں فارسی زبان ہی درباری زبان تھی۔

قولہ "سنجر کی شاعرانہ مذاق اور قدر دانی کی داستانیں اکثر تذکروں میں مذکور ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری کی قدر و قیمت اس کے دربار میں کیا تھی۔

ایک دفعہ ارکان دولت کے ساتھ، عید کا چاند دیکھنے نکلا، سب سے پہلے ہلال پر اسی کی نظر پڑی خوشی سے اچھل پڑا، سب کو انگلی کے اشارہ سے بتایا، ساتھ ہی حکم دیا کہ کوئی شاعر فی البدیہہ ہلال کی تعریف میں شعر سنائے معزی اس وقت تک دربار میں امیدواری کرتا تھا، موقع پا کر اس نے برجستہ کہا:

اے ماہ چو ابروانِ یارے گوئی یا ہیچو کمان شہر یارے گوئی
نعلے زدہ از زر عیارے گوئی در گوشِ سپہر گوشوارے گوئی

یعنی اے چاند تو ابروئے معشوق ہے یا بادشاہ کی کمان یا سونے کی نعل یا آسمان کے کان کا آویزہ۔

سنجر نے اسپ خاصہ اور پانچ ہزار درہم عطا کئے، معزی نے پھر برجستہ کہا:

چوں آتشِ خاطرِ مرا شاہ بدید از خاک مرا بر زبر ماہ کشید
چوں آب یکے ترانہ از من بشنید چوں باد یکے مرکب خاصم بخشید

سنجر نے ہزار دینار کے عطیہ کے ساتھ حکم دیا کہ شاہی لقب اس کے خطاب میں شامل کیا جائے۔ چونکہ سنجر کا لقب معزالدین بھی تھا، اس لئے معزی لقب ملا جو آج تخلص ہو کر مشہور ہے" شعرالعجم (ص ۲۱۰ و ۲۱۱)

حکایت بالا سلطان سنجر سے علاقہ نہیں رکھتی ہے بلکہ نظامی عروضی جو اس قصہ کا سب سے قدیم راوی ہے اور جو تمام قصہ خود امیر معزی کی زبان سے سنتا ہے، سنجر کے باپ ملک شاہ کی طرف منسوب

کرتا ہے، اس کے علاوہ نظامی کے اور مولانا کے بیانات میں اور بھی ضمنی اختلافات ہیں۔

ایک موقعے پر امیر معزی نظامی سے اپنی سرگزشت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میرے باپ امیر الشعرا برہانی نے ابتداے عہد سلطنت سلطان ملک شاہ میں اپنی وفات کے وقت مجکو اس مشہور قطعے کے ذریعے سے جس کا ایک بیت یہ ہے۔

من رفتم و فرزند من آید خلف الصدق　　　او را بخدا و بخداوند سپردم

سلطان ملک شاہ کے سپرد کر دیا، اس کی وفات کے بعد اس کی تنخواہ اور چندی میرے نام کر دی گئی اور بادشاہی شاعر بن گیا۔ اگرچہ سال بھر برابر حاضر رہا، لیکن بادشاہ کا دیدار دُور سے بھی مجکو میسر نہ آیا اور تنخواہ سے ایک دینار تک موصول نہیں ہوا، اور قرض برابر بڑھتا گیا۔ رمضان سے ایک یوم قبل میں شہزادہ علاء الدولہ امیر علی فرامرز کی خدمت میں حاضر ہوا، یہ شہزادہ شعر دوست ہونے کے علاوہ سلطان کا داماد اور ندیم خاص تھا، دربار میں اس کی بڑی عزت تھی اور میرے ساتھ مہربانی سے پیش آیا کرتا تھا۔ میں نے اس سے عرض کی کہ یہ بہت مشکل ہے کہ جو وصف باپ میں ہو بیٹے میں بھی ہو بات یہ ہے کہ امیر برہانی میرا باپ نہایت ہوشیار آدمی تھا، اور سلطان شہید الپ ارسلان فن شعر میں اس کا معتقد بھی تھا۔ میں شرمیلا اور خاموش طبیعت کا واقع ہوا ہوں، سال بھر خدمت گزاری کرتے گزری ہے، تنخواہ سے ایک حبہ وصول نہیں ہوا ہے اور مفت میں ہزار دینار کا قرضدار ہو گیا ہوں، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر سلطان سے اجازت دلوا دیں تاکہ نیشاپور چلا جاؤں اور اپنا قرض ادا کرنے کی کوئی سبیل نکالوں۔ امیر علی نے جواب میں کہا یہ ہمارا قصور ہے کہ اب تک تیری طرف سے غفلت برتی گئی۔ لیکن اطمینان رکھ کہ آیندہ ایسا نہیں ہوگا، آج مغرب کے وقت بادشاہ چاند دیکھنے نکلے گا، تو حاضر رہنا دیکھیں خدا کیا کرتا ہے۔ شہزادے کے حکم سے سو دینار نیشاپوری مجکو اسی وقت مل گئے، میں خوش خوش گھر آیا، اور رمضان کے بند و بست میں مصروف ہو گیا، عصر کے قریب سراپردۂ سلطانی پر آکر حاضر ہو گیا، شہزادہ علاء الدولہ بھی اسی وقت آیا۔

میں اب نظامی کی اپنی عبارت نقل کرتا ہوں:

"آفتاب زرد سلطان از سراپردہ بدر آمد، کمان گروہہ در دست علاء الدولہ بر راست من بدویدم و خدمت کردم، امیر علی نیکو ثناہا پیوست و بماہ دیدن مشغول شدند، و اول کسے کہ ماہ دید سلطان بود، عظیم شادمانہ شد علاء الدولہ مرا گفت، پسر برہانی دریں ماہ نو چیزے بگوے من بر فور ایں دوبیتے بگفتم:

اے ماہ چو ابروان یاری گوئی　　یا نی چو کمانِ شہریاری گوئی

نعلے زدہ از زر عیاری گوئی　　در گوشِ سپہر گوشواری گوئی

چوں عرضہ کردم، امیر علی بسیارے تحسین کرد، سلطان گفت برو از آخر ہر کدام اسپ کہ خواہی بکشائے، و دریں حالت بر کنار آخر بودیم، امیر علی اسپے نامزد کرد، بیاوردند و بکسانِ من دادند، ارزیدے سی صد دینار نشاپوری، سلطان بمصلّی رفت و من در خدمت، نماز شام بگزاردیم و بخوان شدیم، بر خوان امیر علی گفت پسر برہانی دریں تشریفے کہ خداوند جہاں فرمود ہیچ نگفتی حالی دوبیتے بگوے من بر پاے جستم و خدمت کردم و چنانکہ آمد حالے ایں دوبیتے بگفتم۔

چوں آتشِ خاطر مرا شاہ بدید　　از خاک مرا بر زبر ماہ کشید

چوں آب یکے ترانہ از من بشنید　　چو باد یکے مرکب خاصم بخشید

چوں ایں دوبیتے ادا کردم، علاء الدولہ استنہا کرد و لبسبب احسنت او سلطان مرا ہزار دینار فرمود علاء الدولہ گفت جامگی و اجراش نرسیدہ است فردا بر دامنِ خواجہ خواہم نشست تا جامگیش از خزانہ بفرماید و اجراش بر سپاہاں نویسد، گفت مگر تو کنی کہ دیگراں را ایں جست نیست و او را بلقب من باز خوانید و لقب سلطان معز الدنیا والدین بود، امیر علی مرا خواجہ معزی خواند، سلطان گفت امیر معزی، آں بزرگ بزرگ زادہ چناں ساخت کہ دیگر روز نماز پیشیں ہزار دینار بخشیدہ و ہزار و دویست دینار جامگی و برات نیز ہزار من غلہ بمن رسیدہ بود و چوں ماہ رمضان بیروں شد مرا بہ مجلس خواند و با سلطان ندیم کرد

واقبال من روئے در ترقی نہاد و بعد ازاں پیوستہ تیمارِ من ہمی داشت و امروز ہر چہ دارم از عنایتِ آں بادشاہزادہ دارم،، (چہارم مقالہ طبع لیدن ص ۴۳ و ۴۴)

قولہ "غزل گوئی کی ایجاد گو سعدی سے منسوب ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس صنم کدہ کے آذر نظامی ہی ہیں" ص (۲۱۴)

تغزل میں نظامی کسی خاص امتیاز کے مستحق نہیں کیونکہ غزل کے پہلے باغبان شہید، رودکی اور دقیقی ہیں۔ غزنوی دور میں عنصری بلکہ خود سلطان محمود کو اس کی آبیاری میں مصروف دیکھا جاتا ہے حکیم سنائی زیادہ تر زہدیات اور کمتر تصوف کی مضامین کی اس میں اشاعت دیتے ہیں، مجاز کے پردے میں حقیقت کے اسرار کی ترجمانی ان سے شروع ہو جاتی ہے، انوری کے ہاں سوز و گداز اور تعشق محض ہے اور یہ عطار ہیں جو غزل کو میخانہ کا راستہ بتاتے ہیں، رندوں کے آغوش میں پرورش کرتے ہیں اور حقیقت و مجاز کی دوعملی میں اس کا نشیمن آباد کرتے ہیں، مولانا روم اور عراقی بادۂ تند کے ساغر پلا پلا کر اسے مست سرمدی بنا دیتے ہیں، حقیقت و مجاز ایک دوسرے سے ایسے گھل مل جاتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے امتیاز کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نظامی نے غزل کی کوئی خدمت نہیں کی۔ لیکن سنائی، انوری اور خاقانی کے مقابلہ میں انھوں نے کوئی امتیازی رتبہ حاصل نہیں کیا، اس لئے اس میدان میں نظامی کسی خاص شکریہ کے مستحق نہیں ہیں۔

حکیم سنائی

دیوانۂ لاے خوار کے قصہ کے ذکر کے بعد جس کو بسبب کثرت شہرت قلم انداز کیا جاتا ہے علامہ شبلی فرماتے ہیں:

قولہ "حکیم سنائی پر یہ اثر ہوا کہ اسی وقت سب چھوڑ چھاڑ کر گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گئے اور یہ رتبہ حاصل کیا کہ یا تو بہرام شاہ کے دربار میں بھٹی کرتے تھے یا بہرام شاہ نے اپنی بہن کو

ان کے عقد نکاح میں دینا چاہا اور انھوں نے انکار کیا، چنانچہ بہرام شاہ کو جواب میں لکھا:

من نہ مرد زن و زر و جاہم　　بخدا اگر کنم وگر خواہم
گر تو تاجم دہی ز احسانم　　بسرِ تو کہ تاج نستانم　　(شعر العجم ص ۲۱۷)

مجکو اس قصہ پر یقین لانے میں بہت کچھ تامل ہے، اس لئے کہ یہ اشعار حدیقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور حدیقہ حکیم سنائی نے ساٹھ سال کی عمر میں تصنیف کیا ہے چنانچہ **اشعار**

روزگار م حسود و بیباکم　　از دلِ شوخ جان غمناکم　　کرد پشتم کمان و گام چو تیر　　کرد رویم چو قیر و موے چو شیر
پائے بر بام آمد از شصت　　لاجرم دست میزنم بر دست　　(حدیقہ ص ۵۹۶)

دیگر

عمر دادم بجملگی برباد　　بر من آمد ز شصت صد بیداد　　(ص ۵۹۸)

عمر کی زیادتی بجائے خود اہم مانع ہونے کے علاوہ جس موقعہ پر ان کا ایراد ہوا ہے وہاں متن میں کوئی ایسا ایما نہیں پایا جاتا جس سے یہ گمان کیا جائے کہ ان اشعار کا مخاطب سلطان بہرام شاہ غزنوی ہے۔ تنہا ان اشعار کی بنا پر نتیجۂ بالا قائم کرنا خالی از غرابت نہیں ہے۔ یہ اشعار "قناعت" کے عنوان کے ذیل میں آتے ہیں اور زیادہ تر ایسا پایا جاتا ہے کہ ان میں کسی خاص بادشاہ کی طرف خطاب نہیں ہے۔ انہی ابیات کے بعد یہ اشعار آتے ہیں۔

زاں کہ چوں طوقِ منت بکشم　　لقمۂ خوانِ نعمتت بچشم　　بنوم بہرِ طمع مدحت گوئے　　ایں نیابی ز من جز از من جوئے
(حدیقہ ص ۶۱۱)

الغرض یہ اشعار اسی طرح چلے گئے ہیں اور ان سے کوئی صریحی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ شاعر کا اصل مقصد قناعت کی تعلیم و تلقین ہے اور بادشاہی خدمت سے اعراض و اغماض وغیرہ وغیرہ

قولہ "حکیم سنائی نے جب حدیقہ تصنیف کیا تو چونکہ اس میں ایسی باتیں بھی ہیں جو عام عقائد کے خلاف ہیں، اس لئے علما نے سخت مخالفت کی یہاں تک کہ بہرام شاہ تک شکایت پہنچی بہرام شاہ نے، دار الخلافہ بغداد سے استفتا طلب کیا، وہاں کے علما نے لکھا کہ یہ مسائل

قابل اعتراض نہیں ،،   (شعر العجم ص۲۱۵)

جہاں تک تذکروں سے معلوم ہے، بہرام شاہ نے دار الخلافۃ سے استفتا طلب نہیں کیا ہے خود دولت شاہ جس سے غالباً مولانا نے یہ قصہ نقل کیا ہے کہتا ہے :

"چوں کتاب حدیقہ تمام کرد، علماء ظاہر غزنین بر حکیم طعن کردند و اعتراض کردند و آں کتاب را بدار السلام بغداد فرستاد و بدار الخلافۃ عرض کرد و از علماء بغداد و ائمۂ آں دیار بر صحت عقیدۂ خود فتوی حاصل کرد ،،

مخزن الغرائب میں لکھا ہے ۔

"چوں کتاب حدیقہ را با تمام رسانید، بمطالعۂ علماء ظاہر غزنین درآمد، زبان طعن براو دراز کردند و بہ کفر و الحاد منسوب نمودند، خواستند او را تشہیر کنند، او بعلماء غزنین گفت کہ چرا مرا ملامت و سرزنش می کنید، گفتند تو در حدیقہ خلاف شرع گفتۂ ، گفت کتاب حدیقہ را بعلماء دار السلام بغداد عرض می دارم، اگر علماء آنجا بر کفر من فتوی دہند ہر چہ سزائے ما باشد بجا رسانید، پس حدیقہ را بدار الخلافۃ بغداد فرستاد، و از علماء بغداد و ائمۂ آنجا بر صحت عقیدۂ خود فتوی ساخت ، علماء و ائمۂ آنجا بر صحت عقیدہ و بہ ثبوت ایمان و مذہبش دستخط و مواہیر نمودند، ازاں سرزنش و بلیۃ نجات یافت ،،

مزید ثبوت کی ضرورت کے وقت خود حکیم سنائی کا قول نقل کیا جا سکتا ہے ، اس بارہ میں حدیقہ کے خاتمہ میں کافی اطلاع موجود ہے ۔

سنائی امیر برہان الدین ابو الحسن بن ناصر الغزنوی الملقب بہ بریانگر کو خطاب کرکے کہتے ہیں ۔

اے تو بر دینِ مصطفےٰ سالار   بر طریقِ برادراں کن کار
عہد دیرینہ را بیاد آور   از طریقِ برادری مگذر
دین حق را بحق توئی برہاں   مر مرا زیں عقیلہا برہاں
تو بہ بغداد شاد و من ناشاد   خود نگوئی و را رسم فریاد
سال و مہ ترسناک و اندہگیں   گشتہ محبوس تربتِ غزنیں
(ص ۴۵۶ ۔ نولکشور)

بدایونی نے غالباً اس شعر سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کتاب حدیقہ سنائی نے اپنے حبس کے ایام میں

لکھی تھی، منتخب التواریخ میں بہرام شاہ کے ذکر میں لکھتے ہیں :

"و حدیقۃ الحقیقۃ شیخ بنام اوست که در ایام حبس فرموده وجہت حبس شیخ تعصب غزنویہ بوده در وادی تسنن"۔ (ص ۲۱ طبع نولکشور)

چشم دارم که کار گرد وصل — گرچه هستم اسیر هر نااہل — وز میان این حجابہا بردار — مکن آخر برادری پیش آر

حق نان و نمک فرو مگزار" — عہدہائے قدیم را یاد آر — بسر من که تو نه معذوری — تا کے این انقباض و این دوری

اس کے بعد حدیقہ کے ذکر میں کہتے ہیں :

کرده ام جملہ خلق را معلوم — ہرچه دانستہ ام ز نوع علوم — چون رخ حور دلبر و دلبند — این کتابے که گفتہ ام در پند

مجلس عقل را یکے شمع ست — اندرین نامہ جملگی جمع ست — وز مشائخ ہر آنچه آثارست — آنچه نص ست و آنچه اخبارست

ہمچو قرآن پارسی دانش" ص۸۵۲ — یک سخن زین و عالمے دانش — حرز و تعویذ خویشتن دانند — ملکوت این سخن چو برخوانند

اصل مطلب کی طرف رجوع کرتے ہوئے گویا ہیں :

ہمچو قرآں ورا کنند تعظیم — وآں که باشد سخن شناس و حکیم — وز سر جہل ریشخند کنند — "جاہلاں جملہ ناپسند کنند

تو برو شکر کن بر ایشاں خند — ہر شاں لفظ ار بود تر قند — گو مکن نیست بہتر از قرآں — گر کند طعنہ اندریں ناداں

جان من باد جانش را بفدا — بندہ را مدح مصطفےٰ ست غذا — بتوند از حدیث من شاداں — نخورم غم گر آلِ بوسفیاں

ہم بریں بد بدارایم یارب" ص۸۵۳ — گر بدست ایں عقیدہ و مذہب — وز بدی خواہ آل بیزارم — آں او را بجاں خریدارم

اس کے بعد امیر بربانگر سے استفتا کرتے ہیں :

در گنج علوم بکشادم — گفتم این و بر تو فرستادم — نیست اندر سخن مجال سخن — تو چه گوئی بیار و فتویٰ کن

خود ندیدی بجملہ باد انکار — ور پسند تو نآید این گفتار — جان من رستہ از گزند آید — گر ترا این سخن پسند آید

عرض کن بر ہمہ شریف و وضیع — ندہم بیش ازیں ترا تصدیع — نیک و بد در جواب باز نمائے — این سخن را مطابقت فرمائے

ص۸۵۴ — جملہ بر گفتنش آنچه مقصود ست — گوئی این اعتقاد محمود ست

حکیم سنائی ایک معلم کے فرزند تھے، جیسا کہ حدیقۃ الحقائق کے دیباچہ میں ارشاد کرتے ہیں، حدیقہ آپ نے خواجہ رئیس احمد بن مسعود مبتہ کی فرمائش سے لکھا ہے [۵]

لیکن کنوں زبس کرمش زیر تیشہ ام   خواجہ رئیس احمد مسعود بیشہ را

اس کتاب کی تصنیف کے زمانے میں خواجہ احمد ہی ان کی جملہ ضروریات کے متکفل تھے، سنائی اس کی تصنیف پر قریباً دس سال یعنی ۵۲۴ھ سے ۵۳۵ھ تک مصروف رہے ؎

پانصد و بست و چار رفتہ زعام   پانصد و سی و پنج گشتہ تمام

بعض نسخوں میں آخری مصرع یوں آتا ہے ع

پانصد و بست و پنج گشتہ تمام

حدیقہ میں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض اشعار الحاقی بھی ہیں، مثلاً جنگ جمل کے واقعات کے ذکر میں شاعر نے تمام معتبر تاریخوں سے اختلاف کیا ہے۔ جنگ جمل (۳۶ھ) میں حضرت عائشہؓ و حضرت طلحہؓ و حضرت زبیرؓ ایک فریق تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک فریق۔

حدیقہ میں حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہ کو ایک فریق قرار دیا ہے اور کہا گیا ہے کہ حضرت معاویہ اس جنگ میں فرار ہوتے ہیں اور بغداد کی طرف چلے جاتے ہیں ؎

در جمل چوں معاویہ بگریخت   خونِ ناحق بسے بخیرہ بریخت
شد ہزیمت بجانب بغداد   گشتہ از فعل زشت خود ناشاد

ص ۲۸۰

جب حضرت عائشہؓ کے اونٹ کی کوچیں کاٹ دی جاتی ہیں اور ہودج گرتا ہے، ام المومنین امان مانگتی ہیں حضرت علی، حضرت محمد بن حضرت ابوبکرؓ کو بلواتے ہیں اور محمد آکر چاہتے ہیں کہ بہن کا سر کاٹ لیں، لیکن حضرت علی منع کرتے ہیں۔

جمل آں ستیزہ راپے کرد   برگ و ساز معاویہ نے کرد
ہودج زن بخاک تیرہ فتاد   وز خجالت نقابِ رخ نکشاد

گفت بد کردہ ام امانم دہ   وز ترحم کنوں زمانم دہ
چوں بدیدند زود برگشتند   در خوی و خون ہمہ بیاغشتند

زاں حیدر برادرش را زود   جملہ احوال او را بنمود
رفت وقتے محمدِ بو بکر   آں ہمہ صدق و فارغ از ہمہ مکر

پس برآہیخت تیغ تا بزند   گفت حیدر مکن کس ایں نکند
عفو کن تا بسوئے خانہ رود   بعد ازیں کارہائے بد نکند

(ص ۲۸۰)   (نفیس خاں)

حضرت محمد پھر اپنی بہن کو مکہ معظمہ کی طرف بھجواتے ہیں آپ جب مکہ پہنچ جاتی ہیں، کچھ عرصہ بعد حضرت معاویہ

آپ کو قتل کر دیتے ہیں ؎

برگرفتش محمد از سرِ راہ — جملہ لشکر شدہ ز کار آگاہ
بسوئے مکہ زود نفرستاد — در تواضع محل رو ننہاد
باہزاران خجالت و تشویر — رفت زی مکہ جفت گرم و زحیر
عاقبت ہم بدست آں باغی — شد شہید و بکشت آں طاغی
آں کہ با جفت مصطفٰے زنساں — بدکند مرد را مبر و مخواں (ص ۲۸۱)

شاعری کی ایک اور اہم خدمت، جو سنائی نے کی ہے، تغزل ہے۔ سنائی کے عہد سے پیشتر غزل کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ لیکن اس صنفِ سخن نے ان کے ہاں مستقل شان پیدا کر لی ہے۔ بلحاظ زبان ان کی غزل، قطعہ، اور قصیدہ میں، متقدین کی طرح کوئی تفاوت نہیں دیکھا جاتا ہے۔ تخلص کا رواج، غزل کے مقطع میں سب سے پیشتر انھی کے ہاں پایا جاتا ہے۔ واردات حقیقت کو مجاز کی زبان میں ادا کرنا انھی سے شروع ہوتا ہے، اگرچہ مذاق میں زہدیات غالب ہے تاہم تغزل کو خرابات کا راستہ بتانے والے حکیم سنائی ہیں۔ عرفان اور رندی کی آمیزش کے قدیم ترین نمونے انھی کے کلام میں ملتے ہیں۔ عطار اور مولانا روم انھی کی بنیادوں پر قصر و ایوان تعمیر کرتے ہیں۔ قصہ مختصر سنائی کے ہاں شاعری بلحاظ غزل ایک نئی کروٹ لیتی ہے۔ زہد خشک کا خاتمہ ہوتا ہے اور رندی اور مستی کی داغ بیل ڈال دی جاتی ہے، صومعہ چھوڑا جاتا ہے۔ میخانہ آباد کیا جاتا ہے۔ زاہد سے اعتزال ہوتا ہے، اور خرابات نشینی اختیار کی جاتی ہے۔ امثال

در دل آں را کہ روشنائی نیست — در خرابات آشنائی نیست
پسرا خیز و جام بادہ بیار — کہ مرا برگ پارسائی نیست
جرعۂ مے بجان و دل بخرم — پیش کس مے بدیں روائی نیست

دیگر

اے ساقی، مے بیار پیوست — کاں یار عزیز توبہ بشکست
برخاست زجائے زہد و دعویٰ — در میکدہ با نگار بہ نشست
بنہاد ز سر ریا و طامات — از صومعہ ناگہاں برو جست
بنہاد ز پائے، بند تکلیف — زنار مغانہ بر میاں بست

مے خورد و مرا بگفت، مے خور   تا بتوانی مباش جز مست

اندر رہِ نیستی ہمی رو   آتش در زن بہر چہ وے ہست

میرزا محمد حواشی چہار مقالہ (ص۱۵۱) میں لکھتے ہیں کہ ان کی وفات باصح اقوال ۵۴۵ھ میں ہوئی ہے۔

امیر معزی المتوفی ۵۴۲ھ کے مرثیہ میں سنائی نے یہ اشعار لکھے ہیں:

تا چند معزائے معزی کہ خدا اش   زیں جا بفلک برد و قبائے ملکی داد

چوں تیرِ فلک بود قرینش سرہ آورد   پیکاں ملک برد و بہ تیرِ فلکی داد

بہرام شاہ غزنوی کے علاوہ انھوں نے سلطان سنجر کی بھی مداحی کی ہے، ایک قصیدہ جس کا مطلع ہے ؎

خاک را از باد بوئے مہربانی آمدہ است   در دہ آں آتش کہ آبِ زندگانی آمدہ است

سنجر کے ابتدائی تخت نشینی کے ایام میں لکھا گیا ہے، جیسا کہ فرماتے ہیں ؎

چوں بسلطانی نشستی تہنیت گویم ترا   اے کہ اسلافِ ترا سلطاں نشانی آمدہ است

خواجہ احمد معروف بہ عارفِ زرگر اور قاضی فضل بن یحییٰ بن صاعد اور علی بن ہیصم ہروی کے ساتھ سنائی نے قصائد تبدیل کئے ہیں۔ شیخ الاسلام جمال الدین ابوالمفاخر، محمد بن منصور سرخسی مفتی مشرق کی تعریف میں سنائی نے ایک سے زیادہ ترکیب بند لکھے ہیں اور بقول پروفیسر سر محمد اقبال ام اے۔ پی ایچ ڈی مثنوی سیر العباد الی المعاد بھی انھی محمد بن منصور کے نام لکھی ہے۔ (حواشی راحت الصدور (ص۴۷۴ طبع یورپ)

عمر خیام

از

پروفیسر شیخ سر محمد اقبال ام اے، پی ایچ ڈی

پنجاب یونیورسٹی نے مشرقی علوم و فنون کی سرپرستی کے لئے جو صحیح راستہ اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ عربی، فارسی، اور سنسکرت کی تعلیم کے لئے یورپی ڈگریوں والے اصحاب کو یونیورسٹی پروفیسر مقرر کیا ہے۔ ان اصحاب میں عربی کا صیغہ پروفیسر محمد شفیع ام اے کی ذات گرامی سے

سے مشرف ہے اور فارسی صیغہ پروفیسر محمد اقبال ام اے، پی ایچ ڈی سے تعلق رکھتا ہے۔

پروفیسر اقبال گزشتہ سال کیمبرج سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر تشریف لائے ہیں۔ آپ نے فارسی زبان میں سلجوقیوں کی سب سے قدیم تاریخ المسمیٰ بہ ''راحت الصدور وآیۃ السرور'' تالیف محمد بن علی بن سلیمان الراوندی کو جو ۵۹۹ھ میں تصنیف ہوئی ہے، نہایت قابلیت اور محنت کے ساتھ شائع کیا ہے اور علمی تحقیقات و تلاش کی پوری پوری داد دی ہے۔

میری درخواست پر آپ نے عمر خیام کے متعلق، مولانا شبلی کے تصنیف پر یہ چند انتقادیہ خیالات ظاہر کئے ہیں۔

محمود شیرانی

اسلامی دنیا کے تمام گزشتہ شاعروں اور ادیبوں میں خیام کی ہستی بالکل یکتا ہے۔ ایران کے اس شاعر فیلسوف کو جو شہرت آج حاصل ہے اور جتنا لٹریچر اس کی شخصیت، اس کے ذاتی حالات، اس کے مذہبی، اخلاقی اور فلسفی خیالات پر گزشتہ پچاس سال کے عرصے میں یورپ کی مختلف زبانوں میں لکھا جا چکا ہے اس کو اگر ایک جگہ جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب خانہ بن سکتا ہے۔

لیکن یہ جو کچھ اب تک ہوا ہے سب اہل مغرب کی تحقیق اور کاوش کا نتیجہ ہے۔ مسلمان بلکہ خود اہل ایران جن کے لئے خیام کے کمالات مایۂ ناز ہو سکتے تھے شروع ہی سے اس کی شخصیت کی طرف سے بے اعتنائی کا اظہار کرتے چلے آئے ہیں۔ فارسی یا عربی تذکرہ نویسوں نے مستقل طور سے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا، مورخوں نے اس کو بالکل پس پشت ڈالا، اس کی رباعیات کا کوئی ایسا نسخہ جس پر ذرا سا بھی اعتبار کیا جا سکے محفوظ نہیں رکھا گیا اور سخت افسوس کا مقام ہے کہ اب بھی جب کہ یورپ خیام کو ہم سے روشناس کرا چکا ہے اور اس کی خوبیوں کو تمام و کمال ہمارے ذہن نشین کر چکا ہے، ہماری بے توجہی بدستور چلی جا رہی ہے۔ ہر چند یہ ہمارے لئے شرم کی بات ہے کہ ہماری اپنی زبان اور اپنے ملک کی ادبیات کی تنقید میں اجنبی لوگ ہمارے مذاق کی رہنمائی کریں لیکن اس سے

بھی بڑھکر شرمناک امر یہ ہے کہ ہم ان کی رہنمائی کے ممنون نہ ہوں اور اس سے فائدہ نہ اٹھائیں۔ اپنی ذاتی تحقیق کا قدم آگے بڑھانا اور اپنے پیشرو محققوں کی غلطیوں کی تصحیح کرنا یا ان کے ذخیرۂ انکشافات میں اضافہ کرنا ہر صاحب تصنیف کا فرض ہے لیکن اگر وہ ایسا نہ کرسکے تو اس درجہ قابل الزام نہیں جتنا کہ یہ امر قابل اعتراض ہے کہ اُن معلومات کو جو پہلے سے مہیا کی جاچکی ہوں نظرانداز کیا جائے۔

یہی وہ اعتراض ہے جس کے مورد مولانا شبلی اپنی مشہور کتاب شعر العجم میں خیام کے حالات لکھنے میں ہوئے ہیں۔ مولانا شبلی اُردو ادیبوں میں واحد شخص ہیں جنھوں نے اسلام کی تاریخ اور خصوصاً عجم کی شاعری پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ اُن کے فضل وکمال سے ہم کو توقع تھی کہ خیام جیسے بے نظیر صاحب کمال کے بارے میں جس کی شخصیت کے متعلق علمی دنیا اس قدر گہری دلچسپی کا اظہار کر رہی ہے، ہماری معلومات میں اضافہ کرینگے اور اپنی فاضلانہ تنقید سے اُن شکوک کو رفع کرینگے اور اُن غلط روایتوں کی تردید کرینگے جو خیام پرستوں کے اعتقادات میں شامل ہیں۔ لیکن شعر العجم کو دیکھنے سے ہمیں مایوسی ہوتی ہے کہ جو تفاصیل خیام کے حالات میں ہم کو اس میں ملتی ہیں وہ اس کی رباعیات کے ہر معمولی دیباچہ نویس نے لکھی ہیں بلکہ کچھ زیادہ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

خیام کے حالات میں سب سے پہلے مولانا شبلی نے وہ مشہور قصہ لکھا ہے جس میں بیان کیا جاتا ہے کہ حسن بن صباح نظام الملک وزیر اور خیام تینوں ایک ہی مکتب میں ہم سبق تھے اور انھوں نے زمانۂ طالب علمی میں عہد کیا تھا کہ ہم میں سے جو ترقی پاکر کسی بڑے منصب پر پہونچے وہ اپنے ساتھیوں کی دستگیری کرے۔ مولانا نے محض ایک مقبول عام روایت کو مختصر طور سے لکھ دینے پر قناعت کی۔ حالانکہ یہ قصہ معاً اس قدر عجیب اور اس درجہ مورد شکوک ہے کہ ایک علمی تصنیف میں اس پر بہت لمبی چوڑی تنقید ہونی چاہیئے۔

یہ قصہ تاریخ اور تذکرہ کی متعدد کتابوں میں منقول ہے مثلاً تاریخ گزیدہ، روضۃ الصفا، حبیب السیر اور تذکرہ دولت شاہ سمرقندی وغیرہ میں۔ لیکن قدامت کے اعتبار سے سب سے پہلے اس کو صاحب جامع التواریخ نے (جو آٹھویں صدی ہجری کے شروع میں تصنیف ہوئی) لکھا ہے۔ اگرچہ جامع التواریخ ایک مستند کتاب ہے اور اس کے مصنف کی ثقاہت مسلمہ ہے تاہم یہ قصہ ایسا سیدھا سادہ نہیں ہے کہ ہم اس کو محض ایک

مصنف کی ثقاہت کی وجہ سے قبول کرلیں۔ اس کے متعلق یورپ کے تمام مشہور فضلا نے جو فارسی زبان کے ماہر ہیں تنقید کے طور پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے لیکن سب سے زیادہ قابل وقعت وہ تنقید ہے جو چہار مقالہ نظامی عروضی کے شارح مرزا محمد قزوینی نے کتاب مذکور کے حاشیوں میں لکھی ہے۔ چونکہ مرزا صاحب علاوہ عالم و ماہر ہونے کے اہل زبان اور خیام کے ہم وطن ہونے کا فخر بھی رکھتے ہیں اس لئے ان کی رائے اس بارے میں ہر طرح قابل اعتماد ہے۔ ہم ان کی عبارت کا ملخص یہاں درج کرتے ہیں:۔

"رشید الدین فضل اللہ صاحب جامع التواریخ نے جو کہ ۷۱۸ھ میں مقتول ہوا اپنی کتاب میں عمر خیام، حسن بن صباح اور نظام الملک کی رفاقت اور ہم مکتبی کے زمانے میں عہد وفا باندھنے کی حکایت بیان کی ہے۔ یہ حکایت رشید الدین کے اپنے بیان کے مطابق اس نے کتاب "سرگزشت سیدنا" سے اخذ کی ہے جو کہ حسن بن صباح کے حالات میں لکھی گئی تھی اور جو اسماعیلی فرقے کے مشہور قلعہ الموت کے کتاب خانے میں تھی۔ ہلاکو خاں تاتاری نے جب اس قلعے کو سر کیا تو علاء الدین عطا ملک جوینی صاحب تاریخ جہانکشا کو مامور کیا کہ وہ قلعے کے اندر جاکر کتاب خانے کا ملاحظہ کرے اور جس کتاب کو وہ اپنی دانست میں محفوظ رکھنے کے قابل سمجھے، رکھے باقی کو جلادے من جملہ ان کتابوں کے جو علاء الدین نے محفوظ کرلیں یہ کتاب بھی تھی۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ خود علاء الدین سے جس نے کہ اپنی کتاب تاریخ جہانگشا کا ایک مستقل حصہ اسماعیلیوں اور قلعہ الموت کی تاریخ میں لکھا ہے۔ اس کتاب کا کہیں ذکر نہیں کیا۔

تینوں ہم سبقوں کے عہد کرنے کی یہ داستان یورپ کے اکثر علما کے نزدیک جعلی ہے۔ نظام الملک کی تاریخ ولادت باتفاق مورخین ۴۰۸ھ ہے اور تاریخ وفات ۴۸۵ھ، عمر خیام اور حسن صباح کی پیدائش تو معلوم نہیں۔ لیکن ان کی وفات کی تاریخ ۵۱۷ھ اور ۵۱۸ھ ہے۔ پس اگر خیام اور حسن نظام الملک کے ہم سن یا متقارب السن تھے جیسا کہ اس حکایت کا مقتضا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ ان دونوں کی مدت عمر سو سو سال سے بھی زیادہ ہوئی اور گو یہ عادۃً محال نہیں تاہم مستبعد ضرور ہے۔ پھر اگر ان دونوں میں سے ایک کی عمر اس قدر بڑی ہوئی ہوتی تو چنداں بعید الوقوع بات نہ تھی تعجب اس بات پر ہے کہ دونوں کے دونوں نے معاً اس قدر فوق العادت عمریں پائیں اور پھر ایک ساتھ مرے۔ علاوہ اس کے کہیں کسی کتاب میں بھی تصریحاً یا اشارۃً

ان دو نامور اشخاص میں سے کسی ایک کا غیر معمولی عمر تک پہنچنا ثابت نہیں ہوتا"[۵۱]

نظامی عروضی مصنف چہار مقالہ جو خود خیام کا معاصر تھا اور جس کو متعدد دفعہ اس سے ملاقات کرنے کا موقع ملا ہے۔ خیام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ۵۰۸ھ میں بادشاہ وقت نے خیام کو پیغام بھجوایا کہ ہم شکار کو جانا چاہتے ہیں تم اپنی نجوم دانی کے ذریعے سے کوئی ایسی تاریخ مقرر کرو کہ جو برف باری سے محفوظ ہو۔ چنانچہ اس نے حساب لگا کر ایک تاریخ تجویز کر دی۔ سردی کا موسم تھا ابھی تھوڑی دور نکلے ہونگے کہ بڑے زور کا بادل اٹھا اور سرد ہوا چلنے لگی۔ خیام ساتھ تھا بادشاہ نے اس کو سخت زجر و توبیخ کی۔ اس نے کہا کہ آپ ذرا صبر کریں۔ ابھی مطلع صاف ہوا جاتا ہے اور پانچ دن تک بادل دکھائی بھی نہ دے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اس حکایت کو خود مولانا شبلی نے شعر العجم میں نقل کیا ہے[۵۲]۔ اگر ہم خیام کو نظام الملک کا ہم سن مانیں تو ۵۰۸ھ میں اس کی عمر سو برس کی ہونی چاہیئے۔ اب خیال کرنا چاہیئے کہ ایک سو برس کے بڈھے پھوس کے لئے اعمال نجوم کے ذریعے سے پیشین گوئیاں کرنا اور پھر جاڑے اور برف باری کے عالم میں بادشاہ کی ہمراہی میں شکار کو نکلنا کہاں تک قرین قیاس ہے ؟

اگر یہ مانا جائے کہ نظام الملک اپنے دوسرے ہم مکتبوں سے عمر میں بڑا تھا تو ہم کو اس کی عمر کی بڑائی کم از کم بقدر تیس برس کے ماننی ہوگی۔ اگر خیام اور حسن صباح نے اسّی اسّی پچاسی پچاسی برس کی بھی عمر پائی تو ظاہر ہے کہ ان کی ولادت ۴۳۵ھ کے قریب قریب ہونی چاہیئے۔ اس صورت میں نظام الملک ان دونوں سے تقریباً ستائیس برس بڑا ٹھہرا تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک چالیس برس کا سن رسیدہ آدمی بارہ بارہ تیرہ تیرہ برس کے بچوں کا ہم سبق ہو جب کہ دوسری طرف ہم کو معلوم ہے کہ نظام الملک نے نوجوانی ہی میں ابو علی شاذان گورنر بلخ کے ہاں بحیثیت کاتب کے ملازمت اختیار کر لی تھی[۵۳]۔

۵۱؎ چہار مقالہ طبع یورپ صفحات ۲۱۶ و ۲۱۷ ،

۵۲؎ دیکھو کتاب مذکور جلد ۱ صفحہ ۲۴۰ ،

۵۳؎ دیکھو تاریخ ابن خلکان ترجمہ نظام الملک ،

اگرچہ یورپ میں کتاب چہار مقالہ شعر العجم کے بعد شائع ہوئی لیکن اوپر کی عبارت میں جو مطالب بیان کئے گئے ہیں ان میں سے اکثر پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب "تاریخ ادبیات ایران" کی دوسری جلد (صفحہ ۱۹۰-۱۹۲) میں درج کئے ہیں اور پھر قریب قریب انھیں مطالب کو ون فیلڈ صاحب نے دیباچہ رباعیات عمر خیام (طبع لندن ۱۹۰۱ء) میں تحریر کیا ہے۔ رباعیات کے اس ایڈیشن کا ذکر خود مولانا نے کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتاب مذکور سے بخوبی واقف تھے۔ مولانا اگر انگریزی سے نابلد تھے تو کم از کم فرانسیسی اچھی طرح جانتے تھے چنانچہ انھوں نے اپنی تحریروں میں متعدد دفعہ اس کا اعتراف کیا ہے۔ پروفیسر ہوتسما نے عماد الدین الکاتب الاصفہانی کی مشہور تاریخ زبدۃ النصرۃ (طبع لیدن ۱۸۸۹ء) کے فرانسیسی دیباچے میں قریب قریب یہی باتیں دہرائی ہیں[1] اور ساتھ ہی ایک دل چسپ حقیقت کو منکشف کیا ہے جو قابل تسلیم ہے۔ وہ یہ کہ در اصل خیام اور حسن بن صباح کا ہم مکتب نظام الملک نہ تھا بلکہ انوشیروان بن خالد تھا جو کہ منصب وزارت میں نظام الملک کے جانشینوں میں سے تھا۔ چنانچہ خود انوشیروان نے واضح طور سے اس کو لکھا ہے[2]۔

عموماً تاریخی روایتوں میں اور خصوصاً ایران کی تاریخی روایتوں میں ایسا اکثر ہوا کہ غیر مشہور لوگوں کے کارناموں کو مشہور لوگوں کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اغلب یہ ہے کہ یہاں بھی انوشیرواں بن خالد کے حالات زندگی نظام الملک کی طرف منتقل کئے گئے ہیں۔

اگر تحقیق کا قدم اور آگے بڑھایا جائے تو اسی حکایت کی تنقید کے لئے اس قدر مواد جمع کیا جا سکتا ہے کہ ایک مستقل تصنیف کی صورت بن سکتی ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ مولانا شبلی جیسے فاضل ادیب نے ایسے اہم مسئلے کے بارے میں ایک حرف بھی نہیں لکھا۔

آگے چل کر مولانا شبلی نے خیام کے حالات جن کتابوں سے اخذ کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:
(۱) تذکرہ دولت شاہ سمرقندی (۲) نزہتہ الارواح شہرزوری۔ جس کو وہ تاریخ الحکما شہرزوری کے نام سے یاد کرتے ہیں (۳) تاریخ الکامل لابن الاثیر (۴) تاریخ الحکماء قفطی (۵) چہار مقالہ نظامی عروضی

---

[1] دیباچہ مذکور صفحہ ید و یہ [2] زبدۃ النصرۃ صفحہ ۶۶

ان پانچ کتابوں میں سے جو حالات اخذ کئے جا سکتے تھے وہ بے شک اُنھوں نے اخذ کر لئے ہیں لیکن ان کتابوں کے علاوہ اور بھی بہت سی تاریخی اور ادبی کتابیں ہیں جن میں ضمناً خیام کا ذکر آ گیا ہے جس کو اخذ کر کے ناظرین کے سامنے پیش کرنا تذکرہ نویس کا فرض ہے۔ ہر فارسی داں اس بات کو جانتا ہے کہ ایران کے جتنے نامور شاعر گزرے ہیں مثلاً فردوسی، انوری، حافظ، عطّار، خیام وغیرہ۔ ان سب کے حالات تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں اور جتنی کسی کی شہرت زیادہ ہے اتنا ہی اس کے متعلق معلومات کا ذخیرہ کم ہے حتیٰ کہ حافظ اور فردوسی جیسے مایۂ ناز شعرا کی تاریخ ولادت و وفات تک محفوظ نہیں رکھی گئی، ایسی حالت میں جب کہ ان اہل کمال کے حالات زندگی اس درجہ کمیاب ہوں تو ان کے متعلق چھوٹی چھوٹی باتیں بھی جو اتفاقیہ طور سے تاریخی کتابوں سے ہاتھ لگ جائیں ترک کر دینا یا ان کی طرف سے بے پروائی برتنا بہت بڑے ادبی نقصان کا موجب ہو سکتا ہے مولانا شبلی نے خیّام کے ذخیرۂ حالات میں سے جو ان کو بغیر کسی تلاش اور کاوش کے مہیّا مل سکتا تھا نصف کے قریب بالکل چھوڑ دیا ہے جس سے اس کے سوانح عمری میں بہت بڑی کمی رہ گئی ہے۔ خیام کے متعلق پروفیسر ژوکوفسکی کا وہ فاضلانہ مضمون جو انھوں نے ۱۸۹۷ء میں روسی زبان میں لکھا تھا اور جس کا ترجمہ انگریزی میں ڈاکٹر راس نے ۱۸۹۸ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں شائع کیا تھا اس کا علم مولانا کو ضرور تھا کیونکہ اُنھوں نے خود خیام کے تذکرے کے اخیر میں اس مضمون کا اور اس کے انگریزی ترجمے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن شاید وہ اتنی زحمت گوارا نہیں کر سکے کہ اس کو منگوا کر ایک نظر دیکھ لیتے ورنہ اتنی بڑی فرو گزاشت ان سے سرزد نہ ہوتی۔ اس مضمون میں پروفیسر ژوکوفسکی نے ان تمام کتابوں کو جن میں خیام کے حالات تھوڑے یا بہت مل سکتے تھے باعتبار قدامت یکے بعد دیگرے ترتیب دے کر ذکر کیا ہے اور جو حالات ہر ایک کتاب میں سے میسر آئے ہیں ان کو بھی جمع کیا ہے۔ اس مضمون کو دیکھنے سے معلوم ہو گا کہ علاوہ ان پانچ مأخذوں کے جن کا استعمال مولانا نے کیا ہے اور جن کا اوپر ذکر کر دیا گیا ہے پانچ کتابیں اور ہیں جن میں خیام کے حالات ملتے ہیں اور جو باعتبار ثقاہت کے کچھ کم قابلِ وقعت نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک تو 'مرصاد العباد' تالیفِ شیخ نجم الدین ابوبکر رازی معروف بہ "دایہ" ہے جو ۶۲۰ھ میں لکھی گئی۔ دوسرے 'آثار البلاد' قزوینی ہے جو ۶۷۴ھ کی تصنیف ہے۔ تیسرے 'جامع التواریخ' ہے جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ چوتھے 'فردوس التواریخ'

مصنفۂ مولانا خسرو ابرقوہی جو ۸۷۶ھ میں لکھی گئی ہے اور پانچویں تاریخ الفی جو اکبر کے عہد کی مشہور تصنیف ہے۔

ان پانچ کتابوں میں سے خیام کے متعلق جو حالات اخذ کئے گئے ہیں ان کو ہم طوالت کے خوف سے یہاں دہرانا نہیں چاہتے جس کو اشتیاق ہو وہ پروفیسر ژوکوفسکی کے مضمون کا انگریزی ترجمہ یا کتاب چہار مقالہ (طبع یورپ) کے حواشی میں دیکھ لے۔

آگے چل کر مولانا شبلی نے خیام کی رباعیات پر ملحاظ مضامین کے مفصل ریویو کیا ہے اور اس کی شاعری کے محاسن دکھلائے ہیں۔لیکن تنقیدی حیثیت سے یہاں بھی مولانا ایک بہت بڑی فروگزاشت کے مرتکب ہوئے ہیں۔خیام کی رباعیات کے مطالعہ کرنے والے کو سب سے بڑی دقت جو پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ رباعیات کا کوئی صحیح نسخہ جو قابل اعتماد ہو سکے ہمارے زمانے تک محفوظ نہیں رہا۔قلمی نسخے جو یورپ اور ایشیا کی بڑی بڑی لائبریریوں میں موجود ہیں ان میں رباعیات کی تعداد اور ترتیب اس قدر متفاوت ہے کہ ان سب نسخوں کا مقابلہ اور موازنہ کر کے مشترک رباعیوں کی ایک قابل اعتبار تعداد کو نکالنا اور ان کو مناسب طور سے ترتیب دینا ممکن نہیں ان مختلف نسخوں میں رباعیات کی تعداد پندرہ سے آٹھ سو تک ہے اور بعض مطبوعہ نسخوں میں ہزار سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔

خیّام کی اپنی رباعیات کو متعین کرنا تو اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ کوئی قدیم اور صحیح نسخہ دستیاب نہ ہو جو اعتماد کے قابل ہو۔زبان کا معیار اس بارے میں کارآمد نہیں کیونکہ اوّل تو خیام کے اپنے صحیح انداز کا نمونہ ہمارے پیش نظر نہیں اور اگر ہو بھی تو بہت سے دوسرے اساتذہ مثلاً مولانا روم، عطّار، حافظ، سنائی، انوری، بوعلی سینا وغیرہ کی جو رباعیاں خیام کی رباعیوں کے ساتھ مخلوط ہو گئی ہیں، ان سب کا انداز قریب قریب یکساں ہے اور سب کے مضامین متحد اور متشابہ ہیں لہذا ان میں تمیز کرنا اور صرف انداز بیان سے مصنف کا پتا لگانا محال ہے۔پروفیسر ژوکوفسکی نے اپنے مضمون میں جس کا اوپر ذکر ہوا نہایت محنت اور تلاش سے خیام کی بیاسی رباعیوں کا کھوج لگا کر بتایا ہے کہ یہ رباعیاں دوسرے شعرا کے دیوانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔نیز ان شاعروں کی فہرست دی ہے جن کی تعداد چالیس سے زائد ہے اور اسی فہرست کو پروفیسر براؤن نے اپنی تاریخ کی دوسری جلد (صفحہ ۲۵۶ و ۲۵۷) میں نقل کیا ہے۔ ڈاکٹر نکلسن ماہر فارسی، رباعیات خیّام

(طبع لندن ۱۹۰۹ء) کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ پروفیسر ژوکوفسکی کے مضمون لکھنے کے بعد سے اب تک (یعنی ۱۸۹۷ء سے ۱۹۰۹ء تک) اس قسم کی رباعیوں کی تعداد بیاسی سے تجاوز کرکے ایک سو ایک تک پہنچ چکی ہے اور اگر تلاش جاری رکھی جائے تو اور بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

غرض یہ ہے کہ حالات موجودہ میں خیام کی رباعیات کا متعین کرنا دشوار ہے۔ مولانا شبلی نے اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کیا ہے اور ان امور پر بالکل کوئی بحث نہیں کی کہ مثلاً وہ کون سی رباعیاں ہیں جو ممکن طور سے خیام کی اپنی کہی جا سکتی ہیں۔ اس کی رباعیوں کی شناخت ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اگر ہو سکتی ہے تو کیوں کر، کون سا مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخہ زیادہ قابل اعتبار ہے۔ مذاق سلیم کو اس میں کہاں تک دخل ہو سکتا ہے۔ خیام کی رباعیات کا دوسروں کے رباعیات کے ساتھ مخلوط ہونے کا باعث کیا ہے اور کیا وجہ ہے کہ اس کا کلام محفوظ نہیں رہا وغیرہ وغیرہ۔

اس مبحث کو حسب ضرورت طول دیا جا سکتا ہے اور رباعیات کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے حد سے زیادہ دل چسپ ہو سکتا ہے بلکہ ہمارا خیال ہے کہ اُن کے لئے بے حد ضروری ہے کیوں کہ جب تک محنت اور تحقیق کے ساتھ خیام کی اپنی رباعیاں، متعین نہ ہو سکیں گی اس کی شخصیت تشکک اور قیاسات کے غبار میں ملفوف رہے گی۔

مولانا شبلی نے اتنا بھی بیان نہیں کیا کہ رباعیات خیام کا کون سا نسخہ ان کے پیش نظر ہے جس میں سے وہ تنقید کے لئے رباعیات کا انتخاب کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے انھوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ ساری دنیا میں فقط ایک ہی نسخہ جس کا متن متحد ہے دستیاب ہو سکتا ہے جس کی صحت میں کسی کو کلام نہیں لہذا پتا نشان بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

جو رباعیاں مولانا نے تنقید کے لئے انتخاب کی ہیں ان میں سے دس ایسی ہیں جو پروفیسر ژوکوفسکی کی اُن بیاسی رباعیوں میں سے ہیں جن کو اُنھوں نے اوروں کی طرف منسوب پایا ہے ان میں سے ہر ایک کا پہلا مصرع ناظرین کی دل چسپی کے لئے لکھ دیا جاتا ہے[1]:-

---

[1] افسوس ہے کہ ژوکوفسکی کا اصلی مضمون جو اُنھوں نے روسی زبان میں لکھا تھا دستیاب نہیں ہو سکتا، ورنہ ہم یہ بھی بتا سکتے کہ ان میں سے ہر ایک رباعی کس کی طرف منسوب ہے۔ مضمون کے انگریزی ترجمے میں صرف رباعیاں بتائی گئی ہیں شعرا کا نام نہیں دیا۔

(۱) من بندۂ عاصیم رضائے تو کجاست (۶) گر از پے شہوت و ہوا خواہی رفت

(۲) آنم کہ پدید گشتم از قدرت تو (۷) ایزد چو نخواست آنچہ من خواستہ ام

(۳) اے چرخ ز گردش تو خرسند نیم (۸) دریاب کہ از روح جدا خواہی رفت

(۴) گویند کہ فردوس بریں خواہد بود (۹) در دہر ہر آنکہ نیم نانے دارد

(۵) جمعے متفکرند در مذہب و دیں (۱۰) با ایں دو سہ ناداں کہ چناں می دانند

خیام کی تصنیفات کے ذکر میں مولانا شبلی فرماتے ہیں :-

" تصنیفات بہت کم ہیں۔ زیچ جو تیار کی تھی اس کا ہمارے اسلامی ملکوں میں تو پتا نہیں لیکن یورپ نے چھاپ کر شائع کی ہے" (شعر العجم صفحہ ۲۳۰)

خیام کی کوئی زیچ آج تک یورپ میں شائع نہیں ہوئی۔ رباعیات کے علاوہ جو کتاب یورپ نے شائع کی ہے وہ در اصل اُس کا الجبرا ہے جس کا عربی متن مع فرانسیسی ترجمے کے بمقام پیرس ۱۸۵۱ء میں چھاپا گیا ہے یہ الجبرا اور اس کے ساتھ تین تصنیفیں خیام کی اور ہیں جن کا مولانا نے ذکر نہیں کیا اور لطف یہ ہے کہ ان تین میں سے دو اس وقت قلمی نسخوں کی صورت میں موجود پائی جاتی ہیں۔ ایک کا نام " رسالۃ فی شرح ما اشکل من مصادرات اقلیدس" جس کا ایک نسخہ لیڈن کے کتب خانے میں ہے۔ دوسرے " رسالۃ فی الاحتیال لمعرفۃ مقداری الذّہب والفضّۃ فی جسم مرکب منہما" جس کا نسخہ مقام گوتھا (جرمنی) کی لائبریری میں موجود ہے اور تیسرے " لوازم الامکنۃ در فصول و علت اختلاف ہوای بلاد و اقلیم"[۱] ایک دوسری جگہ مولانا نے لکھا ہے :-

" ... ... خیام مسائل فلسفیہ کے بیان کرنے میں نہایت بخل کرتا تھا۔ اس نے پہلے تو یہ کہہ کر ٹالا کہ میں اس مسئلہ کو اپنی کتاب عرائس النفائس میں بہ تفصیل لکھ چکا ہوں" الخ (صفحہ ۲۲۹-۲۳۰)

کتاب عرائس النفائس جس کو مولانا نے خیام کی تصنیف بتایا ہے اس کے لئے انھوں نے کوئی سند نہیں دی

---

[۱] دیکھو حواشی چہار مقالہ صفحہ ۲۲۰ و ۲۲۱

شہرزوری کی اصل عبارت میں جس کا وہ ترجمہ کر رہے ہیں اور جو لعینہ حواشی چہار مقالہ (صفحہ ۲۱۲) میں نقل کی گئی ہے عرائس النفائس کا کہیں ذکر نہیں، ظاہراً اتنی بات انھوں نے اپنی طرف سے بڑھا دی ہے۔

جو مطالب اس مضمون میں بیان کئے گئے ہیں ان کے متعلق یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ ان میں کوئی نئی بات بیان نہیں کی گئی فارسی زبان کے جاننے والے جو بواسطۂ انگریزی تاریخ ایران کا مطالعہ کرتے ہیں، ان باتوں سے بالعموم واقف ہیں۔ البتہ اردو میں شاید ابھی تک ان مطالب کی ترجمانی نہیں ہوئی اور یہی خیال اس مضمون کے لکھے جانے کا باعث ہوا۔ جب کہ شعرالعجم جیسی بلند پایہ کتاب میں ان باتوں کو ترک کر دیا گیا ہے تو یہ فرض کر لینا کہ چھوٹے درجے کی تصانیف میں یہ مباحث لکھے جا چکے ہیں بعید از قیاس ہے۔

اقبال

اوحدالدین انوری

قولہ " محمد نام، اوحدالدین لقب، انوری تخلص ابیورد کے علاقے میں بدہنہ ایک گاؤں ہے، جو مہنہ کے مقابل واقع ہے، انوری یہیں پیدا ہوا، یہ دولت شاہ کا بیان ہے، لیکن عرفی کہتا ہے ع انوری گر بود از مہنہ منم از شیراز " (شعرالعجم صہ ۲۶۴)

انوری کے کلیات کا جامع جس نے انوری کی وفات کے بعد بہت جلد اس کا کلام جمع کیا ہے اور اس پر ایک مختصر دیباچہ بھی لکھا ہے اس کا نام علی بتاتا ہے۔ صاحب دیباچہ کے الفاظ ہیں۔

" امیر حکیم امام ہمام اوحدالدین عماد الاسلام نادرۃ الفلک اعجوبۃ الزمان افصح فصحاء الدہر ملک الکلام والشعرا علی الانوری نور اللہ مرقدہ ومثواہ وعرف بفضلہ ثراہ "

البتہ محمد اس کے باپ کا نام تھا اس پر محمد عوفی اور شادی آبادی[ع] متفق ہیں۔ دادا کا نام اسحٰق تھا

ع شرح قصائد انوری از محمد بن داؤد بن محمد علوی شادی آبادی مصنف شادی آباد عرف مانڈو کا رہنے والا ہے اور سلطان ناصرالدین مالوی ۹۰۶ھ و ۹۱۶ھ کی فرمائش پر اس نے یہ شرح لکھی ہے۔

انوری کے کلیات سے ثابت ہے **شعر**

زندہ اسلاف تو تو چو من　　جدّم اسحٰق وجدّت اسمٰعیل عہ

وطن کے متعلق اگرچہ مورخین میں اختلاف ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ خاوران ہے انوری خود ایک سے زیادہ مقام پر اپنے آپ کو خاوران کی طرف منسوب کرتا ہے۔ قطعۂ ذیل اور اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہر سپہرِ صیت پیدا شد زخاکِ خاوراں　　تا شبانگاہِ ابد چار آفتاب خاوری
خواجۂ چوں بوعلی شبدانی آں صاحب قِراں　　مفتیِ چوں اسعد شوجان زہر شرکے بری
صوفیِ صافی چو سلطانِ طریقت بوسعید　　شاعرے ساحر چو مشہورِ خراساں انوری عہ

شعر وے زخاکِ خاوراں چوں ذرہ مجہول آمدہ　　گشتہ امروز اندرو چوں آفتابِ خاوری عہ
〃 چنداں کہ از زبانت برآید بگیر زر　　در خاوراں نیم کہ میسر نمی شود عہ
〃 کاندر اطراف خاوراں از وے　　ہیچ کس راہی نیا بیاد عہ

خاوراں ایک ناحیہ کا نام ہے جس میں مہنہ، نسا، ابیورد اور درگز شامل ہیں لیکن یہ بھی یاد رہے کہ خاوراں ناحیہ ہونے کے علاوہ ایک قصبہ کا نام بھی ہے اور انوری اسی قصبے کی طرف منسوب ہے عہ

قولہ ” انوری نے اسی وقت تعلیم و تعلم کو خیرباد کہا اور رات بھر میں قصیدہ لکھ کر تیار کیا جس کا مطلع یہ ہے :

گر دل و دست بحر و کاں باشد　　دل و دستِ خدایگاں باشد

صبح کو دربار میں جا کر قصیدہ پڑھا، سنجر نہایت سخن شناس تھا بہت محظوظ ہوا اور کہا

عہ کلیات انوری، طبع نول کشور ص ۲۶۱ یہ کلیات نول کشور کے ہاں ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۷ء میں چھپ چکا ہے پہلی اشاعت میں ۷۶۷، اور دوسری میں ۶۶، صفحات ہیں۔ میں نے اس مضمون کے دوران میں پہلی اشاعت سے کام لیا ہے۔ بخیال اختصار آئندہ صرف شمار صفحات پر اکتفا کی جائیگی۔ عہ الیضاً کلیات ص ۱۴۷ عہ الیضاً کلیات ص ۴۰۳ عہ کلیات ص ۴۴۴ عہ الیضاً ص ۱۲۳

عہ معجم البلدان از یاقوت حموی، نزہت القلوب حمد اللہ مستوفی ص ۱۸۹ طبع ملک الکتاب ۱۳۱۱ھ بمبئی

نوکری چاہتے ہو یا صلہ، انوری نے آداب بجالا کر عرض کی۔

جز آستانِ توام در جہاں پناہے نیست　　سرِ مرا بجز ایں در حوالہ گاہے نیست

سنجر نے منصب اور وظیفہ مقرر کردیا، سنجر راد گاں سے روانہ ہوا تو انوری بھی ساتھ تھا، راہ میں چند قصیدے لکھ کر پیش کئے جن میں سے ایک یہ ہے:

باز ایں چہ جوانی و جمال ست جہاں را　　ویں حال کہ نو گشت زمیں را و زماں را"

شعر العجم ص ۲۶۴

شعر جز آستانِ توام الخ خواجہ حافظ کی غزل کا مطلع ہے جو ان کے دیوان میں موجود ہے اور انوری سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

راد گان سے روانگی کے وقت جو قصیدہ سُنایا جاتا ہے اور جس کا مطلع اوپر درج ہے بے شک انوری کا ہے لیکن سلطان سنجر کی تعریف میں نہیں ہے بلکہ عماد الدین پیروزشاہ اور اس کے وزیر جلال الوزرا کی مدح میں ہے کلیات (مطبوعہ) میں یہ سب سے پہلا قصیدہ ہے یہ شعر ملاحظہ ہو جس میں ممدوح کا نام موجود ہے۔

پیروزشہِ عادل و منصور و مظفر　　کز عدل دگر بارہ بنا کرد جہاں را　(کلیات ص ۳)

اور یہ شعر بھی ؎

دستور جلال الوزرا کز درِ عالیش　　انصاف رسانند ہر انصاف رساں را　ص ۵

قولہ " ہمارے تذکرہ نویسوں کی بے خبری دیکھو، یہ واقعہ سب لکھتے آتے ہیں، لیکن یہ کسی سے نہ ہو سکا کہ جس قصیدے کو انوری کی شاعری کا دیباچہ کہتے ہیں اس کو کبھی اُٹھا کر دیکھ بھی لیا ہوتا، انوری خود اس قصیدے میں کہتا ہے ؎

خسروا بندہ را چو دہ سال ست　　کہ ہمی آرزوے آں باشد

کز ندیمانِ مجلس ار نشود　　از مقیمان آستاں باشد

اس میں صاف تصریح ہے کہ یہ قصیدہ ابتداً نہیں، بلکہ دس برس کی اُمیدواری کے بعد لکھا گیا ہے،، (شعر العجم ص ۲۶۵)

اگر واقعی سب سے پیش تر یہ اعتراض مولانا شبلی کو سوجھا ہے تو وہ تہ دل سے مبارک باد کے مستحق ہیں لیکن
میرا عقیدہ ہے کہ علامہ موصوف اس معاملہ میں پروفیسر برون کی تاریخ ادبیات ایران کے مرہون منت ہیں اگرچہ
بظاہر اس سے استفادہ تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر برون کے الفاظ ہیں:
"امر فی الواقع یہ ہے کہ قصیدۂ مذکورہ خود ایسی شہادت پیش کرتا ہے کہ شاعر بڑی مدت پیش تر
سے مشق سخن میں مصروف تھا۔ **اشعار**

خسروا بندہ را چو دہ سال ست — کش ہمی آرزوے آں باشد
کز ندیمانِ مجلس ار نشود — از مقیمانِ آستاں باشد"

(تاریخ ادبیات ایران صفحہ ۳۸۰، طبع ۱۹۰۶ء)

قولہ "رفتہ رفتہ یہ مرتبہ حاصل کیا کہ سنجر نے بہ آں جاہ و جلال دو دفعہ انوری کے مکان پر جا کر
اس کی عزت افزائی کی" (شعر العجم صفحہ ۲۶۶)

دس سال کی اُمیدواری کے باوجود جیسا کہ گزشتہ اشعار سے واضح ہوتا ہے انوری سنجر کے دربار میں
منادمت برطرف، مقیم آستان بننے کا رتبہ بھی حاصل نہ کر سکا اور اگر اسی رفتار سے اُس نے ترقی کی ہے تو
سنجر کو اُس کے گھر آنے کے لئے عمر نوح درکار ہے۔
میں سنجر اور انوری کے تعلقات کی بابت اسی مضمون کے دوران میں کسی موزوں مقام پر گفت گو کروں گا
یہاں اسی قدر کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انوری کے گھر سنجر کے آنے کی روایت کی اصلیت صرف اس قدر
ہے کہ ایک مرتبہ کوئی وزیر انوری کے مکان پر آیا تھا اور شاعر نے اس کے خیر مقدم میں قصیدہ قطعہ اور
رباعی لکھے ہیں چنانچہ **رباعی**

منصوبۂ ہر گزت در آمد بضمیر — کاید بدرت موکب میمونِ وزیر
ہیں کوکب غنچہ بیا و دست ببوس — ہاں دستِ چنار گو بیا دست بگیر (کلیات صفحہ ۵۶۸ طبع نولکشور)

کسی اور قطعہ میں کہتا ہے ؎

بچیزے دیگر ایں تشریف را تشبیہ نتواں کرد — حدیثِ مصطفٰے میداں و بو ایوبِ انصاری (کلیات صفحہ ۲۱۱)

قطعہ ذیل بھی ملاحظہ ہو ؎

اے خداوندے کہ بنّائے جہاں بعینی قضائے   گوہرِ پاک ترا اصلِ نکوکاری نہاد

آستانِ ساحتِ جاہ ترا چوں برکشید   عقلِ کُلّی پائے بر خاکش بدشواری نہاد

فتنہ را خوابِ ضروری دیدہ از گیتی بدوخت   چوں قضا در دیدۂ بختِ تو بیداری نہاد

وے حیاتِ نو نہادستے مرا در تن چنانک   باللہ ار در خاک ہرگز ابر آذاری نہاد

عذر آں اقدام چوں خواہم کہ خاکش را سپہر   سرمۂ چشمِ خداوندی و جبّاری نہاد

شاد باش اے مصطفیٰ سیرت کہ خلق شامتت   بے تکلف بر تکبر داغِ بیزاری نہاد

از شرف در عرضِ من عرفی نہادستے چنانک   مصطفیٰ در نسلِ بو ایوب انصاری نہاد (ص ۶۴۹)

اسی سلسلے میں وہ قصیدہ لکھا گیا ہے جس کا مطلع ہے ؎

زہے از کلکت اندر چشم دولت کحلِ بیداری   بعونش کردہ مدتہا جہانباناں جہانداری

یہ عقیدہ کہ قصیدہ کسی وزیر کی تعریف میں ہے، رباعی بالا کے علاوہ ذیل کے ابیات سے بھی مفہوم ہوتا ہے ؎

مجیرِ دولت و دینی و اندر دیدۂ دولت   ز رائے تست بینائی ز بختِ تست بیداری

تو آں صدری کہ عالم را کمال آمد وجودِ تو   نگر تا خویشتن را کمتر از عالم نہ پنداری

ناظرین اسی قصیدے کے یہ اشعار ملاحظہ کریں ؎

ترا لطفِ تو داعی بود اگر نہ کس روا دارد   کہ رختِ کبریا ہرگز بچوناں کلبۂ آری

نزولت را بہ نزدِ من مثل دانی چہ می آرم   نزولِ مصطفیٰ نزدیکِ بو ایوبِ انصاری (کلیات ۳۷۰-۳۶۹)

قولہٗ انوری جس طرح سنجر کے دربار میں پہنچا ہے، اس کی کیفیت یہ ہے کہ انوری مدت سے شعر و شاعری میں مشغول تھا، لیکن دربار میں رسائی حاصل نہیں ہوتی تھی، جس کی وجہ یہ تھی کہ دربار کا ملک الشعرا امیر معزی تھا اور وہ کسی کو دربار میں کامیاب نہیں ہونے دیتا تھا اس کا حافظہ نہایت قوی تھا، یعنی صرف ایک بار کے سننے میں قصیدے کا قصیدہ یاد کر لیتا تھا، جب کوئی شاعر دربار میں آتا اور قصیدہ سناتا تو معزی بادشاہ سے کہتا کہ یہ قصیدہ

میری تصنیف ہے، چنانچہ قصیدے کا قصیدہ خود پڑھکر سنا دیا، شاعر خفیف ہو کر چلا آیا
انوری کو یہ حالت معلوم ہوئی تو پھٹے پرانے کپڑے پہن، پاگلوں کی صورت بنا کر، معزی
کے پاس گیا اور کہا کہ میں شاعر ہوں، بادشاہ کی مدح میں قصیدہ لکھکر لایا ہوں آپ پیش
کرا دیجئے، معزی نے پوچھا کیا لکھا ہے پڑھکر سناؤ، انوری نے پڑھا ؎

زہے شاہ وزہے شاہ وزہے شاہ زہے میر و زہے میر و زہے میر

معزی نے کہا یوں کہتے تو مطلع ہو جاتا ؎

زہے شاہ و زہے شاہ و زہے شاہ زہے ماہ و زہے ماہ و زہے ماہ

انوری نے بہکی بہکی باتیں کیں، معزی نے یہ سمجھکر کہ دربار کا مسخرہ بنائیں گے، انوری سے
کہا، کل آنا، انوری دوسرے روز پہنچا تو معزی خود ساتھ لے کر دربار میں آگیا اور کہا کہ
جو قصیدہ تم نے مدح میں لکھا ہے، سناؤ۔ انوری نے شاعرانہ انداز میں پڑھا ؎

گر دل و دست بحر و کاں باشد دل و دستِ خدائگاں باشد
شاہِ سنجر کہ کمتریں خدمش درجہاں بادشہ نشاں باشد

دو شعر پڑھکر رک گیا اور معزی کی طرف خطاب کرکے کہا کہ اگر یہ قصیدہ آپ کا ہے تو باقی
اشعار سنائیے۔ معزی چپ ہوا، انوری نے پورا قصیدہ سنایا سنجر نہایت محظوظ ہوا اور
ندیمانِ خاص میں داخل کیا" (شعر العجم ص ۲۶۶ و ۲۶۵)

پروفیسر براون نے اس قصّے کو حبیب السیر سے بتمامہ نقل کرکے اس پر کوئی تنقیح ظاہر نہیں کیا ہے میں اس
خیال میں پروفیسر موصوف کا تابع ہوں علامہ شبلی نے اس کے بعض خط و خال قلم انداز کر دیئے ہیں۔ میں اس
روایت کے اس غیر معمولی پہلو سے جس میں ایک شخص کا حافظہ اس قدر قوی مان لیا جائے کہ ایک مرتبہ کے
سننے میں کامل قصیدہ از بر کر سکتا ہے، اس کا فرزند دو مرتبہ کی سماعت میں یاد کر لیتا ہے اور ان کا غلام تین مرتبہ
کی سماعت میں حفظ سنا سکتا ہے اور حسن اتفاق سے ان بوالعجب ہستیوں کا اجتماع ایک ہی وقت میں اور ایک ہی
خاندان میں ہوتا ہے قطع نظر کرکے اس قدر کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ انوری کے معتقدین نے نہ صرف اس قصّے میں

بلکہ اور موقعوں پر بھی امیر معزی کو بدنام اور مطعون کرنے کی کوشش کی ہے مثال میں انوری کا ایک شعر پیش ہے۔

بر سرِ من معقری کردی کلہ داں برگزشت بگزر و بر طیلسانم نیز دد ر معجزی

شادی آبادی اس شعر کی تشریح میں کہتے ہیں:۔

"دریں بیت رمز آنست کہ امیر معزی بحضرت انوری از روئے حسد تہمتے دروغ کردہ بود پیش پادشاہ تعریض کردہ کہ انوری شہر بلخ را ہجو کردہ پادشاہ بدو منقلب شد و حکیم انوری را مقنعۂ زناں پوشانید و تشہیر کرد و خواست تا حضرت انوری را بر خر سوار کند و گرد شہر بگرداند چوں حکیم مذکور ایں قصیدہ را گفت و پادشاہ را مع کبرائے بلخ تعریف کرد باز داشتند و بخر سوار نہ کردند و مہرباں شدند"

حالانکہ امیر معزی ۵۴۲ھ میں سنجر کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے اور ہجوِ بلخ کا واقعہ سنجر (متوفی ۵۵۲ھ) کی وفات کے بہت عرصہ بعد طغرل تگین کے دَور میں ہوتا ہے۔

شادی آبادی نے ایک اور واقعہ انوری کے ایک اور شعر کی شرح میں لکھا ہے۔ شعر یہ ہے۔

کس ندانم از اکابر گردن کشانِ نظم کو را صریح خون دو دیوان بگردن ست

شادی آبادی کہتے ہیں۔

"امیر معزی کہ سر آمد شعرائے زمانہ بود و پیش سلطان سنجر مرتبہ و تقرب بسیار داشت از دیوان مولانا احمد معالی [بلمعالی نحاس؟] دزدیدہ است و ہر دو دیوان را ہلاک کردہ است و دیوان خود ساختہ است"

علاوہ بریں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ انوری کا سرپرست سلطان سنجر کا آخری وزیر ابو الفتح ناصر الدین طاہر ابن مظفر ابن نظام الملک (۵۲۸ھ و ۵۴۸ھ) تھا۔ کلیات میں اس وزیر کی مدح میں بیسیوں قصیدے اور قطعات ہیں اس لئے قوی احتمال کیا جا سکتا ہے کہ ایسے طاقتور وزیر کے مقابلے میں امیر معزی کی کوشش دربار میں انوری کی رسائی کے برخلاف چنداں سرسبز نہیں ہو سکتی تھی۔

قولہ "انوری کو علم نجوم میں کمال تھا، سنجر کے عہد حکومت میں اتفاق سے سبعہ سیّارہ

برج میزان میں جمع ہوئے، انوری نے اس بنا پر پیشین گوئی کی کہ فلاں دن اس زور کا طوفان آئے گا کہ تمام مکانات برباد ہو جائیں گے، لوگوں نے ڈر کر، تہ خانے اور سرد آب طیار کرائے اور تاریخ مقررہ پر ان میں چھپ کر بیٹھے، اتفاق سے اس دن اتنی ہوا بھی نہ چلی کہ چراغ گل ہوتا سنجر نے انوری کو بلا کر عتاب کیا، انوری نے کہا قرانات کے احکام فوراً ظاہر نہیں ہوتے۔

فرید کاتب نے اس پر قطعہ لکھا ؎

گفت انوری کہ از جہتِ بادہائے سخت　　ویراں شود عمارت و کہ نیز بر تری

در سال حکم او نوزیدست ہیچ باد　　یا مرسل الریاح تو دانی و انوری　　(شعر العجم صفحہ ۲۶۶)

یہ سبعہ سیارہ کا اقتران نہیں تھا بلکہ پانچ ستاروں کا لیکن سلطان سنجر کے عہد میں نہیں کیونکہ اس کا انتقال ۵۵۲ھ میں ہوتا ہے اور ستاروں کا اجتماع بسند نزہت القلوب حمداللہ مستوفی ۵۸۱ھ میں اور بسند کامل ابن الاثیر ۲۹ جمادی الآخر ۵۸۲ھ کو ہوتا ہے۔

فی الواقع انوری نے اس طوفان کے متعلق اگر کوئی اشعار لکھے ہیں تو وہ ہم تک نہیں پہونچے۔ کلیات میں پسر مرداد کے مدحیہ قصیدے میں البتہ ایک تلمیح پائی جاتی ہے جس سے اس قدر ضرور مفہوم ہوتا ہے کہ انوری طوفان کی شدت کی اس نوعیت کا جو مولانا شبلی کے بیان سے مترشح ہے اور جس کو تمام تذکرہ نویس ایک مبالغہ آمیز طریق سے بیان کرتے آئے ہیں ہرگز ہرگز معتقد نہیں تھا۔ وہ ایک طوفان کا ضرور منتظر تھا لیکن نہ ان خوفناک نتائج کے ساتھ جو بالعموم اس کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ وہ تلمیح شعر ذیل میں ملتی ہے۔

آباد دار نیمۂ خود از جہاں بداد　　طوفانِ باد نیمۂ خود گو خراب خواہ　　کلیات صفحہ ۳۶۳

مقطع میں یہی شعر کسی قدر تغیر کے ساتھ یوں لایا گیا ہے۔

آباد دار ملک زمیں خسروا بداد　　طوفانِ باد ملکِ ہوا گو خراب خواہ　　صفحہ ۳۶۳

طوفان کا ذکر اکثر معتبر تاریخوں میں ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قضیہ ان ایام میں بہت کچھ بحث و جدال اور مناظرات کا مورث ہوا ہے۔ اس بحث میں جیسا کہ پروفیسر برون نے ذکر کیا ہے ظہیر فاریابی نے سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا ہے۔

وہی قطعہ جو فرید کاتب کی طرف منسوب ہے قصائد ظہیر میں بھی موجود ہے وہو ہذا۔

میگفت انوری کہ شود باد ہا چنانک کوہ گراں زپاے در آید چو بنگری

سالے گزشت و برگ نجنبید از درخت یا مرسل الریاح تو دانی و انوری

(قصائد ظہیر ص ۱۴۸، طبع نول کشور ۱۸۸۱ء)

سیاروں کے اقتران کا ذکر ذیل کے اشعار میں آتا ہے۔

اجتماع اختراں دانی کہ در میزاں چراست خود نکو دانی کہ آں صنعت چہ نیکو کردہ اند

از برائے ذرۂ خاکِ کفِ پائے ترا نقدِ ہفت اقلیم گردوں در ترازو کردہ اند (قصائد ظہیر ص ۱۶۵)

ظہیر نے طوفان کے بطلان میں کوئی رسالہ بھی لکھا ہے۔ اشعار ذیل ملاحظہ ہوں

رسالتے کہ زانشاے خود فرستادم بمجلسِ تو در ابطال حکمِ طوفانی

اگر در آں سخنم شبہہ ست میخواہی کہ از جریدۂ ایام نیز برخوانی

مراچناں کہ بود ہم معیشتے باید کہ بے غذا نتواں داشت روحِ حیوانی

(قصائد ظہیر ص ۱۷۱)

ظہیر جن ایام میں طوفان کی نزاع میں مصروف تھا آذربائیجان میں مقیم۔ قزل ارسلان ۵۸۲ھ میں قتل ہوتا ہے اور نظامی کا ممدوح ابوبکر نصرۃ الدین اس کا جانشین ہوتا ہے۔ قطعۂ ذیل میں ظہیر کا مخاطب یہی نصرۃ الدین معلوم ہوتا ہے۔ شاعر شکایت کرتا ہے کہ جس شخص نے اپنی پیشین گوئی میں کہا تھا کہ طوفان باد سے دنیا تباہ ہو جائے گی اس کو تم نے خلعت اور انعام سے سرفراز کیا لیکن میرے ساتھ جس نے اس کی پیشین گوئی کی تردید کی ہے اور ہی طرح کا سلوک روا رکھا جا رہا ہے ؎

شاہا زکوۂ گوش و زباں را زدی نقط بشنو زمن سوالے و تشریف دہ جواب

آنکس کہ حکم کردہ بطوفان باد و گفت کاسیب آں عمارتِ گیتی کند خراب

تشریف یافت از تو و اقبال دید و جاہ در بندِ آں نہ شد کہ خطا گفت یا صواب

من بندہ چوں خطاے وے ابطال کردہ ام با من چرا ز دجبہ و گرمی رود جواب (قصائد ظہیر ص ۱۶۴)

قولہ " انوری نے اب دربار میں رہنا مناسب نہ سمجھا اور ترک ملازمت کرکے نیشاپور چلا آیا۔ اب اس کی شہرت دُور دُور پھیل گئی تھی، ہر طرف سے امرا و رؤسا کے پیغام آتے تھے کہ ہمارے دربار میں قدم رنجہ کیجئے، ۵۳۳ھ میں سلطان احمد پیروزشاہ نے اس کو خط بھیج کر بلایا اور ساتھ لے کر خوارزم کی طرف روانہ ہوا، انوری یہ سن کر کہ دریائے جیحوں راہ میں پڑتا ہے اس قدر ڈرا کہ بلخ پہنچکر سلطان احمد سے معذرت چاہی اور وہیں رہ گیا، لیکن بلخ میں اس قدر تکلیف پہنچی کہ تنگ آکر ایک قصیدہ لکھا اور سلطان احمد کی خدمت میں بھیجا مطلب کی بات اس طرح ادا کی۔

این حال کہ در بلخ کنوں دارم ‏ ‏ ‏ ‏ از خوف پریشانی و گمراہی

زیں بیش اگر وہم و گماں بردے ‏ ‏ ‏ ‏ آں مخلطے کوتہ نظر ساہی

بر عبرہ جیحوں نہ بآموزش ‏ ‏ ‏ ‏ چوں بط بہ طبیعت شدمے راہی

سلطان احمد نے اسی کو دربار میں طلب کیا اور معتمد خاص بھیجا کہ انوری کو ساتھ لے کر آئے" (شعرالعجم صـ۲۶۷)

یہ خیال کہ پیشین گوئی غلط ثابت ہونے کی بنا پر انوری سنجر کے دربار سے قطع تعلق کرکے نیشاپور چلا جاتا ہے درست نہیں معلوم ہوتا۔ سنجر اور انوری کے تعلقات میں کبھی کوئی تغیر رونما نہیں ہوا۔

سلطان احمد پیروزشاہ کے سوانح کے متعلق تاریخیں خاموش ہیں۔ کلیات اس قدر روشنی ڈالتا ہے کہ ابتدا میں وہ ایک خطائی شہزادہ تھا اور سنجر کے عہد سے آٹھ نو سال بعد خراسان کے بعض حصے جن میں بلخ اور ترمذ قابل ذکر ہیں اس کے تصرف میں آجاتے ہیں جن میں موخرالذکر مقام کو وہ اپنا پایۂ تخت بنا لیتا ہے وہ کوئی سلجوقی شہزادہ نہیں تھا انوری کے شعر سے واضح ہوتا ہے ؎

ز شیر بیشۂ سلجوقیاں بیک جولاں ‏ ‏ ‏ ‏ شکارے کہ بصد سال کردہ بربودہ ‏ ‏ صـ۳۶۳

لیکن خوارزم شاہیوں سے بھی اس کا کوئی علاقہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ انوری اس کو خطائی مانتا ہے بلخ پر پہلی مرتبہ قابض ہونے کے بعد بعض مصلحتوں کی بنا پر وہ اس کو چھوڑ دیتا ہے اور اس وقت ہمارے شاعر کے اس کے ساتھ گہرے تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ کلیات میں ایک سے زیادہ موقعوں پر انوری

پیروزشاہ کے بلخ چھوڑنے پر اپنا افسوس ظاہر کرتا ہے **شعر**

زہے زعدل تو خلقِ خدائے آسودہ تو میروی و زمین و زماں ہمی گویند صـ ۳۶۴

پیروزشاہ جس وقت ترمذ کو مستقلاً اپنا صدر مقام بنالیتا ہے انوری جو اُن ایام میں بلخ میں قیام پذیر ہے اس کے دربار میں حاضری کا اشتیاق اپنے بعض قصائد میں ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً:

گفت انوری بہانہ چہ آری گناہ تست قسمم ز خدمتِ تو بدوری چرا فتاد

بگزر کہ عالمے ہمہ آب و گیاہ تست گفتم کہ آبِ جیحوں گفتا خری مکن

عیب از خیالہائے دماغ تباہ تست گفتم کہ طالعے خللے ہست گفت نیست

کاندر ازائے مجلسِ شہ بلخ جاہ تست یوسف نہ و بیژن اگر نہ بہ گفتمے صـ ۵۵

ایک اور قصیدے میں جو عماد الدین پیروزشاہ کے بلخ چھوڑنے کے سات ماہ بعد لکھا جاتا ہے انوری کہتا ہے ؎

گر میسّر گشتے اندر ہفت کشور یاورے خسروا من بندہ را در مدتِ ایں ہفت ماہ

فی المثل بر تختۂ بروے کشاں تا معبرے تا مرا از لجۂ دریائے حرماں دوست دار

چوں دگر ابنائے جنسِ خویش اکنوں سرورے ہستمی از بس کہ سر بر آستانت سودمے

ماندہ ام در قعرِ دریائے عنا چوں لنگرے لیکن از بس قصد ایں ناقص عنایت روزگار صـ ۳۶۷

پیروزشاہ آخرکار اپنے وزیر جلال الوزرا کو اس کی طلبی کا حکم دیتا ہے۔ وزیر انوری کے نام فرمان طلب روانہ کرتا ہے۔ جواب میں شاعر ایک قطعہ لکھتا ہے جس کے بعض اشعار حوالۂ قلم ہوتے ہیں ــ

قیام کرد و بوسید و بر دو دیدہ نہاد مثال عالی دستور چوں بہ بندہ رسید

کند سپہر کہ ہست او زمانہ را بنیاد مرا بخدمتِ شہ خواندہ کہ خدمتِ او

پس از وفور خرابی از و شدند آباد عماد دولت و دیں آں کہ حصن دولت و دیں

زسایۂ علم و شعلۂ سنانش زاد شہ مظفر پیروزشہ کہ فتح و ظفر صـ ۶۴۱

علامہ شبلی شاعر کے طلب کئے جانے کی تاریخ ۵۴۳ھ بیان کرتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں۔ الوزی کا بیان

اس کے متعلق بالکل صاف ہے **شعر**

اندر آمد ز در حجرۂ من نیم شبے   روز پنجشنبہ یعنی دوم بہمن ماہ

سال بُد پانصد و سی و شش از تاریخ عجم   گفت برخیز کہ از شہر برون شد ہمراہ   ۵۳۶ھ

شاعر کا مقصد یہاں سن یزدجردی سے ہے جو ان ایام میں عام طور پر ایران میں رائج تھا۔ سن ہجری اس وقت ۶۱-۵۶۰ھ کے مابین ہونا چاہیئے۔

قولہ " اقسام سخن میں سے انوری کی طبیعت ہجو سے خاص مناسبت رکھتی تھی، ہجو میں وہ نہایت دلچسپ اور لطیف مضامین پیدا کرتا تھا، جو شعر اس کی زبان سے نکلتا عالم میں پھیل جاتا۔ اس کے ساتھ طبیعت میں تنگ ظرفی اور کم حوصلگی تھی، ذرا کسی سے رنج ہوا اور اس نے ہجو کا طومار باندھ دیا اس عادت کی وجہ سے اس نے سارے زمانے کو دشمن بنا لیا تھا"۔ (شعر العجم ۲۶۹)

اس پر مجکو ایک انگریزی ضرب المثل یاد آتی ہے کہ " پہلے کتے کو بدنام کردو پھر شوق سے اس کو پھانسی دو" ایک شاعر کے کمالات سے انکار کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس کے کمترین اوصاف کو خوب چمکایا جائے اور اصلی کمال سے اغماض کیا جائے۔ چونکہ علامہ شبلی کے گوشۂ خاطر میں ظہیر فاریابی کے مبالغہ آمیز احترام نے اپنا گھر بنا لیا ہے اس لئے غریب انوری کو مشکل سے بیرون آستاں جگہ دی جاتی ہے۔ دو تلواریں تمام دنیا جانتی ہے ایک نیام میں نہیں آتیں اسی لئے مجکو حیرت ہے کہ انوری کو شعر العجم کے مشاہیر میں کیوں داخل کیا گیا اور کیوں اس کے ساتھ بے مہر مادر کا سا سلوک جائز رکھا گیا۔

انوری کے کمالات سے جس نے اپنے وطن کی تاریخ کے بعض نہایت تاریک موقعوں پر اپنی شاعری کے ذریعے سے عظیم الشان کارنامے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور جس نے اپنی طبعی شرافت اور اخلاقی جرأت کا شاندار ثبوت دیا ہے مولانا کو اسی قدر یاد رہا کہ ہجو میں وہ نہایت لطیف مضامین پیدا کرتا ہے۔ لیکن طبیعت کا دنی اور تنگ ظرف ہے۔

متقدمین کے بیانات نیز کلیات کے تتبع سے یہ امر محقق نہیں ہوتا کہ انوری کو ہجو میں کوئی خاص شغف تھا ہجو اتفاقیہ انوری کے ہاں بھی پائی جاتی ہے جیسے اور شعرا کے کلام میں لیکن یہ کہنا کہ جہاں کسی سے ناراض ہو

ہجو کہدی اور اس طرح ساری دنیا کو اپنا مخالف بنا لیا میرے خیال میں واقعات پر مبنی نہیں۔ انوری فرشتہ نہیں تھا انسان تھا بعض معاصرین سے اس کی عداوت ضرور رہی ہے اور یہ تلخ تجربہ ہر شاعر اور ہر انسان کو ہوا کرتا ہے لیکن اس کے دشمنوں کے مقابلے میں اس کے دوستوں اور مداحوں کا دائرہ زیادہ وسیع تھا۔ بڑے بڑے لوگوں سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ صدور اور امرا اس کی عزت کرتے تھے۔ سلاطین اور وزرا اس کا احترام کرتے تھے ان میں سے بعض نے اس کے قطعات کے جواب میں قطعات لکھے ہیں۔ میں بعض کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

(۱) قاضی حمید الدین صاحب مقامات حمیدی (المتوفی ۵۵۹ھ) اس عہد کے نہایت مشہور شاعر فاضل اور ادیب ہیں۔ انوری سے ان کا رشتۂ اتحاد بے تکلفی کی حد تک پہونچا ہوا تھا دونوں ایک دوسرے کے کمال کے معترف تھے اور دونوں نے مختلف موقعوں پر ایک دوسرے کے حق میں قطعات لکھے ہیں۔

انوری کے ایک قطعہ کے جواب میں جس سے شبلی نے دو شعر نقل کئے ہیں قاضی صاحب لکھتے ہیں۔

مرا انوری آں چو دریا توانگر ہمی از سخن زادۂ کاں فرستد
چو بے بر گیم گشت او را مقرر ز خلد بر نیم ہمی خواں فرستد
جو ہر گنج را جائے ویرانی آمد ازاں گنج خود سوئے ویراں فرستد
بمانا داں آں دوست کو دوستاں را غذائے دل و راحتِ جاں فرستد ص ۶۶۴

ایک موقعے پر قاضی صاحب انوری سے دریافت کرتے ہیں کہ خدا کا علم ہر شے پر محیط ہے اور تمام واقعات اس کے ارادے کے مطابق ظہور پزیر ہوتے ہیں لیکن خدا جب چاہے اس میں تغیر پیدا کر سکتا ہے کیوں کہ وہ قادر مطلق ہے لیکن دیکھا جاتا ہے کہ مشیت الٰہی میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی آخر اس کی کیا وجہ ہے۔

اوحد الدین کہ در سوال و جواب بدھد داد علم و بستاند
بہ بزرگی جواب ایں فتویٰ بکند چوں بفضل برخواند
آں کہ داند کہ حال عالم چیست پس تواند کزاں بگرداند
ہم بر آں گر بماند از چہ بود عقل اینجا فرو ہمی ماند ص ۶۶۵

انوری جواب دیتا ہے۔

اے بزرگِ جہاں حمیدالدیں ... کہ خرد مدح تو ہمی خواند
وانکہ از ہیچ روئے نتواں گفت ... کہ نداند ہمی و نتواند
ماند یک چیز آں کہ خود نکند ... گرچہ جائے تواند و داند
زاں کہ بر بے نیاز واجب نیست ... کہ پئے نفع کس قضا راند
لم درا فعال او نباید ازاں ... کہ سبب درمیانہ ننشاند
غنی مطلق از غرض دور ست ... فعل او کے بفعلِ ما ماند
ہیچ تدبیر نیست جز تسلیم ... خویش را پیش ازیں نرنجاند ص۶۶۵

(۲) شجاعی ایک شاعر ہے جو انوری کو لکھتا ہے۔

اے انوری تو ئی کہ بفضل و ہنر بوند ... احرار روزگار و افاضل ترا رہی ص۷۵۲

اور جواب میں انوری لکھتا ہے۔

شجاعی اے خط و شعر تو دام و دانۂ عقل ... ہزار مرغ چو من صید دام و دانہ تو

میں بخوف طوالت صرف ایک ایک شعر پر قناعت کرتا ہوں پورے قطعوں کے لئے کلیات ملاحظہ ہو۔

(۳) تاج الافاضل فخرالدین خالد بن ربیع المسالکی سے انوری کی گہری دوستی تھی وہ کہتے ہیں

سلام علیک انوری کیف حالک ... مرا حال بے تو نہ نیک است بارے

(۴) ارشدالدین ایک اور شاعر ہے جس کے قطعہ کے جواب میں انوری کہتا ہے ؎

ہیچ دانی ارشدالدین کز کف و طبعِ تو دوش ... من چہ شربتہائے آبِ زندگانی خوردہ ام ص۸۰۵

(۵) کمالی شاعر انوری کا معاصر ہے اس کے قطعہ کے جواب میں انوری لکھتا ہے ؎

شعر ہائے کمالی آں بہ سخن ... پائے طبعش سپردہ فرقِ کمال ص۶۹۲

(۶) ایک اور شاعر انوری کو اپنے گھر بلاتا ہے

اوحدالدین انوری اے من مریدِ طبع تو ... وے ہوائے عشق و مہرِ تو مرادِ طبع من

ہم بہ بیمِ دولتِ وصل تو اندر ربع خویش — گر محلِّ دولت و اقبال گرد د ربع من صلاً ۱۸۷

(۷) ایک اور شاعر جس کا نام معلوم نہ ہو سکا انوری کی مدح میں قصیدہ لکھتا ہے

اے در ہنر مقدّم اعیانِ روزگار — در نظم و نثر اخطل و حسّانِ روزگار

آسان بر نفاذِ تو دشوار اختراں — پیداست بر ضمیرِ تو پنہانِ روزگار

حلم ترا کمانہ ہمی کرد ناگہاں — بگسست ہر دو پلّۂ میزانِ روزگار

اخلاقِ تو سواد ہمی کرد لطفِ تو — پُر شد بیان دفترِ دیوان روزگار

با عقل ترساں ترساں گفتم کہ در ثنا — آنرا کہ ہست دیدۂ اعیانِ روزگار

لقمانِ روزگارش خوانم چہ گفت نے — جز انوری کہ زیبد لقمانِ روزگار صلاً ۱۵۵

(۸) ایک اور شاعر لکھتا ہے ؎

فرخندہ اوحدالدین فرزانہ انوری — اے آنکہ از دو عالم وحدت منورست

(۹) سراجی شاعر ترمذی کے خط کے جواب میں انوری کہتا ہے ؎

سراجی اے ز مقیمانِ حضرت ترمذ — رسید نامۂ تو ہیچو نامۂ ز بہشت صلاً ۶۶۳

(۱۰) ایک وزیر دربار سے اُٹھکر اپنے محل کی طرف جا رہا تھا دامن پاؤں میں الجھا گر پڑا۔ انوری نے اس موقعے پر ایک قطعہ لکھکر بھیجا جس کا ابتدائی شعر ہے

صاحبا سقطۂ مبارک تو — نہ ز آسیب حادثات رسید صلاً ۶۳۸

وزیر قطعہ کا جواب قطعہ میں دیتا ہے میں ابتدائی شعر پر قناعت کرتا ہوں ؎

گرچہ شب سقطۂ من ہر کہ دید — پارۂ از روز قیامت شمرد صلاً ۶۶۹

کلیات سے بعض ایسے واقعات معلوم ہوتے ہیں جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انوری نے زمانہ کو اپنا دشمن بنانے کے بجائے ایسی کوشش بھی کی ہے کہ دشمنوں کو دوست بنایا جائے۔

فتوحی مروزی اس کا سخت ترین معاند مانا گیا ہے لیکن انوری اس کی طرف بھی اپنی دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے لئے طیار رہے۔ چنانچہ کسی دوست کو لکھتا ہے ؎

بندہ را نیز دوستدار آید گر فتوحی ز دوستدارِ تو گر ز لطفِ تو غمگسار آید ...ندم با غمے کہ جان ببرد

یا بنزدیکِ او روم روزے کہ بروزیم یک دو بار آید ص۶۴۸

کسی اور موقعے پر شاعر اپنے کسی دشمن کی سفارش میں جس نے اس کو نقصان پہنچایا ہے کہتا ہے۔

نقشِ عنوان نامۂ تزویر بندہ را خصم اگر بہ پیشِ تو کرد چون تو فرزانہ چشمِ عالم پیر اے جوان بخت سروے کہ ندید

اے بزرگ جہاں بجرمِ حقیر مبر امیدش از عطائے بزرگ بگیہ مست شربتِ تشویر ...الش آں بس کہ تا بحشر بماند

از جہان نفور جفت نفیر مادرے پیر دارد و دو سہ طفل پائے ظلم و نیاز در زنجیر زانکہ جز و بست جود تو تنگ شد

صورتِ حالِ ہر یکے تصویر غم دل کردہ بر رخ ہر یک ہمہ عریان جامہ از تدبیر ہمہ گریاں لقمہ از امید

زیں پس از خشک سال حادثہ شیر گاو دوشائے عمر او ندہد بندِ ادبار ایں معیل فقیر دست اقبالت ار نہ بکشاید (ص۱۵۴)

انوری کا اگر زمانہ دشمن ہوتا تو اس کو کیا ضرورت تھی کہ اپنے دشمنوں کے ساتھ اس قدر فیاض جذبات کا اظہار کرتا۔ مولانا شبلی کی افراط و تفریط استعجاب انگیز ہے کبھی تو انوری کو ایسا بلند پایہ مانتے ہیں کہ سنجر جیسا جلیل القدر سلطان دو مرتبہ اس کے گھر جاتا ہے اور جب ناراض ہوتے ہیں تو اتنا کم ظرف اور بدحوصلہ بتاتے ہیں کہ تمام دنیا کو اس کا دشمن بنا دیتے ہیں۔

قولہ "سلطان علاء الدین ملک الجبال سے لوگوں نے شکایت کی کہ انوری نے حضور کی ہجو لکھی ہے سلطان نے ملک طوطی کو جو مرو شاہجہاں کا رئیس تھا، خط لکھا کہ انوری کو گرفتار کرکے دربار میں بھیجدو۔ ملک طوطی نے فخر الدین مروزی کو جو اس کے دربار کا شاعر اور منشی تھا حکم دیا کہ انوری کو لکھو کہ میں آپ کے ملنے کا مشتاق ہوں۔ فخر الدین مروزی انوری کا بڑا دوست تھا اس نے انوری کو اصل حال سے مطلع کرنا چاہا، لیکن ملک طوطی کے ڈر سے صاف صاف نہیں لکھ سکتا تھا، اس لئے خط کے سرنامہ پر یہ شعر لکھا۔

ھی الدنیا تقول بملاء فیھا حذارِ حذار من بطشی و فتکی

انوری سمجھا کہ کچھ بھید ہے، تحقیق سے اصل واقعہ معلوم ہوا"

(شعر العجم ص۲۹۰)

مولانا شبلی اس موقعے پر پہلی مرتبہ محمد عوفی کی لباب الالباب کا حوالہ دیتے ہیں لیکن میرا عقیدہ ہے کہ یہ کتاب اُسوقت تک ان کی نظر سے نہیں گزری تھی اس لئے کہ شبلی فخر الدین مروزی کو ملک طوطی کے دربار کا شاعر اور منشی بیان کرتے ہیں جو ملک طوطی کے خوف سے انوری کو اصل واقعے سے اطلاع نہیں دے سکتا حالانکہ لباب سے کوئی ایسا مفہوم ظاہر نہیں ہوتا بلکہ یہ قیاس میں آتا ہے کہ خود علاء الدین کے دربار سے اس کا تعلق تھا۔ اس موقعے پر لباب کی عبارت ہے:

"بنزدیک ملک طوطی نبشت تا آں بلبل بستان فصاحت را بخدمت او فرستد ولطف مجاملت درمیان آورد وچناں می نمود کہ او را بجہت تعہد وتلطف استدعا می کند ودر ضمیر داشت کہ چوں بروے دست یابد او را نکال گرداند وامیر عمید فخر الدین را ازاں حال علم بود وصورت حال بنزدیک او نمی توانست نبشت چہ از سطوت قہر سلطان علاء الدین می اندیشید ومصادقت ودوستی باہمال رضا نمی داد" (لباب الالباب جلد دوم ص۱۳۸)

ملک طوطی مرو شاہجہاں کا رئیس نہیں ہے بلکہ قبائل غز کا سردار سنجر کے دربار میں غزوں کے دو ایلچی رہا کرتے تھے ایک کا نام قرغود تھا اور دوسرے کا طوطی۔ جب ۵۴۸ھ میں ان قبائل نے سنجر کو شکست دے کر اور اسیر کرکے تمام خراسان پر قبضہ کرلیا تو میاں طوطی کا طوطی خوب بولنے لگا اور طوطی سے ملک طوطی بن گئے۔ انوری جو غزوں سے دلی نفرت رکھتا تھا شومی قسمت سے غز انقلاب کے دور میں کچھ عرصہ کے لئے ملک طوطی کے دربار میں توسل پیدا کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور بضرورت وقت اس کے مدح وثنا میں نظمیں بھی لکھتا ہے لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ تعریفوں میں درپردہ تعریض مقصود ہے مثلاً یہ شعر

طوطی اے آنکہ ز انصاف تو ہر شبے   بلبل شکر العیوق برد زمزمہ را

دیکھو شاعر طوطی کے لئے بلبل لے آیا اور یہ شعر بھی ملاحظہ ہو۔

خسرو صاحبقراں طوطی کہ از انصاف او   باز را تیہو ہوا خواہ است وشاہیں را حمام ص۲۶۷

شاعر نے پرندوں کا ضلع نہیں چھوڑا اور ذیل کی رباعی میں تو پورا چڑیا خانہ بھر دیا ہے۔ رباعی

اے زیر ہمائے ہمت چرخ مدام   کبک از نظرت گرفتہ باباز آرام

اقبالِ تو شاہین و کبوتر ایّام — سیمرغ نظیر خسرو طوطی نام — ص۵۴

دیوان میں اگرچہ غوریوں کے متعلق کئی تلمیحات ملتی ہیں لیکن کوئی نظم ایسی موجود نہیں جس کو علاء الدین کی ہجو کے نام سے موسوم کیا جا سکے البتہ ایک شعر ایسا ہے جو علاء الدین کی ناراضی کے اسباب پیدا کر سکتا ہے۔

کہ بسوراخ غور کین تو در — بمثل موش بادہ شیر نر است — ص۵۷

قولہ "انوری کے مخالف شعرانے اب یہ طریقہ اختیار کیا کہ خود ہجویں لکھکر اس کے نام سے مشہور کرتے تھے اور انوری کو اس کا خمیازہ اُٹھانا پڑتا تھا۔ چنانچہ جب وہ بلخ میں آیا تو فتوحی شاعر نے حکیم سوزنی کی فرمائش سے بلخ کی ہجو لکھی اور انوری کے نام سے مشہور کر دی، اس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

چار شہر ست خراساں را بر چار طرف — کہ وسط شاں بہ مسافت کم صد در صد نیست

گرچہ معمور و خرابش ہمہ مردم دارد — نہ چناں ہست کہ آبستن دام و دد نیست

بلخ را عیب اگر چند باو باش کنند — بر ہر بے خردی نیست کہ صد بخرد نیست

مصر جامع را چارہ نہ بود از بد و نیک — معدنِ زر و گہر بے سرب و بسند نیست

حبذا شہر نشاپور کہ در ملک خدائے — گر بہشت ست ہمین ست و گرنہ خود نیست

اہل شہر اس پر اس قدر برہم ہوئے کہ انوری کو پکڑ کر تختہ کلاہ کیا اور داڑھی اُڑھا کر گلی کوچوں میں تشہیر کی، اس سے بھی زیادہ نوبت پہنچتی لیکن قاضی حمید الدین جن کی تصنیف سے مقامات حمیدی ہے اور جن کی شان میں انوری نے کہا ہے ؎

بمدح و ثنا گر گنی رائے نظمے — نہ دشوار گویم نہ آساں فرستم

ولیکن بہ مدحِ جناب حمیدی — اگر وحی باشد ہراساں فرستم

انھوں نے انوری کی حمایت کی اور اسکی جان بچ گئی' انوری نے ان واقعات کا اس قصیدے میں ذکر کیا ہے ع اے مسلماناں فغاں از دورِ چرخِ چنبری

چونکہ انوری کے بچانے میں ابو طالب نعیم، صفی الدین عم، مفتی تاج الدین، حسن محتسب نظام الدین احمد مدرس نے بھی کوشش کی تھی، اس لئے قصیدے میں سب کا ذکر کیا ہے اور بلخ کی ہجو سے نہایت تبری کی ہے کہ بلخ قبۃ الاسلام ہے میں اس کی ہجو کیوں کر کہہ سکتا ہوں ؟" (شعر العجم صفحہ ۲۷۰ ج ۲)

ہجو بلخ کے اصل واقعات، ایسا معلوم ہوتا ہے، ہم تک نہیں پہنچے ہیں۔ تذکرہ نگاروں کا ماخذ غالباً وہی قصیدہ ہے جو سوگند نامہ درباب نفی ہجو بلخ کے نام سے مشہور ہے۔ میں بھی ان واقعات کے مطالعے کے وقت اسی سوگند نامہ سے کام لوں گا۔

سنجر کی وفات کے بعد جب خراسان میں انقلاب پر انقلاب آرہے تھے اور آئے دن حکمراں بدل رہے تھے انوری بلخ میں سکونت اختیار کر چکا تھا۔ ان دنوں طغرل تگین کا عہد حکومت تھا جیسا کہ شاعر سوگند نامہ کے مقطع میں کہتا ہے۔

حبذا تاریخ ایں انشا کہ فرماندہ بہ بلخ رایت طغرل تگیں بودہ است و رائے ناصری صفحہ ۴۰۴

اس فرماندہ کے حالات سے ہم تاریکی میں ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا زمانہ سنجر کے بعد ہے۔ چنانچہ انوری ؎

ملک اگر در دولتِ سنجر بآخر پیر گشت شد جواں بار دگر در دولت طغرل تگیں صفحہ ۳۲۳

علیٰ ہذا ہجو بلخ کے واقعے کی تاریخ سے ہم ناواقف ہیں۔ بالعموم یہی خیال کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ انوری کے آخر حصۂ عمر سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کے بعد وہ عزلت نشین ہو جاتا ہے۔ پروفیسر براون اور میرزا محمد قزوینی اس واقعہ کا ظہور انوری کی پیشین گوئی کے غلط ثابت ہونے کی پاداش میں بتاتے ہیں لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ وہ انوری کی عزلت گزینی سے بہت عرصہ پیشتر ظہور میں آیا ہے۔ انوری کی تشہیر سلطان سنجر المتوفی ۵۵۲ھ اور قاضی حمید الدین المتوفی ۵۵۹ھ کے سنین وفات کے درمیان کسی وقت عمل میں آئی ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ قاضی حمید الدین شاعر کو بلخیوں کے ہاتھ سے نجات دلواتے ہیں۔

ہجو کے اصلی مصنف کے نام سے ہم ناواقف ہیں۔ سوگند نامہ میں صرف "حسود" کے لفظ سے یاد

کیا گیا ہے **شعر**

باز داں آخر کلام من ز متحولِ حسود　　فرق کن نقش الٰہی را ز نقش آذری　ص ۴۰۱

اور ہمارے شاعر کے ساتھ اس کی عداوت دس سال سے چلی آ رہی ہے

تا تو فرصت جوئے گردی و زکمیں گاہ حسد　　غصّۂ دہ سالہ را با من بصحرا آوری　ص ۴۰۴

ہجو کا مصنف خواہ کوئی ہو حکیم انوری کے بیان سے صاف پایا جاتا ہے کہ صاحب "خر نامہ" نے جو بقول شادی آبادی حکیم سوزنی ہے اس کی ہجو کی ہے۔ سوگند نامہ **شعر**

بہ چوں مرا و را واضع خر نامہ گیرد ریش گاو　　گاو او در خرمن من باشد از ... خری　ص ۴۰۲

ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ "ہجو بلخ" کوئی اور چیز ہے اور "خر نامہ" کوئی اور چیز ہے اور وہ نظم جس سے بلخی ناراض ہوتے ہیں ہجو بلخ ہے نہ خر نامہ۔ شادی آبادی نے حکیم سوزنی کے کلیات سے خر نامہ کے چند اشعار نقل کئے ہیں چونکہ موجودہ مذاق کے معیار سے پست ہیں لہذا قلم انداز کئے جاتے ہیں صرف وزن و ردیف کی خاطر ایک شعر یہاں لکھ دیا جاتا ہے ؎

آں سر خراں بجائے نماید سر خری　　پر مغز خر شود ہمہ دیوان دفترم

شادی آبادی سوزنی کے دیوان سے امیر معزی کی ہجو کے بعض اشعار نقل کر کے یہ غلط نتیجہ مترتب کرتے ہیں کہ ہجو بلخ کا واضع خود امیر معزی تھا لیکن امیر معزی ۵۴۲ھ میں وفات پاتا ہے اثیر الدین فتوجی ان ایام میں زندہ تھا اور انوری سے اس کی مخالفت کا راز بھی طشت از بام ہے اسی لئے تذکرہ نگاروں نے ہجو کا قرعہ اس کے نام پر ڈالا ہے۔

آمدم برسر قصہ، ہجو کا خمیازہ بے گناہ انوری کو اٹھانا پڑا تفصیلی واقعات کسی کو معلوم نہیں سوگند نامہ میں شاعر نے اس قدر لکھا ہے **بیت**

بر سرِ من مغفری کردے کلہ داں برگزشت　　بگزرد بر طیلسانم نیز در معجری　ص ۳۹۹

اس شعر کی ترجمانی میں اہل تذکرہ نے قیاس دوڑایا ہے کہ بلخیوں نے انوری کو تختہ کلاہ کیا اور عورتوں کی اوڑھنی اُڑھا کر گلی کوچوں میں تشہیر کی۔ شادی آبادی کہتے ہیں کہ امیر معزی کی شکایت پر یہ تشہیر پادشاہ عہد کے حکم سے

وقوع میں آئی۔

لیکن ایک اور قصیدے سے جو مجدالدین کی مدح میں ہے اور جس کا مطلع ہے:-

اکنوں کہ ماہ روزہ بنقصان دراوفتاد　　آہ از حجاب حجرۂ دل بر درا وفتاد　ص۹۵

اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ رمضان میں ہوا تھا۔ غوغائی اس کے گھر پر چڑھ آئے تھے اور اس کی تخویف و توہین وہیں عمل میں آئی تھی۔ شاعر مجدالدین کو خطاب کر کے کہتا ہے ؎

الحق محال نیست کہ بندہ چو دیگراں　　از عشق خدمت تو بدیں کشور اوفتاد

اوراکہ شکرہائے شکر ریز شعرہاست　　زہرے بدست واقعہ در شکر اوفتاد

از حضرتے حشر بدرش حاضر آمدند　　نا دیدہ مرگ در فزع محشر اوفتاد

تیمارش از تعرضِ ہر بے خبر فزود　　دستارش از عقیلۂ صد معجر اوفتاد

بشنو کہ در عذاب چگونہ رسید صبر　　بنگر کہ در خلاب چگونہ خر اوفتاد

با منکرانِ عقل دریں خطہ کار او　　داند ہمی خدائے کہ بس منکر اوفتاد

کافور در غذاش با فطار ہر شبے　　از جور او (؟) بمومن و برکافر اوفتاد

از بس کہ بار داوری این و آں کشید　　و از سخن بحضرتِ این داور اوفتاد　ص۹۸

اس ورطۂ بلا سے جن لوگوں نے انوری کو نجات دلوائی ہم ان کے ناموں سے مطلق بے خبر ہیں۔ سوگندنامہ میں جن بزرگوں کا نام بسبیل تذکرہ آیا ہے اس سے یہ مقصد ہرگز نہیں کہ وہ اس کے نجات دہندہ ہیں۔ شاعر کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ جب بلخ میں ایسے ایسے مشاہیر فضلا و علما جمع ہیں ان کی موجودگی میں بھلا میری کیا مجال ہو سکتی ہے کہ بلخ کی ہجو کا خیال دل میں بھی لا سکوں اس کے متعلق سوگندنامہ کے بیانات بالکل صاف ہیں۔

باچنیں سکاں اگر از قدرِ شاں عقدے کشند　　فارغ آید چرخ اعظم ازچہ از بے زیوری

ہجو گویم بلخ را ہیہات یارب زینہار　　خود تواں گفتن کہ زنگارست زر جعفری　ص۴۰۱

ان بزرگوں میں سب سے مقدم نظام الدین ہیں۔ شبلی ان کو نظام الدین احمد مدرس کہتے ہیں لیکن ان کا پایہ اس سے بدرجہا افضل و ارفع معلوم ہوتا ہے۔ شادی آبادی ان کو ضابط بلخ کہتے ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ

قاضی القضاۃ ہیں۔ سوگندنامہ

افتخار خاندان مصطفیٰ در بلخ و من	کردہ ام در خدمتش حسانی و ہم بوتری
آں نظام دولت و دیں کانظام عدل او	در دل اعصاں کند باد صبا را رہبری
در پناہ سدۂ جاہ رعیت پرورش	بر عقاب آسماں فزاں دہد کبک دری
ہم نبوت در نسب ہم پادشاہی در حسب	کو سلیماں تا در انگشتش کند انگشتری
مسند اقضی القضاۃ شرق و غرب افراشتہ	آں کہ ہست از مسندش عباسیاں را برتری
آنکہ پیش کلک و طبعش آں دو سحر آنکہ حلال	صد چو من ہستند چوں گوسالہ پیش سامری
آب و آتش را اگر در مجلسش حاضر کنند	از میان ہر دو بردارد شکوہش داوری ص۴۰۰

قاضی حمیدالدین کے ذکر کے بعد انوری خواجہ صفی الدین عمر کا ذکر کرتا ہے۔ شعرالعجم میں انھیں "صفی الدین عجم" کہا گیا ہے لیکن سوگندنامہ:

خواجۂ ملت صفی الدین عمر در صدر شرع	آنکہ نبود دیو را در سایۂ او قادری ص۴۰۰

کلیات میں ان کی تعریف میں ایک اور قصیدہ موجود ہے جس کا مطلع ہے:

زمانہ گزراں بس حقیر و مختصر است	ازیں زمانۂ دوں درگزر کہ درگزرست ص۵۲

تاج الدین کے بعد مجدالدین ابوطالب کا نام آتا ہے غالباً یہ وہی بزرگ ہیں جن کے مدحیہ قصیدے سے چند اشعار اوپر درج ہوئے ہیں۔ شبلی ان کو ابوطالب نعیم کہتے ہیں۔ سوگندنامہ:

مجد دیں بوطالب آں عالم کرہ گم شدہ ورو کرہ	عقل کل آں کردہ از بیرونِ عالم اطہری ص۴۰۱

شعرالعجم میں ایک اور نام ملتا ہے "حسن محتسب" مگر سوگندنامہ اس سے واقف نہیں ہے۔

قولہ " بالآخر انوری نے تمام لغویات سے توبہ کی اور گوشہ گزیں ہو کر بیٹھا، سلطان غوری جہانسوز نے دربار میں طلب کیا، لیکن اس نے انکار کیا اور یہ قطعہ جواب میں لکھا۔

کلبۂ کاندرو بروز بہ شب	جائے آرام و خورد و خواب منست
جایگہ دارم اندرو کہ ازو	چرخ در عین رشک و تاب منست
ہرچہ در مجلس ملوک بود	ہمہ در کلبۂ خراب منست
رحل اجزاء و نان خشک درو	گرد خوان من و کباب منست

خرقۂ صوفیانہ اطلس | از ہزار اطلس انتخاب من ست
قلم کوتہ و صریر خوشش | زخمہ و نغمۂ رباب من ست
خدمت پادشہ کہ باقی باد | نہ بہ بازوے آب و خاک من ست
ہر چہ بیروں بود ازیں کم و بیش | حاش للسامعین عذاب من ست
وین طریق از نمایش ست خطا | حکم ایں خطا صواب من ست
زیں قدر راہ رجعتم بستہ است | آں کہ او مرجع و مآب من ست
نیست ایں بندہ را زبانِ جواب | جامہ و جائے من جواب من ست

شعر العجم ص ۲۷۲

علاء الدین غوری کی طلب کا واقعہ صحیح نہیں مانا جاسکتا کیونکہ بروایت مشہور علاء الدین انوری سے صاف نہیں تھا۔ دوسرے یہ امر بھی خاطر نشیں رہے کہ اگرچہ انوری کی گوشہ نشینی کا سال ہم کو معلوم نہیں لیکن کلیات سے اس قدر قطعی پایا جاتا ہے کہ حکیم انوری ۵۶۰ـ۶۱ھ میں سلطان عماد الدین پیروز شاہ کے پاس ترمذ جاتا ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ اس سن سے ایک عرصہ بعد تک وہ مدح سرائی اور شعر گوئی سے تائب نہیں ہوتا۔ کیونکہ کلیات میں متعدد قصائد اسی پیروز شاہ کی مدح و ثنا میں ملتے ہیں جو غالباً کئی سال کے عرصہ میں لکھے گئے ہونگے۔ لیکن علاء الدین غوری جہاں سوز ۵۵۶ھ میں وفات پاتا ہے اس لئے انوری کی عزلت نشینی کے زمانے تک اس کا زندہ رہنا ناممکن ہے۔

قطعۂ بالا میں انوری جس پادشاہ کی خدمت سے دستکش ہوتا دیکھا جاتا ہے وہ کوئی اور بادشاہ ہے جس سے اس کے گہرے اور دیرینہ تعلقات معلوم ہوتے ہیں اور جس کے دربار میں وہ عرصہ تک رہ چکا ہے کیونکہ یہ طلبی کی تحریک عرصہ تک جاری رہی ہے اور کئی قطعات اس سلسلہ میں لکھے گئے ہیں۔ ذیل میں انوری کا آخری جواب دربار پادشاہ کی طرف سے اس کا جواب الجواب جس پر یہ تحریک ختم ہو جاتی ہے درج کئے جاتے ہیں:-

خسروا روزے زعمرم گر سپہر افزوں کند | تا نگیرد بستہ مرگم چوں مگس را عنکبوت
گر توانم سجدہ گاہ شکر سازم ساقتش | چوں مسیح مریم از صفر حمل تا پائے حوت
پس چگوئی صرف یارم کرد بر درگاہ تو | ہر یکے زیں روزہا را از پئے یکروزہ قوت
طالب مقصود را یک سمت باید مستوی | مرد را سرگشتہ دارد اختلافات سموت
من چو کرم پیلہ ام قانع بیک نوع از غذا | تو اماں با صبر چوں وترِ ضعیفی با قنوت

ص ۶۲۶

پادشاہ بھی اسی زمین میں جواب دیتا ہے لیکن وزن مثمن کے بجائے مسدس ہے۔

اے بتو مخصوص اعجازِ سخن | چوں بو تر آئی و در معنی قنوت

سمت درگاہت سعود چرخ را — گشتہ در دوراں گل خیر السموت
ما چو قرص ارزن و حوت غدیر — تو چو قرص آفتاب و برج حوت
صعوۂ ما مرغ سیمرغ تو نیست — تو قوی بازو بفضل و ما بقوت
بیش نظم چوں نسیج الوحد تو — چیست نظم ما نسیج العنکبوت
گرچہ در تالیف ایں ابیات نیست — بے سمیں غثے و قصبے بے کروت
رائے عالی در جواب ایں مبند — لایق اینجا السکوت ست السکوت — ص ۵۹۵

قولہ " انوری نے حسب روایت دولت شاہ ۵۴۷ھ میں بمقام بلخ وفات پائی اور سلطان احمد خضرویہ کے پہلو میں دفن ہوا " — شعر العجم ص ۲۷۳

انوری کی وفات میں سخت اختلاف ہے پروفیسر براؤن پروفیسر ژوکوفسکی کے حوالے سے یہ تاریخیں دیتے ہیں۔ آتش کدہ قلمی ۵۵۶ھ اور طبع بمبئی ۵۵۹ھ تقویم التواریخ حاجی خلیفہ ۵۴۷ھ، مرات الخیال شیر خاں لودھی ۵۴۹ھ، ہفت اقلیم ۵۸۰ھ، مجمل فصیحی ۵۸۵ھ، خلاصۃ الاشعار تقی کاشی ۵۸۷ھ اور مرات العالم ۵۹۲ھ۔

دولت شاہ نے جو تاریخ دی ہے ہر صورت میں غلط ہے چونکہ طوفان باد کے سلسلہ میں انوری کا نام بھی لیا جاتا ہے اور طوفان کی تاریخ ۵۸۲ھ ہے اس لئے انوری کی وفات اس سن کے بعد کسی وقت ماننا ہوگی۔
حمد اللہ مستوفی نزہت القلوب میں انوری کا مزار سرخاب، تبریز میں جہاں خاقانی اور ظہیر فاریابی وغیرہم دفن ہیں بتاتا ہے اور یہی قدر حیرت خیز ضرور ہے اس لئے کہ شاعر کا اکثر حصۂ عمر بلخ میں بسر ہوا ہے۔ اواخر عمر میں تبریز جاکر کیا کرتا۔

قولہ " انوری کا اصلی مایۂ فخر ہجو ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر ہجو گوئی کوئی شریعت ہوتی تو انوری اس کا پیغمبر ہوتا، ہجو میں اس نے نہایت اچھوتے، نادر، باریک اور لطیف مضامین پیدا کئے ہیں، ان ہجووں میں قوت تخیل جو شاعری کی سب سے ضروری شرط ہے صاف نظر آتی ہے، لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ اس صنف میں اس کا

قلم کوتہ و صریر خوشش زخمہ و نغمۂ رباب من ست — خرقۂ صوفیانہ اطلس از ہزار اطلس انتخاب من ست
ہر چہ بیروں بود ازیں کم و بیش حاش للسامعین عذاب من ست — خدمتِ پادشہ کہ باقی باد نہ بباز و ے آب و خاک من ست
زیں قدر راہ رحمتم بستہ است آں کہ او مرجع و مآب من ست — ویں طریق از نمایش ست خطا حکمِ ایں خطا صواب من ست
نیست ایں بندہ را زبانِ جواب — جامہ و جلبۂ من جواب من ست
شعر العجم ص ۲۷۲

علاء الدین غوری کی طلب کا واقعہ صحیح نہیں مانا جاسکتا کیونکہ بروایت مشہور علاء الدین انوری سے صاف نہیں تھا۔ دوسرے یہ امر بھی خاطر نشین رہے کہ اگرچہ انوری کی گوشہ نشینی کا سال ہم کو معلوم نہیں لیکن کلیات سے اس قدر قطعی پایا جاتا ہے کہ حکیم انوری سنہ ۵۶۰-۶۱ھ میں سلطان عماد الدین پیروز شاہ کے پاس ترمذ جاتا ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ اس سن سے ایک عرصہ بعد تک وہ مدح سرائی اور شعر گوئی سے تائب نہیں ہوتا۔ کیونکہ کلیات میں متعدد قصائد اسی پیروز شاہ کی مدح و ثنا میں ملتے ہیں جو غالباً کئی سال کے عرصہ میں لکھے گئے ہونگے۔ لیکن علاء الدین غوری جہاں سوز سنہ ۵۵۶ھ میں وفات پاتا ہے اس لئے انوری کی عزلت نشینی کے زمانے تک اس کا زندہ رہنا ناممکن ہے۔

قطعۂ بالا میں انوری جس بادشاہ کی خدمت سے دستکش ہوتا دیکھا جاتا ہے وہ کوئی اور بادشاہ ہے جس سے اس کے گہرے اور دیرینہ تعلقات معلوم ہوتے ہیں اور جس کے دربار میں وہ عرصہ تک رہ چکا ہے کیونکہ یہ طلبی کی تحریک ایک عرصہ تک جاری رہی ہے اور کئی قطعات اس سلسلہ میں لکھے گئے ہیں۔ ذیل میں انوری کا آخری جواب اور بادشاہ کی طرف سے اس کا جواب الجواب جس پر یہ تحریک ختم ہو جاتی ہے درج کئے جاتے ہیں:-

خسروا روزے زعمرم گر سپہر افزوں کند — تا نگیرد بستہ مرگم چوں مگس را عنکبوت
گر توانم سجدہ گاہ شکر سازم ساحتش — چوں مسیح مریم از صفر حمل تا مائے حوت
پس چگوئی صرف یارم کرد بر درگاہ تو — ہر یکے زیں روزہا را از پئے یکروزہ قوت
طالب مقصود را یک سمت باید مستوی — مرد را سرگشتہ دارد اختلافات سموت
من چو کرم پیلہ ام قانع بیک نوع از غذا — تو اماں باصبر چوں وتر ضیفی با قنوت — ص ۶۲۶

بادشاہ بھی اسی زمین میں جواب دیتا ہے لیکن وزن مثمن کے بجائے مسدس ہے۔

اے بتو مخصوص اعجازِ سخن — چوں بو تر آئی و در معنی قنوت

سمت درگاہت سعود چرخ را ۔۔۔ گشتہ در دوراں گل خیر السموت
ما چو قرص ارزن و حوت غدیر ۔۔۔ تو چو قرص آفتاب و برج حوت
صعوۂ ما مرغ سیمرغ تو نیست ۔۔۔ تو قوی بازو بفضل و ما بقوت
پیش نظم چوں نسیج الوحد تو ۔۔۔ چیست نظم ما نسیج العنکبوت
گرچہ در تالیف ایں ابیات نیست ۔۔۔ بے سمیں غثی و قصبے بے کروت
رائے عالی در جواب ایں مبند ۔۔۔ لایق اینجا السکوت ست السکوت ص ۵۹۵

قولہ " انوری نے حسب روایت دولت شاہ ۵۴۷ھ میں بمقام بلخ وفات پائی اور سلطان احمد خضرویہ کے پہلو میں دفن ہوا " شعر العجم ص ۲۷۳

انوری کی وفات میں سخت اختلاف ہے پروفیسر براؤن پروفیسر ژوکوفسکی کے حوالے سے یہ تاریخیں دیتے ہیں۔ آتش کدہ قلمی ۵۵۶ھ اور طبع بمبئی ۵۹۵ھ تقویم التواریخ حاجی خلیفہ ۵۴۷ھ ، مرات الخیال شیر خاں لودھی ۵۴۹ھ ، ہفت اقلیم ۵۸۰ھ ، مجمل فصیحی ۵۸۵ھ ، خلاصۃ الاشعار تقی کاشی ۵۸۰ھ اور مرات العالم ۵۹۲ھ ۔

دولت شاہ نے جو تاریخ دی ہے ہر صورت میں غلط ہے چونکہ طوفان باد کے سلسلہ میں انوری کا نام بھی لیا جاتا ہے اور طوفان کی تاریخ ۵۸۲ھ ہے اس لئے انوری کی وفات اس سن کے بعد کسی وقت ماننا ہوگی۔

حمد اللہ مستوفی نزہت القلوب میں انوری کا مزار سرخاب، تبریز میں جہاں خاقانی اور ظہیر فاریابی وغیرہم دفن ہیں بتاتا ہے اور یہ کیسی قدر حیرت خیز ضرور ہے اس لئے کہ شاعر کا اکثر حصۂ عمر بلخ میں بسر ہوا ہے۔ اور آخر عمر میں تبریز جا کر کیا کرتا۔

قولہ " انوری کا اصلی مایۂ فخر ہجو ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر ہجو گوئی کوئی شریعت ہوتی تو انوری اس کا پیغمبر ہوتا، ہجو میں اس نے نہایت اچھوتے، نادر، باریک اور لطیف مضامین پیدا کئے ہیں، ان ہجووں میں قوت تخیل جو شاعری کی سب سے ضروری شرط ہے صاف نظر آتی ہے، لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ اس صنف میں اس کا

جو کلام زیادہ نادر ہے، اسی قدر زیادہ فحش ہے، سیکڑوں اشعار ہیں لیکن (دو ایک کے سوا) ایک بھی درج کے قابل نہیں، کسی کو ایسا ہی شوق ہو تو آتش کدۂ آذر موجود ہے ہم اپنے دست و قلم کو اس سے آلودہ نہیں کر سکتے، ایک آدھ ہجو فحش سے خالی بھی ہے، وہ حاضر ہے۔

پہلے ایک شخص کی مدح لکھی پھر صلے کا تقاضا کیا، اس کے بعد ہجو کی دھمکی دی، دیکھو کس لطیف طریقے سے ادا کیا ہے۔

سہ بیت رسم بود شاعرانِ طامع را — یکے مدیح و دگر قطعۂ تقاضائی

اگر بداد سوم شکر، ورنہ داد ہجا — ازیں سہ بیت دو گفتم دگر چہ فرمائی "

شعر العجم ص ۲۸۳

انوری کی شاعری کے کئی پہلو ہیں مثلاً اوصاف نگاری یا مدّاحی، اخلاقیات و پند و حکم اور مہاجات اپنے ہم وطنوں میں انوری اپنے کمال قصیدہ نگاری کی بنا پر فردوسی اور سعدی جیسے شہسواران فن کا ہمعناں مانا گیا ہے۔ مولانا شبلی برخلاف مذہب جمہور اس کو ہجو گوئی کی نبوت کا منصب عطا فرماتے ہیں اور اس کے حقیقی کمال کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے نہ انھوں نے قصیدہ گوئی کی اہم دقائق، مشکلات اور اس کی پیچیدگیوں کی داد دی ہے۔

مولانا نے انوری کا کلیات بچشم خود نہیں دیکھا ہے۔ محض اُس انتخاب کی بنا پر جو صاحب آتش کدہ نے انوری کے کلام کا دیا ہے یہ حکم صادر فرمایا ہے کہ انوری کا کلام جس قدر نادر ہے اسی قدر زیادہ فحش ہے سیکڑوں اشعار ہیں لیکن ایک بھی درج کے قابل نہیں۔ اب اگر صاحب آتش کدہ نے انوری کے کلام سے زیادہ تر ایسا نمونہ پیش کیا جو مولانا کے نزدیک مردود و مطرود ہے تو یہ صاحب آتش کدہ کی بد مذاقی کا قصور ہے جس نے زیادہ تر ایسا کلام پسند کیا یا خود مولانا شبلی کا جنھوں نے محض آذر کے انتخاب کی بنا پر ایک غیر موجّہ اور عاجلانہ فیصلہ دے دیا جو حقیقت اور واقعیت سے کوسوں دُور ہے۔ ہمیں انوری کا کلام خود دیکھنا چاہیئے وہ ابھی تک بازار میں دستیاب ہوتا ہے۔

کلیات میں ہر قسم کا ذخیرہ موجود ہے جس سے ہر مذاق کا شخص اپنے اپنے مطلب کے پھول چن سکتا ہے اس چمنستان میں جہاں ہجو اور فحش کے خار ہیں وہاں متین اور سنجیدہ کلام کے گل و ریاحین کثرت کے ساتھ نظر افروز ہیں البتہ کانٹوں کی اس قدر بہتات نہیں ہے جس کے مولانا شبلی مدعی ہیں اور یہ خیال تو قطعی غلط ہے کہ اس کا کلام جس قدر زیادہ نادر ہے اسی قدر زیادہ فحش ہے - انوری کی فحش گوئی صرف چند عریاں اور قابلِ اعتراض الفاظ کے استعمال پر منحصر ہے - دشنام دہی میں کسی لطافت خیال اور دقتِ نظر کی ضرورت نہیں ہوتی - اس لئے اس صنفِ سخن میں شاعر کی قوت تخیل کے کارناموں کی تلاش کرنا میرے خیال میں بے سود ہے -
انوری کی اوصاف نگاری سے قطع نظر کرنا اس کی فحش نگاری کی تعریف کرنا - اس کے اخلاقیات کو پس پشت ڈال دینا اور اس کی ہجویات کو اُچھالنا ایک ایسی عجیب تحسین ہے جو کسی کے وہم و گمان میں نہیں گزری ہوگی

بجوں غلطیدہ دست و تیغ غازی ماندہ تحسیں　　　تو اول زیب اسپ و زینتِ برگستواں بینی

ہجو کی مثال میں جو قطعہ مولانا شبلی نے نقل کیا ہے اور جس کو میں اوپر درج کر آیا ہوں ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کو ہجو سے کس قدر حقیقی بُعد ہے اس اچھے خاصے قطعہ پر یہ کلنگ کا ٹیکا ناحق لگایا گیا ہے - اگر اس قسم کی لطیفہ سنجی ہجو میں داخل کر لی گئی تو میرے خیال میں مولانا کی ثقاہت کے اعلیٰ معیار تک کوئی مشرقی اور مغربی شاعر نہیں پہنچ سکتا اور ظرافت و خوش طبعی کا وجود جس کے ایرانی شعرا بالعموم شیدائی نظر آتے ہیں شجر ممنوعہ قرار پاتا ہے -

ذیل میں اسی ذخیرہ سے جس کو مولانا شبلی رد کر چکے ہیں ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے چند مثالیں جو مذاقِ حال کی رو سے قابل اعتراض نہیں پیش کی جاتی ہیں -

جن ایام میں انوری سرخس میں مقیم تھا وہاں ابو علی آبی نام کا ایک عہدہ دار رہا کرتا تھا بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر شاعر اس سے ناراض ہو گیا - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابو علی آبی کی ناک اس کے منہ پر بلحاظ تناسب کثیر الحجم واقع ہوئی تھی اور تمام چہرہ پر چھا گئی تھی - انوری اس شاندار ناک کی تعریف میں اپنے خیالات ذیل کی رباعی میں دیتا ہے رباعی

شخصے بینی شش جہتش زو بینی　　　با بو علی آبی ار بہم بہ نشینی

گردیده بدین رخش چارکتی — چنداں کہ ازو بینی بینی بینی

ایک مرتبہ سرخس میں امساک باراں ہوگیا اور بارش دیر میں ہوئی۔ انوری نے آبی اور بے آبی کے انضمام سے یہ لطیفہ حاصل کیا ؎

سرخس از رنج بے آبی و آبی — دریغا روئے دارد در خرابی

زبے آبی خلاصی یافت امسال — خداوندا خلاصش دہ ز آبی

یعنی سرخس بے آبی اور آبی کے ہاتھوں برباد ہو رہا تھا۔ اس سال بے آبی سے اس کو نجات مل گئی الٰہی اس کو آبی سے بھی پاک کر

خواجہ ابوالفتح کے بخل کی تشہیر ؎

خواجہ بوالفتح از کمال حرص و بخل — سیم حاصل می کند بے فائدہ

وزپئے نانے ہمی گوید زنش — ربنا انزل علینا مائدہ ص۵۸

ممدوح کو جس سے صلہ حاصل کرنے میں شاعر مایوس ہو چکا ہے یوں خطاب کرتا ہے۔

خداوندا ہمی دانم کہ چیزے نیست در دستت — گرم چیزے ندادستی بدیں تقصیر معذوری

ولیکن گر کسے پرسد چہ دادستت روا داری — کہ گویم عشوہ اول روز و آخر روز دستوری ص۵۵

اگر آپ نے مجھے کچھ عطا نہ کیا تو معذور ہیں اس لئے کہ آپ کے پاس دینے کو کچھ نہیں لیکن جب لوگ مجھ سے پوچھیں کیا دیا! تو کہئے کیا کہوں؟ کیا یہی کہ صبح کو فریب دیا اور شام کو رخصت دی۔

نجیب مشرف اور فرید عارض؛

چہ خیر باشد در لشکرے کہ نیز درو — نجیب مشرف و عارض فرید لنگ بود

شکست پاے یکے، زود یاکہ دیر رسد — خبر، کہ دست دگر نیز زیر سنگ بود ص۶۲۵

ایک قرآن خواں قاری کی قرأت انوری کے لئے ناخوشنودی کا اسباب پیدا کرتی ہے اور شاعر اپنی ناراضی کا اظہار ذیل کے ابیات میں کرتا ہے ؎

دوشش در خواب من پیمبر را — دیدمش کز امت آزردہ است

گفتمش اے بزنگ چیت بودہ است — طبع پاک تو از چہ پژمردہ است
گفت زیں مقریک ہمی جوشم — رونقِ دینِ ایزدی بردہ است
آنچہ ایں زن بمزد می خواند — جبرئیل آں بمن نیاوردہ است صـ ۶۱۲

کسی وزیر کو جس سے انعام کی امید میں شاعر یاس سے ہمدوش ہے یہ مشورہ دیا جاتا ہے۔

تو وزیری و منت مدحت گوے — دستِ من بے عطا روا مینی
شو وزارت بمن سپار و مرا — مدحتے گوئے تا عطا بینی صـ ۷۴۹

تم وزیر ہو اور میں تمھارا مدّاح۔ سخت افسوس ہے پھر بھی خالی ہاتھ رہوں۔ اس صورت میں تجویز کرتا ہوا وزارت تم میرے حوالہ کردو اور شاعری میں تمھارے سپرد کردوں پھر تم قصیدے کہنا اور میں انعام دونگا۔

تاج الدین عمزاد جب زیارت بیت اللہ سے واپس آتا ہے انوری اس کے خیر مقدم میں کہتا ہے

عمزاد زحج باز رسید است بتوئی — با توبۂ طاعت وابنان کرامت

انوری کے ہاں ہجو بحیثیت مجموعی اگر دیکھا جائے تو دس بارہ آدمیوں سے زیادہ کی نہیں ملے گی ان میں چار اشخاص ایسے ہیں کہ متعدد موقعوں پر کلیات میں ان کی مذمت ملتی ہے۔ ان بدنصیبوں میں ایک قاضی طوس ہیں، نمبر دوم سدید الدین بیہقی، نمبر سوم تاج الدین عمزاد اور نمبر چہارم کافی ہروی ہیں۔ شاعر کہتا ہے۔

چار کس یابی کہ در ہجو من اند — گر بجوئی از ثریا تا ثری
قاضی طوس و سدید بیہقی — تاجک عمزاد و کافی ہری

صـ ۷۵۳

قولہ " انوری کے دیوان میں چند ہجویں انوری کے بیوی اور بیٹے کی بھی پائی جاتی ہیں عام لوگوں کا خیال ہے کہ انوری کو ہجو کا ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ بیوی اور بیٹے کو بھی نہ چھوڑ سکا لیکن اور شعرا نے یہ ہجویں لکھکر اس کے دیوان میں داخل کردی ہیں اور چونکہ پبلک اس کی دشمن تھی وہ اسی طرح قائم رہ گیئں "

شعر العجم صـ ۲۸۵

میں نہیں سمجھا کہ یہ عام لوگ کون ہیں اگر تذکرہ نگار ہیں تو باوجود متعدد تذکرے دیکھنے کے مجکو اس قسم کا کوئی چرچا نظر نہیں آیا۔ بعض اشعار سے پایا جاتا ہے کہ انوری نے شادی ہی نہیں کی تھی۔

انوری زن ازاں سبب نہ کند　　که مبادا زنش پسر زاید

کسی دوست کو جس نے شادی کے باب میں مشورہ دیا ہے جواب دیتا ہے

بخدے کہ بے ارادتِ او　　خلق را رنج و شادمانی نیست
کاندریں روزگار زن کردن　　بجز از محض قلتبانی نیست

خطباتِ دتاسی

(مترجمہ جناب نواب مسعود جنگ بہادر ، ناظم تعلیمات ، حیدرآباد دکن)

خطبۂ پنجم

(بتاریخ ۴ر دسمبر ۱۸۵۴ء)

سنسکرت جو قدیم آریاؤں کی زبان تھی ، ہندوستان یعنی سرزمینِ ہفت دریا یا سپتا[1] سِندھو کی (جو ویدوں کا نام ہے) عام زبان کبھی نہ ہونے پائی - ڈراموں (ناٹکوں) میں خاص خاص اشخاص سنسکرت بولتے ہیں - لیکن عورتوں اور عوام کی زبان معمولی بولی ہے جسے پراکرت کہتے ہیں - پراکرت کے معنی ناتراشیدہ بولی کے ہیں - اور سنسکرت کی ضد ہے جس کے معنی شائستہ[2] زبان ہیں - پراکرت جو دلی میں ہمیشہ بولی جاتی تھی جیسا کہ خود اہل[3] ہند کا بیان ہے اور جو بھاشا یا بھاکا " یعنی معمولی بولی" کے نام سے موسوم تھی، آخر سنسکرت پر غالب آگئی اور اُسے " ہندوستان کی زبان" (ہندی) کا نام دیا گیا جو سنسکرت کو کبھی نہیں ملا تھا۔

آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز سے مسلمان ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے آنے شروع ہوئے سب سے بڑھ کر محمود غزنوی نے اس ملک میں ۱۰۰۰ء کے قریب شاندار کامیابیاں حاصل کیں، اور اس وقت سے شہروں میں ہندوستانی بھاکا کے صورت میں تغیر تبدل پیدا ہوا - چودھویں صدی میں تیمورلنگ

---

[1] یعنی پانچ دریا پنجاب کے اور ان کے علاوہ سندھ اور سرسوتی -

[2] اِن ناٹکوں سے قبل بدھ لوگوں کی کتابوں اور اشوک کے کتبوں کی زبان ایک قسم کی پراکرت ہے جو اس وقت عام طور پر بولی جاتی تھی -

[3] ملاحظہ ہو اصل دیباچہ باغ وبہار اور دیباچۂ آثارالصنادید جن کا اقتباس آگے دیا گیا ہے -

ہندوستان میں آیا۔ اور دہلی پر قبضہ کرکے اس نے ایک زبردست سلطنت کی بنیاد ڈالی جسے بابر نے ۱۵۲۶ء
میں مستحکم طور سے قائم کیا۔ اس وقت ہندوستانی زبان (ہندی) فارسی زبان سے متاثر ہوئی اور فارسی الفاظ
اس میں بکثرت داخل ہوگئے۔ خود فارسی زبان میں بوجہ اسلامی فتح اور مذہب کے بیشمار عربی الفاظ آگئے
تھے۔ اور اس عجیب اختلاط سے موجودہ ہندوستانی سامی اور حامی امواج کی سنگم بن گئی جو لسانی ترکیب
کے لحاظ سے نہایت عجیب وغریب ہے۔ اسی طور سے ہندوستانی اسلامی زبان کی دو قسمیں ہوگئیں۔ ایک
تو شمال کی زبان جو اردو کے نام سے موسوم ہوئی۔ کیونکہ اُس نے اردوئے معلیٰ (شاہی چھاونی) میں جنم
لیا تھا۔ دوسرے وسط اور دکن کی جو دکنی کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس طرح دو ہندوستانی بولیاں
پیدا ہوئیں جو اگرچہ ایک دوسری سے مختلف تھیں تاہم ان میں بہت مشابہت تھی۔

ہندوستان کی یہ زبان جسے خاص طور پر ہندوستان کی زبان کہا جاتا ہے۔ ہندی اور اُردو بولیوں میں
تقسیم ہوگئی جس کی بنا مذہب پر ہے۔ کیونکہ عام طور پر یوں ہی کہا جاتا ہے کہ ہندی ہندوؤں کی زبان ہے اور اُردو
مسلمانوں کی۔ یہ واقعہ اس قدر صحیح اور سچّا ہے کہ جن ہندوؤں نے اُردو میں انشا پردازی کی ہے انھوں نے
نہ صرف مسلمانوں کی طرز تحریر کی نقل کی ہے بلکہ اسلامی خیالات کو بھی یہاں تک جذب کیا ہے کہ اُن کے
اشعار پڑھتے وقت بمشکل اس امر کا یقین ہوتا ہے کہ یہ کسی ہندو کے لکھے ہوئے ہیں۔

عام طور پر ہندی شاعری میں بہ نسبت اُردو یا دکھنی شاعری کے زیادہ قوت اور زور پایا جاتا
ہے یہ عربی کی قدیم شاعری سے ملتی جلتی ہے جو انھیں صفات سے ممتاز ہے۔

مدّتِ دراز تک ہندوستان میں اہل اسلام فارسی میں تصنیف وتالیف کرتے رہے۔ البتہ مشہور
ومقبول گیت معمولی بولیوں میں بولے اور لکھے جاتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ عمدہ عمدہ کتابیں بھی ہندوستانی
بولیوں میں لکھی جانے لگیں جن کی وجہ سے بقول ولسن کے جو ہندوستانی السنہ علوم کے بڑے عالم ہیں۔
ان بولیوں میں خاصا علم ادب پیدا ہوگیا جو بہت دلچسپ ہے۔

اُردو کی بحث پر ہمارے ہم عصر سید احمد نے اپنی کتاب آثار الصنادید میں یہ لکھا ہے۔

"ہندوؤں کے راج میں تو یہاں ہندی بھاشا بولنے چالنے لکھنے پڑھنے میں آتی تھی۔ ۵۸۷ھ ہجری مطابق ۱۱۹۱ء موافق سمت ۱۲۴۸ بکرماجیت کے جب مسلمانوں کی سلطنت نے یہاں قیام پکڑا تو بادشاہی دفتر فارسی ہوگیا مگر زبان رعایا کی وہی بھاشا رہی۔ ۸۹۴ھ ہجری مطابق ۱۴۸۸ء تک بجز شاہی دفتر کے رعایا میں فارسی کا رواج نہیں ہوا۔ اس کے چند روز بعد سلطان سکندر لودھی کے عہد میں سب سے پہلے ہندوؤں میں سے کائستوں نے جو ہمیشہ سے امورات ملکی اور ترتیب دفتر میں مداخلت رکھتے تھے فارسی لکھنا پڑھنا شروع کیا پھر رفتہ رفتہ اور قوموں نے بھی شروع کیا اور فارسی لکھنے پڑھنے کا ہندوؤں میں رواج ہوگیا۔

اگرچہ بابر اور جہانگیر کے عہد تک ہندی بھاشا میں کچھ تغیر و تبدل نہیں ہوا تھا، مسلمان اپنی گفتگو فارسی زبان میں اور ہندو اپنی گفتگو بھاشا میں کیا کرتے تھے۔ پھر جب امیر خسرو نے خلجی بادشاہوں ہی کے زمانہ سے یعنی حضرت مسیح سے تیرہویں صدی میں فارسی زبان میں بھاشا کے لفظ ملانے شروع کئے تھے۔ اور کچھ پہیلیاں اور مکریاں اور نسبتیں ایسی زبان میں کہیں تھیں جس میں اکثر الفاظ بھاشا کے تھے۔ غالب ہے کہ رفتہ رفتہ بھاشا میں جب ہی سے ملاپ شروع ہوا ہو مگر ایسا نہ تھا جس کو جدا زبان کہا جائے۔ جب کہ شاہجہاں بادشاہ نے ۱۰۵۸ھ ہجری مطابق ۱۶۴۸ء عیسوی کے شہر شاہجہاں آباد آباد کیا اور ہر ملک کے لوگوں کا مجمع ہوا، اُس زمانے میں فارسی زبان اور ہندی بھاشا بہت مل گئی۔ اور بعضے فارسی لفظوں اور اکثر بھاشا کے لفظوں میں بہ سبب کثرت استعمال کے تغیر و تبدل ہو گیا۔ غرضکہ لشکر بادشاہی اور اُردوئے معلی میں ان دونوں زبانوں کی ترکیب سے نئی زبان پیدا ہوگئی۔ اور اسی سبب سے زبان کا اردو نام ہوا، پھر کثرتِ استعمال سے لفظ زبان کا محذوف ہوکر اس زبان کو اُردو کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ اس زبان کی تہذیب اور آراستگی ہوگئی یہاں تک کہ تخمیناً سنہ ۱۱۰۰ھ ہجری مطابق ۱۶۸۸ء عیسوی کے یعنی اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں شعر کہنا شروع ہوا۔

اگرچہ مشہور ہے کہ سب سے پہلے اس زبان میں ولی نے شعر کہا، مگر خود ولی کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس سے پہلے بھی کسی نے اس زبان میں شعر کہا ہے کیوں کہ اس کے شعروں میں اور شاعروں کی زبان پر طنز نکلتی ہے۔ مگر اُس زمانے کے شعر بہت پھیکے اور نہایت سست بندش کے تھے۔ پھر دن بدن

اس کو ترقی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ میر اور سودا نے اُس کو کمال پر پہنچا دیا۔

آخر میں جس زمانہ کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اُس سے قبل حاتم اپنے "دیوان زادہ" کے دیباچہ میں لکھتا ہے (یہ تحریر ۱۷۵۵ء کی ہے)۔

میں نے تحریر کے لئے وہ زبان اختیار کی ہے جو ہندوستان کے تمام صوبوں کی زبان ہے یعنی ہندوی، جسے بھاکا کہتے ہیں، کیونکہ اسے عام لوگ بھی بخوبی سمجھتے ہیں اور بڑے طبقے کے لوگ بھی پسند کرتے تھے"۔

درحقیقت جو کچھ سید احمد نے لکھا ہے وہ سب کا سب بالکل صحیح نہیں ہے۔ اہل مشرق میں یہ خوبی شاذ و نادر پائی جاتی ہے۔ ان میں تخیل اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ وہ کسی مسئلہ کے ہر پہلو کی تحقیق نہیں کر سکتے۔ سب سے پہلے سید احمد نے یہ کہا ہے کہ مسلمانوں کی فتح کے بعد سے یعنی ۱۱۹۱ء سے ۱۶۴۸ء تک ہندوستانیوں کی زبان میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ اس کے برخلاف میر امّن[1] یہ کہتے ہیں۔

"جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئی۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف سوال و جواب کرتے ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی"۔

اس پر کچھ اور بھی اضافہ کرنا پڑے گا۔ گیارہویں صدی کے آخر سے قبل شاید ۱۰۸۰ء میں مسعود بن سلمان نے ریختی میں دیوان مرتب کیا۔ ریختہ سے مطلب وہی ہے جو سید احمد نے بیان کیا ہے یعنی ہندی جس میں فارسی الفاظ کی آمیزش ہو۔ بالفاظ دیگر اردو۔ علاوہ اس کے بہت سے ہندوستانی تذکرہ نویسوں نے ریختی کے بعض اشعار سعدی سے بھی منسوب کئے ہیں جو دکن میں ۱۲۵۰ اور ۱۲۸۰ء کے درمیان لکھے گئے ہوں گے[2]

---

[1] ملاحظہ ہو باغ و بہار کا دیباچہ [2] ہندوستانی تذکروں میں یہ لکھا ہے کہ سعدی ۱۰۳ سال زندہ رہا (سنہ تولد ۱۱۹۳ء اور سنہ وفات ۱۲۹۶ء) تیس سال تعلیم میں بسر کئے، تیس سال سفر میں اور تیس سال عزلت، تعلیم کے تیس سال میں بچپن کے تیرہ سال جمع کئے جاویں تو ۴۳ سال ہوتے ہیں اس حساب سے ۱۲۳۶ء اور ۱۲۶۶ء کے درمیان جب وہ سفر کر رہے تھے اس وقت انھوں نے ریختے کے وہ اشعار لکھے ہوں گے جو اُن کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔

کمال اپنے دیوان میں سعدی کو موجدِ زبانِ ریختہ کہتا ہے لیکن اس کے بیان کی صحت کے لئے چاہئے کہ "وسط ہند یا دکن میں" کیونکہ سو برس پہلے مسعود ریختی میں نظم لکھ چکا ہے بہرحال یہ اُس کے بعد کی بات ہے کہ خسرو اور نوری نے نظمیں لکھیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد پھر وسط ہند میں خاصی بولی جس کا نام دکنی ہے، ریختی میں نظم لکھی گئی اور اس کا اثر شمال کے شاعروں پر بھی ہوا جو اس وقت تک عموماً فارسی میں لکھتے تھے اور وہ بھی معمولی زبان میں نظمیں لکھنے لگے۔ سولھویں صدی میں ہم کئی مشہور دکنی شعراء کا نام دیکھتے ہیں۔ مثلاً شاہانِ گولکنڈہ، قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، ابوالحسن جس کا تخلص تانا ہے۔ اِن کے علاوہ افضل، دلی، نوزی، غواصی، رسمی وغیرہ ہیں۔ حالانکہ شمال میں ہم اٹھارہویں صدی میں بھی بمشکل کسی مشہور ریختہ گو کا نام پاتے ہیں۔ غالباً حاتم جو سترہویں صدی کے آخر میں ہوا ہے، دلی کا پہلا شاعر ہے۔ اُس نے حقیقی اُردو میں شاعری کی ہے اور اس نے اعتراف کیا ہے کہ دہلی میں ولی کے دیوان کے پہنچنے کے بعد اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ اُسے اِس زبان میں لکھنا چاہئے اور دوسرے شاعروں نے اس کی تقلید کی۔

مشہور گلکرسٹ نے جو انگریزوں میں ہندوستانی کے مطالعہ کا بانی ہوا ہے، ۱۸۲۸ء میں ایک دیسی تذکرہ کا ذکر اپنی صرف و نحو میں کیا ہے اور اُس وقت سے مجھے اس زبان کی ادبی تاریخ کا شوق پیدا ہوا۔ میں نے تحقیق و جستجو کے بعد سات دیسی تذکرے بہم پہنچائے اور باوجود ناکافی سامان کے میں نے ۱۸۳۹ء میں ہندوی اور ہندوستانی ادب کی تاریخ شایع کی۔ یہ تالیف اگرچہ بہت ناقص ہے۔ تاہم پہلی کتاب ہے جو اس مضمون پر لکھی گئی ہے اور اس قابل سمجھی گئی کہ ہندوستانی میں بھی اس کا ترجمہ کیا گیا۔ اور اُس نے انگریز متشرقین میں بھی شوق پیدا کر دیا۔ میری اور اُن کی مشترکانہ تحقیق نے اور بہت سے تذکروں کا پتہ لگایا جن سے میں ابھی پوری طرح کام نہیں لے سکا اس لئے کہ بعض اُن میں سے اب تک مجھے نہیں ملے بعض ایسے ہیں کہ جن کا ذکر دیسی تذکرہ نویسوں نے اپنے تذکروں میں کیا ہے اور بہت سے ایسے ہیں کہ جن کا ابھی تک علم بھی نہیں ہے۔

یہ امر آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ اس تاریخ کے نئے اڈیشن کے لئے کس قدر نئے سامان کی ضرورت

ہے لیکن میں مختصر طور سے یہ بیان کروں گا کہ اہلِ ہند کے اِن تذکروں سے ہم شعرا کے حالات اور تصانیف کے متعلق کس قسم کا مواد جمع کر سکتے ہیں۔

ایرانی۔ اور (اُن کی تقلید میں) ہندوستانی مسلمان تذکرہ نویسی اور خاصکر ہم عصروں کے حالات لکھنے کے بہت شایق ہیں۔ ان میں کسر اتنی ہے جو ہم میں بھی پائی جاتی ہے کہ تاریخ وفات کا ذکر نہیں ہوتا۔ یہ تذکرے کسی تجارتی خیال سے نہیں لکھے جاتے بلکہ ادب کی اہم شاخ ہیں۔ اُن میں مولفین کو اپنی فصاحت و بلاغت دکھلانے کا خوب موقع ملتا ہے اور مشہور شعرا اور دوستوں کی تعریف بڑے مبالغہ سے کرتے ہیں اور انتخاب کلام سے اپنے ذوق کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ حالات جو تذکرے کہلاتے ہیں ایک قسم کے انتخابات ہیں۔ جن میں مصنفین کے حالات مبالغہ آمیز تعریف کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات یہ حالات کئی کئی صفحوں کے ہوتے ہیں جو شاندار الفاظ اور پیچیدہ ترکیبوں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے اور اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ صرف مصنف کا نام لکھ دیا جاتا ہے پہلی قسم کے حالات میں تعریف کے بعد دس بیس یا تیس صفحوں میں کلام کا انتخاب ہوتا ہے اور دوسرے قسم کے حالات میں دو تین شعر اور بعض اوقات صرف ایک ہی شعر ہوتا ہے۔ یہ تذکرے ایک طرح سے اپنی روشناسی کا ذریعہ بھی ہوتے ہیں کیوں کہ مُولفِ تذکرہ مصنفین کے حالات میں موقع بے موقع اپنا نام بھی داخل کر دیتا ہے اور اکثر مہربانی سے اپنا ذکر بھی کر جاتا ہے۔ وہ اپنے حقیقی حالات اس طرح لکھ جاتے ہیں جو انھیں دوسروں کے لکھنے چاہئیں تھے اور اُس کے ساتھ ہی کثرت سے اپنے اشعار بھی نقل کر دیتے ہیں۔ یورپ میں عام دستور یہ ہے کہ کم و بیش مشہور اشخاص کے حالات لکھتے وقت نہایت احتیاط کے ساتھ ایسی تفصیلات کا ذکر کرتے ہیں جن سے کسی کو دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف ہندوستانی تذکروں میں اس قسم کے تمام تفصیلی حالات ترک کر دئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی بات ٹھیک ٹھیک بیان نہیں کی جاتی۔ ان تذکروں میں قدیم شعرا وہ ہیں جو مُولف کے زمانے سے پہلے گزرے ہیں اور ہم عصر شعرا جدید شاعر خیال کئے جاتے ہیں۔ ان میں تاریخ و سنہ اور خاصکر سنہ پیدائش خال خال کہیں کہیں آجاتا ہے اہلِ مشرق میں اس کا بہت کم رواج ہے اور عموماً وہ اپنی عمر تک نہیں جانتے۔ اس لئے مجبوراً طرزِ تحریر اور

دوسرے قرائن سے یہ قیاس کرنا پڑتا ہے کہ یہ کس صدی کا شاعر ہے۔ اور اکثر کاتبوں کے تصرّف اور تغیّر و تبدل سے اس کا پتہ لگانا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔

بہر حال مولفین تذکرہ اکثر غیر معروف شعراء اور بعض اوقات نامعلوم حضرات کے ناموں سے اپنی کتابوں کا حجم بڑھا دیتے ہیں، جس طرح ہمارے سیرت نویس اپنی کتاب کی جلدیں بڑھانے کے لئے غیر معلوم اشخاص کا نام کھود کھود کر نکالتے ہیں۔

اسی طرح یہ تذکرے تنقید کا عمدہ نمونہ نہیں ہیں۔ اتفاق سے جب کبھی دو یا کئی شاعروں کا نام ایک ہی ہوتا ہے تو بڑی پریشانی ہوتی ہے اور تفصیل نہ ہونے کی وجہ سے بڑی مشکل پڑ جاتی ہے۔ غرض یہ کہ تذکرہ ایک خاص قسم کی تصنیف ہے جو دلچسپی اور خوبی سے خالی نہیں، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بہت سے مصنفین نے اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ ضمناً ان تذکروں سے ہمیں مشاعروں کے متعلق بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مشاعرے ایک قسم کی مجلسیں ہیں جو اُردو شاعری کی حصول و ترقی کی غرض سے قائم کی جاتی ہیں۔ اور وہاں شعرا ایک دوسرے کے مقابلہ میں فی البدیہ یا ہم طرح اشعار کہتے ہیں۔ اُن مشاعروں میں جو شہر کے ممتاز باشندوں کے ہاں منعقد ہوتے ہیں، پندرہ سے بیس تک اعلیٰ درجہ کے شاعر ہوتے ہیں۔ اور یہ لوگ عموماً شرفائے ملک میں سے ہوتے ہیں۔ مولوی کریم الدین نے جن کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا، حال میں دہلی کے ایک خاص رسالہ میں جس کا نام گلِ رعنا ہے ان نظموں کو شایع کیا ہے، جو اِن مشاعروں میں کہی گئیں یا پڑھی گئی تھیں، اِن کے علاوہ ایسی مجلسیں بھی ہوتی ہیں جہاں قصّہ خواں اپنے قصّے سُنا کر حاضرین کو لطف اندوز کرتے ہیں۔ چند سال ہوئے دہلی میں ایک قصّہ خواں مرزا حسن نامی تھا جس سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ وہ ان قومی قصوں کو لکھ ڈالے جنھیں وہ بڑی خوبی سے بیان کیا کرتا ہے۔

عموماً یہ تذکرے شعرا کے تخلصوں کی ابجدی ترتیب کے لحاظ سے مرتب ہوتے ہیں۔ پہلے تخلص ہوتا ہے اس کے بعد نام۔ اس کے سوا شاذ و نادر ہی کوئی دوسری ترتیب ہوتی ہے۔

ان ہندوستانی تذکروں میں بہت سے فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ کیونکہ زمانۂ حال تک اس قسم کی چیزیں ہندوستانی

مسلمانوں کی علمی زبان ہی میں لکھی جاتی تھیں، جیساکہ ایک زمانے میں ہمارے ہاں رومن یالاطینی زبان میں لکھنے کا دستور تھا مثلاً ڈوبائے نے فرانسیسی صرف ونحو اور پٹرارک نے اپنی قابلِ تعریف اطالوی نظموں پر لاطینی میں حواشی لکھے۔

میں نے ہندوستانی تذکروں کی سیرت نویسی اور اُن کے عیب وصواب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا ٹھیک ٹھیک نمونہ میں ایک ہندوستانی تذکرے سے نقل کرتا ہوں، میں نے دو مثالیں منتخب کی ہیں، ان میں سے ایک مختصر اور دوسری طویل ہے۔ تذکرہ کا مصنف مرزا علی خاں لطف ہے اور تذکرہ کا نام گلشنِ ہند ہے۔

میں پہلے مختصر مثال کو نقل کرتا ہوں جس میں باوجود نہایت اختصار کے وہ حاتم کو جیساکہ میں اوپر لکھ چکا ہوں، ایک مشہور شاعر بیان کرتا ہے۔ اس کے حالات دوسرے تذکرہ نویسوں نے زیادہ تفصیل سے لکھے ہیں۔

"حاتم تخلص، شاہجہاں آبادی، مشہور ریختہ گویوں میں سے دلّی کے تھے۔ ہم عصر شاہ نجم الدین آبرو اور میرزا رفیع سودا کا، شاعر خوش بیان تھا، صاحبِ دو دیوان تھا۔ ایک دیوان میں نہایت خرچ ابہام کیا ہے، اور دوسرا بطور متاخرین کے سرانجام کیا ہے۔ جامع ہے طور متاخرین اور طرز ابہام کا" اس کے بعد حاتم کے کلام سے ۲۰ شعر نقل کئے ہیں جو میں نے بطور نمونہ دوسری جگہ درج کئے ہیں۔

دوسری مثال میں ایک بادشاہ شاعر یعنی ابوالحسن بادشاہ گولکنڈہ کی پیش کرتا ہوں۔ جو ۱۰۸۳ھ (۱۶۷۲ - ۷۳ء) میں تخت پر بیٹھا اور جب اورنگ زیب نے ۱۶۹۰ء میں گولکنڈہ فتح کیا تو اُسے قید کر دیا اور وہ قید ہی میں ۱۷۰۴ء میں انتقال کر گیا۔ یہ اپنے پیش رو عبداللہ قطب شاہ کی طرح ہندوستانی زبان کا شاعر تھا، تانا یا تانا شاہ تخلص کرتا تھا اور ہندوستانی شاعر کا قدردان اور سرپرست تھا۔ چنانچہ اس کے عہدہ داروں میں سے ایک شخص مرزا (ابوالقاسم) کا ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ دکن میں اپنے زمانہ کا نہایت مشہور شاعر تھا۔

"نام نامی اور اسم گرامی اس بادشاہِ عشرت دوست کا ابوالحسن تاناشاہ ہے۔ سلاطین نامدار

اور خوانینِ عالی مقدار دکھن سے تھا۔ اگرچہ شہرہ عیش و نشاط کا اور آوازہ مسرّت اور انبساط کا اس عیش مجسم کے ماہ سے ماہی تک مشہور ہے لیکن کچھ تھوڑا سا احوال اس سریر آرا ے بارگاہِ عیش و کامرانی کا یہاں لکھنا ضرور ہے۔

جن ایّام میں کہ عالمگیر خلد مکان نے عادل شاہی اور نظام شاہیوں کو زیر و زبر کیا، اور صوبہ دکن کو بعد بہت سی خرابی کے لیا، تو ابوالحسن تانا شاہ بھی نظر بندی میں آئے، اور فلک نیرنگ باز نے بدلے اِس عیش و عشرت کے اور ہی رنگ دکھائے۔ سامان عیش سب برہم ہوا، اور مجمع اربابِ نشاط حلقۂ ماتم ہوا۔ خلد مکان نے جس قدر تنگی اُن کے اوقات میں چاہی، انھوں نے قبول کیا۔ لیکن حقّے کے مقدمے میں بہت سماجت کے ساتھ اتنی بات کہلا بھیجی کہ اس کا شوق مجھے نہایت ہے، جو رعایت کہ اس کے سامان میں ہوگی وہ عین عنایت ہے۔

ازبسکہ یہ بادشاہ عشرت دوست آٹھ پہر نشۂ عیش میں مخمور رہتا تھا، حقہ ایک دم مُنہ سے نہیں چھٹتا تھا اور یہ بھی معمول تھا کہ بعد ہر چلم کے ایک شیشے سے گلاب کے حقہ تازہ ہووے، پھر ایک شیشے میں بید مشک کے حقہ بردار نیچے کو بھگووے۔ شغل میں عیش و نشاط کے ازبسکہ دن کو کم سوتے تھے سینکڑوں شیشے گلاب خالص اور عرق بید مشک کے دن رات میں خرچ ہوتے تھے۔ یہ سب احوال مفصّل خلد مکان کو معلوم تھا۔ علاوہ اس کے بادشاہ نے اس عجز سے کہلا بھیجا، بارہ سولہ شیشے گلاب کے اور آٹھ شیشے بید مشک کے حکم فرمائے۔ سُبحان اللہ! یا تو حقہ آٹھ پہر مُنہ سے نہیں چھٹتا تھا اور اُن کے دورِ محفل کے رشک سے دھواں حسد کا حقۂ سرِ آسماں میں گھٹتا تھا، یا پیچ سے فلکِ حقہ باز کے آٹھ چلمیں دن رات میں یہ پیتے تھے اور گھونٹ گھونٹ کر عجیب پیچ و تاب کے ساتھ جیتے تھے۔ اس میں بعد کئی دن کے حضرت خلد مکان نے فرمایا کہ سولہ شیشے گلاب اور بید مشک کے ہر روز حقے کے مصرف میں آنے اسراف ہے اور امورات شرعی میں پاسِ خاطر بیجا بیجا، اور تکلف رسمی معاف ہے۔ آٹھ شیشے ہر روز یہاں سے جایا کریں۔ ایک شیشے سے بعد ہر چلم کے حقہ تازہ کر کے آٹھ چلمیں دن رات میں پئیں۔ جب حضور سے آٹھ شیشے ہر روز آنے لگے تو یہ دن رات میں لاچار چار چلموں سے دل بہلانے لگے

یہ ماجرا سن کر خلد مکان نے ضد کے مارے چار شیشوں کی اور تخفیف کی۔ انھوں نے اپنے حقّہ بردار کو دو چلموں کی پروانگی دی۔ بعد کئی دن کے جب دو شیشے اور کم ہوئے تو ایک چلم دن رات میں یہ پیا کرتے تھے۔ جس دن ان دونوں شیشوں کا بھی آنا موقوف ہوا، اُس دن انھوں نے عرض کیا، جہاں پناہ کی دولت سے اتنا کچھ بعد خرچ کے جمع کیا ہے کہ دس چلمیں روز خرچ کے ساتھ سالہاسال پلا سکتا ہے۔ امید ہے کہ بھنڈی خانے کے خرچ کا غلام کو حکم ہووے کہ نہال نمک حلالی کا زمین میں سرخروئی کے بووے۔ ارشاد فرمایا کہ حضرت اعلیٰ کو امورات شرعی کا بہ شدّت دھیان ہے، اگرچہ مسجد کا کھود ڈالنا، خزانہ اُس کے نیچے گڑا سن کر نہایت آسان ہے۔ تو جو ہمارے مصرف بیجا کا کفیل ہوتا ہے، ابھی ایک دم میں جمع پونجی سر پر ہاتھ دھر کے روتا ہے۔ غرض اُس دن سے پھر حقّہ نہ پیا، جب تک کہ ان کی نظر بندی میں رہے اور اس سرائے فانی سے عالم باقی کو تشریف لے گئے۔ سبحان اللہ! چشم حقیقت بیں سے اگر کوئی دیکھے تو دنیا جائے حسرت ہے، بلکہ خانۂ زحمت۔

کدھر ہیں خسرو جم لطف، کیقباد کدھر کہاں سکندر و دارا، کہاں ہے کیکاؤس
جو مستِ جاہ ہیں دیکھیں وہ چشم عبرت سے کچھ اُن کے ساتھ گیا غیر حسرت و افسوس؟

اگرچہ ملک گیری اور کشور ستانی کے معاملے کو سمجھنا شاہان عالی تبار پر ختم ہوا ہے، گدائے گوشہ نشین کو دخل ان امورات میں کیا ہے۔ لیکن بعضے دانشمند کہتے ہیں کہ خلد مکان نے استیصال پادشاہان دکن کا جو اس محنت سے کیا اور مکہ مسجد کو کھُدوا کے وہ کچھ مظلمہ اپنی گردن پر لیا، خدا جانے اس حرکت کا کیا مفاد ہے۔ تحصیلِ حاصل سے بھی اس میں کچھ کیفیت زیادہ ہے۔ کس واسطے کہ پیش از تسخیر دکن کے بھی خراج و باج اس طرف سے چلا آتا تھا اور بادشاہان ہندوستان کا شہنشاہ کہاتا تھا مآل اس مشقت کا عجو بہ نظر آیا کہ اِس حُسنِ تردّد نے شاہنشاہ کو بادشاہ کر دکھادیا۔

واقف رموزِ ملک سے ہیں شاہ و شہریار ہے تو گدائے گوشہ نشین لطف کچھ نہ بول

غرض شاہ عالی جاہ ابوالحسن تاناشاہ کی طرف لوگ اس مطلع کو منسوب کرتے ہیں اور باعتبار محاورہ دکن کے اور بندش قدیم کے، کہ اس مطلع میں ہے، ابراہیم خاں مرحوم بھی گفتگو پر لوگوں کی

گوش دل کو دھرتے ہیں۔ مطلع یہ ہے۔

کس در کہوں، جاؤں کہاں مجھ دل پہ بھل بھراٹ ہے

اک بات کے ہوں گے سجن، یہاں جی ہی بارہ باٹ ہے"

اگرچہ دکن اور وسط ہند کی ہندوستانی شاخ میں شمالی ہند کی زبان یا اُردو کی نسبت بہت بڑی بڑی نظمیں موجود ہیں، تاہم اُردو زبان کو جس میں غزلوں، قصیدوں اور چھوٹی مثنویوں کے مجموعوں کو دیوان کے نام سے موسوم کرتے ہیں، زیادہ فوقیت حاصل ہے اس لئے کہ یہ زیادہ باقاعدہ لکھی جاتی ہے۔ تمام تذکروں میں جن کا میں نے ذکر کیا ہے، اُردو کے شاعروں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے اور دکنی شعرا کے متعلق سوائے سرسری ذکر کے کچھ زیادہ نہیں لکھا۔ چنانچہ میر نے اپنے تذکرے نکات الشعرا کے دیباچے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے میرے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں " اگرچہ ریختہ در دکن است، چوں ازانجا یک شاعر مربوط برنخواستہ لہذا شروع بنام آنہا نکردہ و طبع ناقص مصروف انہم نیست کہ احوال اکثر انہا ملال اندوز گردد۔ مگر بعضے ازانہا نوشتہ خواہد شد، انشاءاللہ تعالیٰ"۔

ہندی شعرا کے الگ تذکرے ہیں جنھیں کب مالا کہتے ہیں۔ مگر مجھے جو دستیاب ہوئے ہیں وہ بہت ہی کم ہیں۔

ہندوستانی مصنفین کے لکھے ہوئے تذکرے یا انتخابات سب ملا کر ۰ ۷ ایسے ہیں جن کا مجھے علم ہے۔ اِن تذکروں اور اُن کے مصنفین کا تفصیلی حال میری تاریخ ادب ہندوستانی میں درج ہے۔

۲۔ اُن شعرا کی تعداد جن کا ذکر تذکروں اور دوسری تصنیفات میں پایا جاتا ہے اور جن تک بلا واسطہ یا بالواسطہ میری دسترس ہوئی ہے، تخمیناً تین ہزار ہے۔ لیکن یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ یہ سب کے سب حقیقت میں شاعر تھے۔ کیوں کہ ایسے مصنفین کا شمار بھی جنھوں نے دوسرے علوم مثلاً قانون اور دینیات پر کتابیں لکھیں ہیں، شاعروں میں کر لیا گیا ہے۔ اس لئے کہ وہ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے

اور اس وجہ سے شاعر کہلانے لگے۔ علاوہ اس کے شاعر کی اصطلاح مبہم سی ہے اس کے معنی مصنف کے بھی ہوتے ہیں، جیسے یورپ میں بعض اوقات عام آدمی اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ گویا "شاعر" کو "مصنف" کے معنوں میں خیال کرنا چاہئے، اگرچہ ہندوستانی تذکرے زیادہ تر شعرا کے کلام کے انتخابات ہوتے ہیں جن میں اُن کے حالات بھی درج ہوتے ہیں، تاہم اُن میں اُن مصنفین کا بھی ذکر آجاتا ہے (اگرچہ یہ بہت شاذ و نادر ہوتا ہے) جنھیں ہم مشکل سے شاعر کہہ سکتے ہیں، اور اُن کی نثر کی تالیفات کا بھی بیان ہوتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ تمام مشرقی ادب میں اور خاص کر ہندوستانی ادب میں شاعری کو سب علوم پر تفوق حاصل ہوتا ہے۔ اس سے میرا مطلب محض نظم سے نہیں جو الفاظ کا باضابطہ مجموعہ ہے بلکہ ان موزوں خیالات سے ہے جو حُسن و خوبی کے ساتھ ادا کئے گئے ہیں جو تمدّن کی روح رواں ہے اور تاریخ سے کہیں بہتر اِن خیالات سے ہمیں کسی ملک کے تمدّن کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

علاوہ اس کے ہندوستانی نثر کی کتابیں بھی ایک حد تک نظم میں شریک کی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ مشرق کے مسلمانوں کی اور زبانوں کی طرح ہندوستانی میں بھی تین قسم کی نثر ہے جن میں سے ہم صرف ایک کو نثر کہہ سکتے ہیں۔ پہلی قسم کو مرجّز کہتے ہیں، جس میں موزونیت بغیر وزن کے ہوتی ہے۔ دوسری مسجّع ہے جس میں وزن تو ہوتا ہے، مگر قافیہ نہیں ہوتا۔ تیسری عاری ہے جس میں نہ وزن ہوتا ہے نہ قافیہ۔

ہندوستانی کے اکثر شاعر ایسے ہیں جنھوں نے فارسی میں بھی نظمیں لکھی ہیں جیساکہ پہلے زمانے میں ہمارے ہاں بھی رواج تھا کہ فرانسیسی شعرا اپنی زبان کے علاوہ آسانی سے لاطینی میں بھی شعر کہتے تھے، اور روم میں علاوہ لاطینی کے یونانی میں بھی نظمیں لکھتے تھے۔ اس رواج سے ایک دوسرا رواج نکلا، یعنی جو شاعر ان دو زبانوں میں شعر کہتے ہیں وہ تخلص بھی دو رکھتے ہیں۔ جن میں سے ایک ہندوستانی میں اور دوسرا فارسی میں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً وجیہ الدین کے دو تخلص ہیں، ایک وجیہ دوسرا ابر ہیں۔ اور اسی طرح محمد خاں کے ہندوستانی اور فارسی میں واله اور ثاقب دو تخلص ہیں

ہم ان بیشمار مصنفین کی تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ پہلا امتیاز جو بالکل قدرتی معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ ہم انہیں ہندو مسلمانوں میں تقسیم کریں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ مسلمانوں میں شاذ ایسے لوگ ملیں گے جنھوں نے ہندی یا ہندی شاخ میں نظم لکھی ہے، حالانکہ بہت سے ہندوؤں نے اُردو نیز دکھنی میں نظمیں لکھی ہیں، بعینہ جیسے وہ پہلے فارسی میں لکھتے تھے جیساکہ سید احمد نے آثارالصنادید میں بیان کیا ہے جس کا اقتباس میں اس سے پہلے دے چکا ہوں۔ تین ہزار شعرا میں سے، جن کے متعلق میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں، دو ہزار دو سو سے زیادہ مسلمان ہیں، باقی صرف آٹھ سو ہندو ہیں۔ جن میں سے صرف (۲۵۰) کے قریب ایسے ہیں جنھوں نے ہندی میں نظمیں لکھی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس تقسیم کے لئے ہمارا علم بہت ناکافی ہے کیونکہ ہندوی اور ہندو شعرا کے تذکرے بہت کم دستیاب ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے بہت سے شاعروں کا نام تک نہیں معلوم ہوا۔ لیکن اردو شاعروں کی یہ حالت نہیں ہے، کیونکہ اُن کے تذکرہ نویسوں نے اور کچھ نہیں تو کم سے کم نام تو دیدیا ہے، یہ زیادہ تر پنجاب، کشمیر، راجپوتانے اور سرزمین فصاحت ممالک مغربی شمالی (یہ نام کلکتہ کے لحاظ سے رکھا گیا ہے جو انگریزی حکومت کا مستقر ہے) دہلی، آگرہ برج اور بنارس کے ہندو باشندے ہیں جو اصل اُردو میں لکھتے ہیں اور یہ ہندوستانی کی سب سے فصیح اور شستہ شاخ سمجھی جاتی ہے۔

اگر ہم ان شاعروں کے وطنوں کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ کون سے ایسے شہر ہیں جہاں ہندوستانی زبان کی اسلامی شاخیں نہ صرف استعمال کی جاتی ہیں بلکہ بطور ادب کے ان کی تعلیم ہوتی ہے، دکھنی بولی سورت، بمبئی، مدراس، حیدرآباد، سری رنگا پٹم اور گولکنڈہ میں بولی اور لکھی جاتی ہے۔ اُردو دہلی، آگرہ، لاہور، میرٹھ، لکھنؤ، بنارس، کان پور، مرزا پور، فیض آباد، الہ آباد اور سب سے آخر کلکتہ میں جہاں ہندوستانی صوبہ کی ملکی زبان ساتھ ساتھ استعمال کی جاتی ہے۔

امّن نے جو پہلا ہندوستانی نثر نگار خیال کیا جاتا ہے اپنی کتابیں کلکتہ میں لکھیں، وہ باغ و بہار کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ

"سو اُردو کی آراستہ کر زبان   کیا میں نے بنگالا ہندوستان"

ان شعرا کے محض ناموں سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کون کون مسلمان ہیں اور کون کون ہندو
اور خود یہ نام بھی بہت دلچسپ مضمون ہیں اور مطالعہ کے قابل ہیں۔ میں نے ایک دوسرے مضمون میں
جس کا عنوان "مسلمانوں کے نام اور القاب" ہے اس بارے میں بہت کچھ لکھا ہے یہاں میں صرف اس قدر
یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان شعرا کے نام بعض اوقات چھ چھ تک ہوتے ہیں۔ ایک
عَلَم ہے جو اکثر کسی ولی یا نبی کے نام پر ہوتا ہے۔ دوسرا لقب ہے جو ایک قسم کا اعزازی نام ہے
جیسے غلام علی، امداد علی وغیرہ[۱]۔ تیسرا کنیت جس سے ابنیت یا ابویت کا پتہ لگتا ہے جیسے ابوطالب
ابن ہشام۔ چوتھا نسبت جس سے شاعر کا وطن معلوم ہوتا ہے جیسے لاہوری، قنوجی وغیرہ پانچواں
تخلص یعنی وہ نام جو نظم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ عموماً عربی یا فارسی کا اسم یا صفت
ہوتا ہے، ہندی نہیں ہوتا ہے۔

جس طرح مسلمان اپنے نام اپنے اولیا کے ناموں پر رکھتے ہیں اسی طرح ہندوؤں کے نام اُن
کے دیوتاؤں پر ہوتے ہیں۔ مثلاً مسلمانوں کے نام محمد، ابراہیم، حسن، حسین وغیرہ پر ہوتے ہیں
اور ہندوؤں کے ہر، نراین، رام لکشمن، گوپی ناتھ، گوکل ناتھ، کاشی ناتھ وغیرہ۔

مسلمانوں کے اعزازی ناموں مثلاً عبدالعلی، غلام محمد، علی مردان وغیرہ کے مقابلہ میں ہندوؤں
کے ہاں سیو داس، کرشن داس، مہادیو داس، کیشو داس، نند داس، ہلدھر داس، سورداس
وغیرہ ہوتے ہیں۔

ہندو نہ صرف اپنے دیوتاؤں کے غلام ہوتے ہیں بلکہ اپنے دریاؤں اور مقدس درختوں
اور شہروں کے بھی داس ہوتے ہیں مثلاً گنگا داس، تلسی داس، آگرہ داس، دوارکا داس وغیرہ۔

مسلمانوں میں ایک اور قسم کے بھی نام ہوتے ہیں جیسے محبوب علی، محبوب حسین، ہندوں میں
بھی بعینہ یہی نام پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سری لال (یعنی سری یا لکشمی کا محبوب) ہربنس لال (یعنی شیو
کے خاندان کا محبوب)۔

---

[۱] یہاں مصنف سے سہو ہو گیا ہے۔ یہ مثال علم کی ہے

عطاء اللہ، عطا محمد، علی بخش مسلمانوں کے نام ہیں۔ ہندوں میں اس کے جواب میں بھگوان دت (بھگوان کی عطا) رام پرشاد (رام کا عطیہ) سیو پرشاد، کالی پرشاد ہندوں کے ہاں پائے جاتے ہیں ہندوں کے بعض ہندی فارسی سے مرکب ہوتے ہیں جیسے گنگا بخش وغیرہ۔

مسلمانوں کے بعض نام اسد، شیر وغیرہ پہ ہوتے ہیں۔ ہندوں کے نام اسی طرح سنگھ پر پائے جاتے ہیں جس کے معنی بھی شیر ہی کے ہیں۔

اب رہا خطاب۔ یہ ہندوں کی مختلف ذاتوں میں خاص خاص ہوتا ہے۔ مثلاً برہمنوں کو چوبے تواری، دوبے اور پانڈے کہتے ہیں۔ چھتریوں کو راجپوت اور سکھ۔ ٹھاکروں کو رائے اور سنگھ ویشوں (سوداگروں) کو ساہ یا سیٹھ، ودّیادان یعنی علما و فصحا کو پنڈت اور سین۔ وید یعنی اطبا کو مصر۔ ہندو فقرا کو گرو، بھگت، گوسائیں، یا سائیں اور سکھ فقیروں کو بھائی کہتے ہیں۔

مسلمان بھی ہندوں کی طرح چار ذاتوں میں منقسم ہیں۔ یعنی سید، شیخ، مغل اور پٹھان۔ سید، محمد (صلعم) کی اولاد ہیں۔ شیخ عربی نسل سے ہیں۔ لیکن جو لوگ نومسلم ہیں وہ بھی اپنے آپ کو شیخ کہتے ہیں۔ مغل اپنے نام سے پہلے مرزا یا نام کے پیچھے بیگ لکھتے ہیں۔ انھیں آغا یا خواجہ بھی کہتے ہیں۔ پٹھان خان کہلاتے ہیں۔ مسلمان فقرا کو شاہ، صوفی، یا پیر کا خطاب دیا جاتا ہے۔ خواتین کو خانم، بیگم، صاحبہ، بی، یا بی بی کے خطابات سے موسوم کرتے ہیں۔

سری اور دیو ہندوں میں بڑے عزت کے نام ہیں پہلے کے معنی رشی اور دوسرے کے معنی دیوتا کے ہیں۔ یہ الفاظ بعض اوقات گاؤں، پہاڑوں، دریاؤں وغیرہ کے ساتھ بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ قدیم فرانس میں بھی دیوس اور دیوا کے نام شہروں، جنگلوں اور پہاڑوں کے ساتھ اسی طرح استعمال کئے جاتے تھے یہ ہندی رسم کیلٹک زبان اور ڈرو ڈی مذہب کے تخم کے ساتھ گنگا کے کنارے سے میوز، مارن اور سین[۱] تک پہنچی۔

اِس زمانہ میں بھی روسی اپنے ملک کو ہولی رشیا یعنی مقدس روس کہتے ہیں۔

---

[۱] یہ تینوں فرانس کے دریا ہیں۔

آج کل بھی ہندوستان کے فرماں روا اپنی سلطنتوں کے نامور شعرا یا مقرّبین کو یا اسلامی خطاب مثلاً سید الشعرا یا ملک الشعرا یا ہندوی خطاب مثلاً کبیشر یا برکبی عنایت فرماتے ہیں۔

جو ہندو اُردو میں شعر کہتے ہیں وہ بھی مسلمانوں کے رواج کے موافق تخلص رکھتے ہیں اور یہ تخلص عموماً فارسی الفاظ ہوتے ہیں جو ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی زبان ہے۔ ایک ہی تخلص ہندو اور مسلمان کا ہوسکتا ہے اور اس لئے صرف تخلص سے یہ تمیز کرنا مشکل ہے کہ شاعر ہندو ہے یا مسلمان۔

ان شعرا میں بعض ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو ہندو سے مسلمان ہو گئے ہیں۔ لیکن کوئی مسلمان ایسا نہیں پایا جاتا جو ہندو ہو گیا ہو[۱]۔ البتہ ایسا ہوا ہے کہ بعض مسلمان ایسے فرقوں میں مل گئے ہیں جن میں کامل اصلاح ہو گئی ہے اور ہندوؤں سے الگ ہو گئے ہیں مثلاً سکھ، جو ایسے مسلمانوں کو جنھوں نے ان کا مذہب اختیار کرلیا ہے مذہبی کہتے ہیں۔

درحقیقت مسلمان سے ہندو ہونا تنزل ہے اور برخلاف اس کے ہندو کے لئے مسلمان ہونا ایک قسم کی ترقی ہے، کیونکہ اسلام کی بنیاد توحید اور حشر (آیندہ زندگی) پر ہے۔ علاوہ اس کے ہندوستان کے مسلمانوں پر عقلیت کا اثر نہیں ہوا ہے۔ وہ اپنے عقاید میں ابھی تک ویسے ہی پکّے ہیں۔ اگرچہ عملاً ہندو مذہب نے اُن کے عقاید و رسوم پر ضرور اثر ڈالا ہے اور اب تک روزانہ نئے لوگ ان کے مذہب میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو شعرا اسلام اختیار کرلیتے ہیں۔ اور اپنے اشعار میں توحید کا گیت گاتے ہیں۔ منصطر (لالہ کنور سین) ایسے ہی لوگوں میں سے ہے جس نے فصیح ہندوستانی میں شہادتِ حسینؑ کو منظوم کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک درجن شاعر اور ایسے ہیں جن کا ذکر ہندوستانی تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔

ہندوستانی شعرا میں ہم ایسے ہندو بھی پاتے ہیں جو عیسائی ہو گئے ہیں اور سب سے زیادہ عجیب اور شاذ و نادر بات یہ ہے کہ بعض مسلمان بھی ایسے ہیں جنھوں نے عیسائی مذہب اختیار کرلیا ہے۔ چنانچہ شیفتہ اپنے تذکرے میں شوکت کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ یہ مسلمان تھا بعد میں عیسائی ہو گیا

---

[۱] بھگت مل نے البتہ ایک ایسے مسلمان کا ذکر کیا ہے جو ہندو ہو گیا تھا۔

"کہتے ہیں کہ بنارس میں شوکت کا ایک یورپین سے بہت دوستانہ تھا اور اس کے اغوا سے وہ اسلام کو ترک کر کے عیسائی ہو گیا - خدا اس بلا سے محفوظ رکھے - اب اس نے اپنا نام حنیف علی سے بدل کر حنیف مسیح رکھ لیا ہے"

ایسی حالت میں نام کا بدلنا ضروری ہے - ایک اور ہندوستانی شاعر جس کا نام فیض محمد تھا تبدیل مذہب کے بعد اس نے اپنا نام فیض مسیح رکھ لیا، تاہم یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مسیحیوں کے طرح ہندو نو عیسائی، اپنا اصلی نام قائم رکھتے ہیں حالانکہ ان ناموں کے معنی ہندوانہ ہوتے ہیں - اسی طرح زندہ ہندو مصنفین میں ہم بابو سری داس (سری لکشمی کے داس) کا نام پاتے ہیں، جنھوں نے مسلمان ہونے کے بعد خدا کی صفات پر ایک کتاب تالیف کی ہے جس کا نام شفاعت رب الامین ہے -

ہندوستانی تذکروں میں بعض ایسے ہندوستانی شعرا کا بھی ذکر پایا جاتا ہے جو نسلاً یہودی تھے مگر بعد میں مسلمان ہو گئے - مثلاً میرٹھ کا جمال جن کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے، ساٹھ برس ہوئے حیدر آباد میں تھا - دہلی کا جوان (محب اللہ) جو طبیب تھا اور عشق کا شاگرد تھا، اور آخر میں مشتاق کا جو ایک انتخاب کلام شعرا کا مؤلف ہے شاگرد ہو گیا -

اگرچہ پارسی عموماً گجراتی میں اور کبھی کبھی فارسی میں لکھتے ہیں تاہم بعض پارسی ایسے بھی ہوئے ہیں جن کا کلام اردو میں پایا جاتا ہے - چنانچہ بمبئی کے بومن جی دوسا بھائی کا شکنتلا ناٹک ہندوستانی زبان میں شایع ہوا ہے -

انھیں تذکروں میں بعض عیسائی یورپینوں کا ذکر بھی پایا جاتا ہے گو وہ خالص یورپین نہ ہوں مگر نسلاً یورپین ہیں۔ مثلاً سومبر یورپین اور سردھنے کی مشہور بیگم شمرو ملقب بہ زینت النسا ر کا بیٹا تھا اور صاحب تخلص کرتا تھا - اس کا خطاب ظفریاب تھا، وہ دلسوز کا شاگرد تھا، اس کے اردو اشعار مقبول ہوئے دہلی میں اس کے مکان پر مشاعرے ہوتے تھے جن میں شہر کے ممتاز شعرا شریک ہوتے تھے، انھیں میں ایک صاحب سرور بھی تھے - جن کی بدولت ہمیں یہ حالات معلوم ہوئے ہیں - کہتے ہیں کہ اس کا خط بہت پاکیزہ تھا جو مشرق میں بہت قابل قدر فن خیال کیا جاتا ہے - اُسے نقشہ کشی اور موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا

عین عنفوانِ شباب میں ۱۸۲۷ء میں انتقال ہو گیا۔

اس کا ایک دوست بل تھزر نامی تھا جو آسیرؔ تخلص کرتا تھا اور ہندوستانی میں خوب شعر کہتا تھا۔ سروؔر کا بیان ہے کہ یہ شخص فرنگی اور نصرانی تھا اور اس کے اشعار میں جن کا انتخاب اس نے دیا ہے جدّت پائی جاتی ہے۔

سردھنے کے چھوٹے سے دربار میں ایک تیسرا یورپین ہندوستانی شاعر اور تھا جو فرانسیسی تھا۔ وہ اپنے تئیں فراسو یا فرانسو کہتا تھا یعنی فرانسیسی۔ کہتے ہیں کہ وہ بیگم سردھنہ کے ایک عہدہ دار اگستے یا اگستن کا بیٹا تھا۔ وہ اچھے شعر کہتا ہے اور اسی دلسوز کا شاگرد ہے جس کے تلمذ کا فخر صاحب کو حاصل تھا اور دہلی کے مشہور شعرا میں سے خیال کیا جاتا تھا۔

اس عہد کے ایک ہندوستانی شاعر کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو عیسائی اور انگریز ہے اور جس کا نام ہندوستانی تذکرہ نویس کریم الدین نے جارج بنس شور لکھا ہے۔ تذکرہ نویس نے غلطی سے خاندانی نام کو تخلص (شور) سے ملا دیا ہے[1]۔

ان کے علاوہ ہندوستانی شعرا میں دو اور انگریزوں کے نام پائے جاتے ہیں جو دلّی کے رہنے والے تھے۔ ایک آسفن یعنی اسٹیفن یا اسٹیون جو ۱۸۰۰ء تک زندہ تھا اور دوسرا جان تومس یعنی جان ٹامس جو خان صاحب کے نام سے مشہور ہے اور ہم عصر شاعر ہے[2]۔

میں بھی اسی قسم کے ایک ہندوستانی شاعر سے واقف ہوں جس کا نام ڈائس سومبر تھا اور جسے بیگم سردھنہ (شمرو بیگم) نے گود لیا تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس کا نام اکثر انگریزی اخباروں میں آیا ہے کیوں کہ وہ ملکی حقوق سے محروم کر دیا گیا اور اس کے لئے وہ آخر تک لڑتا رہا۔ ڈائس سومبر بلا تکلف اُردو شعر کہتا تھا اور پڑھتا بھی خوب تھا۔

ایک حبشی کا بھی تذکروں میں ذکر آیا ہے جو ہندوستانی زبان کا شاعر تھا، اس کا نام سیدی حامد

---

[1] میرے انڈیا آفس کی تحقیقات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس شخص کا نام جارج پیشے (George Paschе) تھا اور وہ دوغلا یعنی فرانسیسی ہندوستانی اور ضلع میرٹھ کا زمیندار تھا تخلص شور کرتا تھا۔ (مترجم)

بسمل ہے۔ اس شخص کا نام ان نامور حبشیوں کی فہرست میں شریک کرنا چاہیئے جو بشپ گریگوری نے اپنی کتاب "ادبیات حبشیان" میں دی ہے یہ حبشی شاعر پٹنہ کا رہنے والا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غلام تھا وہ اس صدی کے آغاز میں ہوا ہے۔

ہندی کے تقریباً تمام شاعر ہندوؤں کے مجدّد (اصلاح یافتہ) فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں یعنی یا تو جینی ہیں یا کبیر پنتھی یا سکھ یا وشنوی، اور ان فرقوں کے بانی یا سردار، نامور سے نامور اور گمنام سے گمنام سب ہندی کے شاعر ہوئے ہیں۔ مثلاً رامانند ولبھا، دریا داس، جے دیو (سنسکرت کی مشہور نظم گیتا گووند کا مصنف) دادو، بیربھان، بابالال، رام چرن، شیو نراین وغیرہ

ایسے شیوی شاعر جن کا کلام ہندی میں ہے بہت ہی کم ہیں۔ ان میں کے اکثر قدیم زبان اور قدیم مذہب کے دلدادہ ہیں۔

ہندوستان کے مسلمان مذہبی لحاظ سے شیعہ سنی میں تقسیم ہیں۔ لوگ عموماً سنیوں کا کیتھلک عیسائیوں سے اور شیعوں کو پراٹسٹنٹوں سے مقابلہ کرتے ہیں۔ کیونکہ شیعوں نے سنت یعنی اُن احادیث کو جو پیغمبر صلعم کے حالات سے متعلق ہیں رد کر دیا ہے۔ مگر ان الفاظِ احادیث کو تسلیم کرتے ہیں جو روایت آنحضرت سے منسوب ہیں۔ چارڈن نے جو درحقیقت پراٹسٹنٹ تھا۔ اس کے بالکل برخلاف بیان کیا ہے غالباً اس کی وجہ وہ ظاہری مذہبی رسوم ہیں جو شیعوں میں پائی جاتی ہیں۔

مسلمانوں میں ڈِس سنٹر یعنی عوام کے عقائد سے اختلاف رکھنے والے بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے بانی کے نام پر سید احمدی کہلاتے ہیں۔ یہ ہندوستان کے وہابی ہیں اور بعض اوقات اسی نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔ بہت سے ہندوستانی مصنف اسی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً حاجی عبداللہ، حاجی اسمٰعیل اور اور لوگ جن کا ذکر بعد میں آئیگا۔

ہندوستان کے شعرا میں ایک بڑی تعداد ایسے مسلمانوں فلسفیوں یا صوفیوں کی بھی پائی جاتی ہے جن میں سے اکثر ولی مانے جاتے ہیں۔ نیز کچھ فقیر شاعر بھی ہیں۔ جن میں صرف فقرا ہی شریک نہیں بلکہ ایسے بھکاری بھی ہیں جو گلی کوچوں میں کاغذ کے ٹکڑوں پر لکھے ہوئے اپنے شعر بیچتے پھرتے ہیں۔ ان میں

سے مثال کے طور دہلی کے مکرّم (مرزا) اور کمترین (میاں) معروف بہ پیر خاں ہیں۔ کمترین اردوئے معلّا میں بذاتِ خود اپنی غزلیں دو دو پیسے کو بیچتا پھرتا تھا۔

ان بھکاری شاعروں کے ساتھ ساتھ ہم نیچ قوموں میں بھی شاعر پاتے ہیں۔ بعض تو ان میں سے پیشہ ور شاعر ہیں یعنی صاحب علم ہیں اور شعر و سخن میں اپنے تمام اوقات صرف کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو محض شوقیہ کہتے ہیں۔

ان کے علاوہ ایسے شاعر بھی ہیں جو صاحب تخت و تاج ہوئے ہیں اور جن کے اشعار کی نسبت "کلام الملوک ملوک الکلام" کہا گیا ہے۔ ان میں علاوہ گولکنڈہ کے تین بادشاہوں کے جن کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے، ابراہیم عادل شاہ بادشاہ بیجاپور، بدقسمت ٹیپو سلطان میسور۔ مغلوں میں شاہ عالم ثانی، اکبر شاہ ثانی، اور بہادر شاہ ثانی، اودھ کے بادشاہوں اور نوابوں میں آصف الدولہ غازی الدین حیدر اور واجد علی شاہ ہوئے ہیں۔

آخر میں ہمیں ہندوستان کے شعرا میں سے عورتوں کو مردوں سے الگ کرنا چاہئے۔ میں اپنے ایک خاص مضمون میں عورت شاعروں کا ذکر کر چکا ہوں[۱]

ان شاعر عورتوں میں سے جن کا ذکر میں نے پہلے نہیں کیا ایک شاہزادی خالہ ہیں۔ انھوں نے یہ تخلص اس لئے رکھا کہ وہ اپنے بھتیجے نواب عماد الملک رئیس فرخ آباد کے محل میں عام طور پر اسی نام سے پکاری جاتی تھیں، لیکن ان کا خطاب بدر النسا تھا۔

میں امۃ الفاطمہ کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ان کا تخلص صاحب ہے۔ مگر زیادہ تر جی صاحب یا صاحب جی کہلاتی ہیں اور اردو شعرا میں اپنی غزل کی وجہ سے مشہور ہیں۔ وہ ایک نامور شاعر مومن کی شاگرد ہیں۔ مومن شیفتہ کے بھی استاد ہیں جنھوں نے شعرا کا تذکرہ لکھا ہے اور جس کا حوالہ میں نے اکثر دیا ہے۔ علاوہ ان کے مومن کے اور بھی بہت سے شاگرد ہیں۔ صاحب کبھی دہلی اور کبھی لکھنؤ میں رہتی ہیں۔ معز اللہ خاں نے جو ایک مثنوی "قول غمیں" کے نام سے لکھی ہے، اس کی مخاطب یہی

۱؎ یہ مضمون "ریویو دی اورنیٹ" کے مئی نمبر ۱۸۵۴ء میں شائع ہوا تھا۔

صاحب ہیں

ایک اور عورت شاعر جو باوجود ہندو نام کے اغلباً مسلمان ہے چمپا ہے۔ اس نے نواب حسام الدولہ کے حرم میں پرورش پائی اور قاسم نے اس کا نام اردو شعرا میں شمار کیا ہے۔

ایک معمولی طوائف جس کا نام فرح یا فرح بخش ہے وہ بھی اردو شعر کہتی ہے، شیفتہ نے ایک اور طوائف کا ذکر کیا ہے جس کا نام ضیا ہے اور عاشق نے ایک تیسری کا ذکر کیا ہے جس کا نام کنچن ہے۔

ایک چوتھی طوائف جس نے ہندوستانی زبان کی شاعری میں زیادہ شہرت حاصل کی ہے جان[1] (میر یار علی جان صاحب) ہے، وہ اصل میں فرخ آباد کی رہنے والی ہے، مگر لکھنؤ میں توطن اختیار کر لیا ہے جہاں اسے ادبی کامیابی حاصل ہوئی۔ اسے بچپن سے موسیقی اور ہندوستانی شاعری اور فارسی کا شوق تھا۔ اس نے اپنی عمر ہندوستانی شاعری میں صرف کی اور کریم الدین صاحب تذکرہ اسے اپنا استاد سمجھتے ہیں اور شعر و سخن میں اس سے مشورہ کرتے ہیں۔ ۱۲۶۲ہجری (۱۸۴۶ء) میں اس کا دیوان لکھنؤ میں طبع ہوا جس نے بہت شہرت حاصل کی۔ اس کی تمام نظمیں زنانہ بولی میں ہیں۔ اس وقت اس کی عمر ۳۵ سال کی تھی۔

ایک ہندو عورت شاعر کا ذکر میں اور کرنا چاہتا ہوں۔ یہ نازنول کی رہنے والی ہے؛ اس کا نام رام جی اور تخلص نزاکت تھا۔ ہندوستانی تذکروں میں اس کی اعلیٰ قابلیت اور حسن و جمال کی بہت تعریف لکھی ہے۔ وہ ۱۸۴۸ء تک زندہ تھی۔

ان کے علاوہ دو تین اور عورت شاعروں کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ ایک تصویر ہے اور دوسری ثریا۔ ان کا ذکر باطن اور کریم نے کیا ہے۔ یاس جس کا نام میاں بانو تھا۔ حیدر آباد کی رہنے والی

---

[1] گارساں دتاسی جیسے محقق سے یہ تعجب ہے کہ اس نے میر یار علی جان صاحب متخلص بہ جان صاحب کو طوائف سمجھا۔ حالانکہ خود نام بتا رہا ہے کہ یہ عورت کا نام نہیں ہو سکتا بہرحال مضمون کا یہ حصہ اس لحاظ سے بہت دلچسپ ہے

(اڈیٹر)

تھی اور فیض دہلوی کی شاگرد تھی۔ اس نے پند نامۂ عطار کا ترجمہ کیا ہے۔

ایک دوسری تقسیم ان شاعروں کی سنہ وار ہو سکتی ہے۔ اگرچہ یہ تقسیم زیادہ تر قابل لحاظ ہے۔ لیکن اُسی قدر مشکل بھی ہے۔ خاص کر قدیم شعرا کے متعلق زیادہ دشواری پیش آتی ہے۔ کیونکہ ان کے حالات صحیح طور سے معلوم نہیں ہو سکتے۔ سب سے اول ہندو شاعر ہیں[1]۔ گیارہویں صدی (۱۰۰۰ء) میں مسلمان شاعر مسعود سعد ہوا ہے جس کے متعلق این۔ بلینڈ (N. Bland) نے ایک مضمون جنرل ایشیاٹک بابت ۱۸۵۳ء میں لکھا ہے۔ بارہویں صدی میں چاند ہوا ہے جو راجپوتوں کا ہومر کہلاتا ہے۔ پیپا بھی اسی صدی کا شخص ہے جس کی نظمیں سکھوں کی ادی گرنتھ کا جُز ہیں۔ تیرہویں صدی (تقریباً ۱۲۵۰ء) میں سعدی گزرے ہیں اور جیسا کہ بیان ہو چکا ہے انھوں نے اردو میں بھی شعر لکھے ہیں۔ بیجو باورا بھی مشہور شاعر اور کلاونت گزرا ہے۔ چودہویں صدی میں دلی کے امیر خسرو اور حیدرآباد کے نوری ہوئے ہیں۔

بلاشبہ ان کے علاوہ ہندوستان کے اور شعرا بھی ہیں جو ان صدیوں میں یا اس سے قبل گزرے ہونگے ممالک متوسط کے کتب خانوں میں بہت سی قدیم ہندی تصنیفات ہیں جن کا حال ابھی معلوم نہیں ہوا ہو بہت سے ایسے گیت بھی موجود ہیں جن سے اُس زمانے کا پتہ لگتا ہے۔ جب کہ ہندوستانی زبان بن رہی تھی۔

سولہویں صدی میں جدید فرقوں کے سب سے قدیم بانی پیدا ہوئے جن کی مذہبی زبان ہندی تھی اور جو اس زبان میں بھجن اور اخلاقی نظمیں تصنیف کرتے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ قابل لحاظ کبیر ہیں جو سنسکرت کے سخت مخالف تھے۔ اُن کے شاگرد سُرت گوپال داس مصنف سُکھ ندان اور دہرم داس مصنف امر مل ہوئے ہیں۔ نانک اور بھگو داس مشہور و معروف ہیں اور اُن کی نسبت میں اس کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا جو پہلے لکھ چکا ہوں۔ لالچ، بھگوت کا مصنف ہے اس نے یہ کتاب پچھم کی ہندوستانی میں لکھی ہے وغیرہ وغیرہ۔

---

[1] سب سے قدیم ہندی شاعروں کا زمانہ صحیح طور سے معلوم نہیں ہو سکتا۔ تاہم میں شنکراچاریہ کا نام لے سکتا ہوں جو سنسکرت کا شاعر تھا۔ اور امر سکتا کے نام سے معروف تھا۔ یہ نویں صدی میں ہوا ہی اور ایسا معلوم ہوتا ہی کہ اس نے ہندی میں شعر کہے ہیں۔

سولھویں صدی میں ہندؤں میں سکھ دیو ہوا ہے - جس کی حال میں تذکرہ نویس ہریاداس نے خاص مضمون لکھا ہے - نابھاجی بھی اسی زمانہ کا شخص ہے - یہ ان گیتوں کا مصنف ہے جو بھگت مل کا اصلی متن ہیں - ولبھا اور دادو اپنے اپنے فرقوں کے سردار اور مشہور شاعر ہوئے ہیں - بہاری ، ست سئی کا مشہور مصنف گزرا ہے گنگاداس ماہر فن معانی وبلاغت ہوا ہے - اور ایسے ہی اور بہت سے ہوئے ہیں -

شمالی ہند کے مسلمانوں میں علاوہ اور لوگوں کے ایک تو ابوالفضل اکبر کے وزیر ہیں اور دوسرے بایزید انصاری جو روشنائی یا جلالی فرقہ کے سردار تھے -

دکن کے شعرا میں مفصلہ ذیل نام پائے جاتے ہیں - افضل (محمد) جس کا تذکرہ نویس کمال لکھتا ہے کہ "اس کا طرز بیان شستہ نہیں کیونکہ اس زمانے میں جبکہ اس نے لکھنا شروع کیا ، ریختہ مقبول نہیں ہوا تھا اور اسی لئے اسے مجبوراً دکھنی میں لکھنا پڑا" محمد قلی قطب شاہ ، بادشاہ گولکنڈہ جو ۱۵۸۲ء سے ۱۶۱۱ء تک برسر حکومت رہا اور اس کا جانشین عبداللہ قطب شاہ جو ہندوستانی ادب کا مربی و سرپرست تھا

سترہویں صدی وہ زمانہ ہے جس میں خاص کر دکن میں اصل اردو شاعری کا فروغ شروع ہوا اور زبان کا استعمال باقاعدہ ہونے لگا - ہندی شعرا میں صرف سورداس ، تلسی داس اور کیشوداس کے ناموں پر اکتفا کروں گا - یہ جدید ہندوستان کے مقبول شاعر ہیں اور جن کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ "سورداس سورج ہے ، تلسی داس چاند اور کیشوداس تارے دوسرے شاعر صرف جگنو ہیں جو ادھر ادھر چمک جاتے ہیں" -

اردو شعرا میں حاتم جن کا ذکر پہلے آچکا ہے آزاد (فقیر اللہ) جو اگرچہ حیدرآبادی تھے - مگر دلی میں رہتے تھے اور ان کی نظم نے وہیں شہرت حاصل کی - جیون (محمد) جو متعدد مذہبی کتب کے مصنف ہوئے ہیں -

دکنی شعرا میں یہ لوگ ہوئے ہیں - ولی جسے بابائے ریختہ کہا جاتا ہے - ان کے استاد شاہ گلشن ، احمد گجراتی تاناشاہ جن کا ذکر پہلے آچکا ہے ، شاہی بھاگ نگری اور مرزا ابوالقاسم جو تاناشاہ کے عہدہ داروں میں سے

تھے، غوری یا ابن نشاطی (غالبًا یہ دونوں ایک ہی صاحب کے نام ہیں) مصنف پھول بن؛ غواص یا غواصی مصنف طوطی نامہ؛ محقق، دکن کا ایک بہت قدیم شاعر جس کا کلام ریختی میں ہے اور ہندوستانی ریختی سے بہت کچھ ملتا جاتا ہے، خاور نامہ کا مصنف ہی اس کا خلاصہ میں اپنی تاریخ ادب اردو میں دے چکا ہوں اعجاز (محمد) اور بہت سے اور۔

اٹھارہویں صدی کے ان تمام ہندوستانی شاعروں کا ذکر جنھوں نے اپنے ہم وطنوں میں شہرت و امتیاز حاصل کیا ہی بہت طویل ہوگا، ہندی شاعروں میں چند کا ذکر کرتا ہوں۔ گینتی اُس نے ہندوؤں کے مختلف فلسفیانہ عقاید پر ایک رسالہ لکھا ہی۔ بیر بھان یہ مشہور فرقہ سادھ کا بانی اور ایک مشہور مذہبی نظم کا مصنف ہوا ہی۔ رامچرن' یہ ایک فرقہ کا بانی جو اسی کے نام سے موسوم ہی اور مذہبی بھجنوں کا مصنف ہی۔ شیو نراین' یہ بھی ایک فرقہ کا بانی ہے اور ہندی نظم میں گیارہ کتابوں کا مصنف ہی۔ وہ ابتدا میں بجائے معمولی گنیش کی حمد و ثنا کے رشیوں کی پناہ سے آغاز کرتا ہے۔

اردو شاعروں میں میں صرف چند نام لوں گا۔ سودا، میر اور حسن جو گزشتہ صدی کے تین نامور شاعر گزرے ہیں۔ جرأت، آرزو، درد، یقین، فغاں، امجد دہلی کے، امین الدین بنارس کا اور عاشق غازیپوری۔ دکھنی شعرا میں قابل ذکر یہ ہیں۔ حیدر شاہ معروف بہ مرثیہ گو، کیونکہ وہ اپنے مرثئے خود پڑھتے تھے منجملہ اور چیزوں کے ہم اس شاعر کے کلام میں متعدد ایسی نظمیں پاتے ہیں جن کا ارتقا ولی کے دیوان میں نظر آتا ہے۔ یہ نظمیں مخمس ہیں۔ وہ ایک منظوم کتاب تحفۃ الصبیان کا مصنف بھی ہے اس میں کئی باب ہیں اور ہر باب کی بحر جدا ہے اور باب کے شروع میں بحر کا نام لکھ دیا گیا ہے۔ سراج اورنگ آبادی (سنہ وفات تقریبًا ۱۷۵۵ء) اور عزلت سورتی جو دکن کے مشہور شعرا میں ہوئے ہے (سنہ وفات ۱۷۵۰ اور ۱۷۶۲ کے درمیان)

انیسویں صدی اور زمانۂ حال کے مشہور ہندی مصنفین میں ایک تو بختاور ہے جس نے جینی عقائد کی تشریح و تفصیل نظم میں لکھی ہے دوسرا اُدھا رام (سیرت نویس) فرقہ رام سینہی کا سردار اور تیسرا اُس کا جانشین چتر داس ہے۔

اردو میں صہبائی اور کریم نے ان شعرا کے نام لکھے ہیں۔ مومن دہلوی جو بہت ہر گو اور فصیح

شاعر تھا (سنہ وفات ۱۸۵۲ء) ان دونوں صاحبوں کی رائے میں اس کا کلام بے نظیر ہے۔ نصیر (سنہ وفات ۱۸۴۲ء، ۱۸۴۳ء) ؛ آتش (سنہ وفات ۱۸۴۷ء) یہ سب صاحب دیوان ہیں اور مقبول شعرا میں سے ہیں، مول چند، جس نے شاہنامہ کا ملخص نظم میں کیا ہے۔ ممنوں ہم عصر شعرا میں بہت مشہور و معروف ہیں اور ان کے علاوہ کئی اور ہیں جن کا ذکر میں اپنے ابتدائی خطبہ میں کر چکا ہوں۔

دکھنی شعرا میں صرف کمال حیدر آبادی اور عبدالحق مدراسی کے نام کافی ہیں۔

جس طریقہ سے ہندوستانی تذکرہ نویس شعرا کا ذکر کرتے ہیں اگر ہم اُس پر غور کریں تو آسانی سے اس کی تین تقسیمیں ہو سکتی ہیں۔ وہ شاعر جن کا وہ محض ذکر کر دیتے ہیں ؛ وہ شعرا جن کا ذکر وہ ادب سے کرتے ہیں ؛ اور وہ شاعر جن کا ذکر بہت ادب واحترام اور تعریف کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ پہلے درجہ میں وہ لوگ ہیں کہ جن کے متعلق کوئی تفصیلی ذکر نہیں ہوتا اور بعض اوقات صرف نام، تاریخ ولادت اور کچھ اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ یہ وہ شاعر ہیں جو صاحب دیوان نہیں اور جن کی صرف چند ہی غزلیں ہیں یا جنھوں نے بعض طویل نظمیں مختلف طور پر لکھی ہیں مگر کسی نام سے موسوم نہیں۔ دوسرے درجہ میں ان لوگوں کا شمار کرتا ہوں جو صاحب دیوان یا کلیات ہیں۔ ان اصطلاحوں کی تشریح میں بعد میں کروں گا، تیسرا درجہ اُن مصنفین کا ہے جن کی نظم یا نثر کی تصانیف کے خاص نام ہیں۔ اگر وہ ہندو ہیں تو ان کتابوں کے نام عموماً سنسکرت میں ہوتے ہیں اور مسلمان ہیں تو فارسی عربی میں۔

ہندوستانی میں مختلف قسم کی نظمیں مختلف ناموں سے موسوم ہیں۔ یعنی الفاظ معانی پر غالب ہیں۔ غزل میں چھ سے بارہ تک شعر ہوتے ہیں۔ سب کا قافیہ ایک ہی ہوتا ہے اور پہلے دو مصرعوں میں قافیے کا ہونا لازم ہے۔ مضمون کے لحاظ سے کوئی تعین نہیں ہو سکتا۔ یہ ظریفانہ اور سنجیدہ ہر قسم کی ہوتی ہیں اور اکثر عاشقانہ اور تصوفانہ ہوتی ہیں۔ یہ پٹرارک اور شکسپیر کی طرز پر ایک قسم کی سانٹ ہوتا ہے۔ شکسپیر نے اس مشہور اطالوی شاعر (پٹرارک) کی تتبع میں سانٹ لکھے ہیں اور حسن اور شیرینی میں اس سے کسی طرح کم نہیں، لیکن اُس کے ڈراموں کے مقابلہ میں وہ زیادہ مشہور نہ ہونے پائے۔ قصیدہ بھی اسی قسم کی نظم ہے لیکن یہ طویل ہوتا ہے اور کبھی مدح میں اور کبھی ہجو میں اور بعض اوقات کسی دوسرے مضمون پر۔

مثنوی وہ نظم ہے جس کے دونوں مصرعے مقفیٰ ہوتے ہیں اور وہ ہر قسم کے مضمون پر ہوتی ہے بعض وقت یہ بہت مختصر ہوتی ہے اور بعض وقت بہت طویل۔ یعنی کبھی دو تین صفحے کی اور کبھی اس کی طوالت ہزار صفحے تک پہنچ جاتی ہے کبھی قصہ کہانی ہوتی ہے اور کبھی اخلاقی یا مذہبی نظم۔ ہندوستانی شعرا نے اس میں لطیف و شدید اسنجیدہ و غیر سنجیدہ ہر قسم کے مضامین لکھے ہیں۔

ان کے علاوہ مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسبع، مثمن اور معشر ہیں۔ جن میں بہ ترتیب تین چار پانچ چھ سات آٹھ اور دس مصرعے ہوتے ہیں۔ یہ مرثئے، تہنیت اور مبارک باد یا دوسرے مضامین پر مشتمل ہوتے ہیں۔

بعض نظمیں ایسی ہیں جن کے نام اور مضمون میں تفاوت نہیں پایا جاتا مثلاً ساقی نامہ' نام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظم شراب نوشی کے متعلق ہوگی لیکن بعض اوقات یہ مختلف مضامین پر ہوتا ہے۔ مثلاً حیدر (حیدر بخش) کا ساقی نامہ جو حضرت علی کی منقبت میں ہے۔

تقریباً یہی حال ہندی شاعری کا ہے۔ نظم کے خاص ناموں کو مضمون سے کچھ زیادہ تعلق نہیں ہوتا مثلاً "پد" میں ہر قسم کا مضمون آجاتا ہے اور "بٹہ" جو ہولی اور بیاہ شادی دونوں کے گیتوں کے لئے آتا ہے شادی کے گیتوں کا خاص نام بعض اوقات بدہوا ہوتا ہے۔

مسلمان کی شاعری خواہ کیسی ہی مختصر ہو، اس میں کچھ ایسا صوفیانہ رنگ ہوتا ہے کہ فوراً پہچانی جاتی ہے۔ فارسی کی طرح کی ہندوستانی کی شاعری میں بھی مرد کے پردے میں عورت کا حسن بیان کیا جاتا ہے اس کے برخلاف ہندوستانی کی شاخ ہندی میں عورت اپنا عشق ایک نوجوان کی نسبت ظاہر کرتی ہے اور عشقیہ اشعار اس کی زبان سے ادا کئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات اردو میں بھی یہ پایا جاتا ہے اور اس صورت میں اس شاعری کو ریختہ کہتے ہیں۔ انشاءاللہ خاں نے اس قسم کی شاعری کو اس صدی کے آغاز میں رواج دیا۔

اردو میں بھی فارسی کی وہی قسمیں اور وہی بحریں ہیں جو فارسی میں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دو قسمیں صرف ہندوستانی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ایک مکری اور دوسری پہیلی، جن کا ذکر میں بعد

میں کروں گا۔

عربی میں اول اول دیوان کا نام نظموں کے ایک معمولی مجموعہ کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ مثلاً دیوان فرید اور دیوان امرالقیس لیکن اب عربی نیز مشرق کے مسلمانوں کی دوسری زبانوں جیسے ہندوستانی پشتو، فارسی، ترکی میں غزلوں کے ایسے مجموعے کا نام ہے جو بلحاظ مضمون قافیہ کے آخری حرف کی رعایت سے حروف تہجی کی ترتیب سے مرتب ہو۔ علاوہ غزلوں کے اس میں دوسری نظمیں بھی شریک کردی جاتی ہیں۔ کلیات مصنف کے کئی دیوانوں اور تمام متفرق نظموں کے مجموعے کا نام ہے۔ ہندی شاعری میں یہ دو اصطلاحیں مستعمل نہیں ہیں۔ مثلاً دوہروں، کبتوں اور شلوکوں کے مجموعے کو (جو دیوناگری میں لکھے جاتے ہیں) کبھی دیوان یا کلیات نہ کہیں گے۔

کلیاتوں یا دیوانوں کے خاص خاص نام بہت کم بلکہ شاذ ہوتے ہیں۔ صرف چند ہی ایسے ہیں جن کے خاص نام ہیں۔ مثلاً اختر (واجد علی شاہ) موجودہ بادشاہ اودھ کے دیوان کا نام فیض بنیان ہے۔ اور جوش (احمد حسن خاں) کا دیوان گلدستۂ سخن کہلاتا ہے۔ رشک کے دو دیوان نظم مبارک اور نظم گوہر بار (؟) کے نام سے موسوم ہیں اور کلیات طپش کا نام گلزار مضامین ہے۔

چھوٹی چھوٹی نظمیں جو ان مجموعوں میں پائی جاتی ہیں وہ زیادہ تر عاشقانہ اور صوفیانہ ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان کے مصنف اکثر مسلمان ہوتے ہیں اور وہ حسن جاودانی (باقی) اور حسن مخلوق (فانی) میں گڈمڈ کردیتے ہیں جو ہماری نظروں میں خلاف اتّقا معلوم ہوتا ہے۔ انھیں خدا، عورت یا مرد کے چہرے میں نظر آتا ہے اور اس لئے بعض اوقات اعلیٰ درجہ کے روحانی اشعار کے ساتھ ساتھ کم درجہ کا سوقیانہ بلکہ فحش کلام بھی پایا جاتا ہے۔ جہاں تک کہ مروّجہ یورپین اور مسیحی آداب نے اجازت دی میں نے دیوان ولی کے ایک حصہ کا ترجمہ کیا ہے۔ نیز میری کتاب "تاریخ ادب اردو" اور "ہندوستانی گیتوں" میں بھی بہت سی غزلوں کے ترجمے آگئے ہیں۔ ان سے اس قسم کی شاعری کا کافی اندازہ ہوسکتا ہے۔ ان میں سے بعض غزلیں نہایت اعلیٰ درجے کی ہیں اور میری رائے میں پنڈار اور انیک رائن کے کلام بلکہ حافظ کی غزلوں کی برابری کرتے ہیں جن کی دنیا میں اس قدر شہرت ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ باقی

کی ترکی غزلوں سے کہیں بہتر ہیں۔

بڑا نقص ان میں یہ ہے کہ چند ہی مضمون ہیں جن کا طرح طرح سے اور اکثر ایک ہی قسم کے الفاظ اور جملوں میں بار بار اعادہ ہوتا ہے اور اس سے جی اکتا جاتا ہے۔

ایسے اشعار بکثرت ہیں جن میں تکلف اور آورد پائی جاتی ہے اور بٹلر کا یہ شعر مشرقی شاعروں پر پورے طور سے صادق آتا ہے۔

"جو لوگ مقفیٰ اشعار لکھتے ہیں انھیں ایک مصرع کی خاطر دوسرا مصرع بنانا پڑتا ہے"

چند ممتاز اور مقبول دیوانوں کے سوا، دوسرے دیوانوں کا پڑھنا ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔

دوسرا نقص ان غزلوں میں یہ ہے کہ ان میں عموماً ابہام پایا جاتا ہے اور اہل مشرق اُسے حُسن سمجھتے ہیں اور اس کی بڑی قدر کرتے ہیں۔

ہندوستانی دواوین میں ولی کا دیوان بہت مشہور ہے۔ باوجود اس کے ممالک مغربی و شمالی میں آج کل اسے بہت کم لوگ پڑھتے ہیں اس لئے نہیں کہ وہ دکنی زبان میں ہے بلکہ زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ اس کا طرز بیان قدیم ہے۔ سودا۔ میر درد، جرأت اور یقین کے دیوانوں کا یہ حال نہیں یہ اس کے مقابلے میں زیادہ جدید ہیں اور اب تک مقبول ہیں۔

ہم عصر شعرا کے دیوانوں میں آتش، ذوق، نوید اور نظیر کے دیوان بہت مشہور ہیں۔

دیوانوں کے آغاز اور خاتمہ پر جو نظمیں ہوتی ہیں وہ مختلف قسم کی ہوتی ہیں اور ان کے متعلق میں "ہندوستانی ادب کی تاریخ" میں ذکر کر چکا ہوں۔

طویل مثنویوں میں یا کسی خاص مضمون کا ذکر ہوتا ہے یا کوئی تاریخی واقعہ بیان کیا جاتا ہے یا بعض اوقات پورا قصّہ منظوم کر دیا جاتا ہے۔ اکثر یا تو قصّے کہانیاں ہوتی ہیں یا کم و بیش تاریخی واقعات یا بالکل فرضی اور خیالی قصّے۔ لیکن عموماً یہ ہوتا ہے کہ شاعر اپنے طور پر کسی ایسے قصّے کو نظم کر دیتا ہے جو پہلے سے مشہور ہے۔ اس قسم کی بہت سی ضخیم نظمیں موجود ہیں اور بعض ان میں سے قابل قدر ہیں۔ بعض شاعروں نے کئی کئی مثنویاں لکھی ہیں اور ہندوستانی فارسی اور ترکی میں ایسے شاعر بھی ہیں جنہوں نے پانچ پانچ اور سات

سات مثنویاں لکھی ہیں - چنانچہ بعض مثنویوں کے مجموعے خمسے اور ہفتے کہلاتے ہیں، گویا وہ مثنویوں کے دیوان ہیں - ان میں سے زیادہ مشہور نظامی اور امیر خسرو کے خمسے اور جامی کا ہفتہ ہے جو استعارۃً ہفت اورنگ بھی کہلاتا ہے۔

بعض قصے ایسے مقبول ہوئے ہیں کہ انھیں اکثر شاعروں نے نظم کیا ہے اور مثنویوں کے مجموعوں میں وہ ضرور پائے جاتے ہیں - ان میں زیادہ تر مشہور مشرق کے عاشقوں کے قصے ہیں مثلاً یوسف زلیخا، فرہاد شیریں، مجنوں لیلیٰ اور وامق و عذرا -

بعض بہادر اور نامور لوگوں کے قصے بھی ہیں جو بہت مبالغہ آمیز ہیں مثلاً سکندر، رستم، حمزہ، حاتم طائی بہرام گور (یہ نام اس کا اس لئے پڑ گیا تھا کہ اُسے گورکے شکار کا بہت شوق تھا)

ہندوستانی میں یہ اسلامی قصے خوب بیان ہوئے ہیں اور اُن میں مقامی رنگ بھی آگیا ہے جس سے اور لطف پیدا ہوگیا ہے۔

اکثر مصنّفین نے اپنی نظموں میں یہ بیان کیا ہے کہ یہ فارسی کے ترجمے ہیں - یہ بھی ایک طریقہ بیان ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اُن فارسی تصانیف پر مبنی ہیں جنھیں مشرق میں خاص شہرت حاصل ہے۔ اس سے قبل ہمیں یہ معلوم ہوچکا ہے کہ ہندوستانی کے رواج سے پہلے ہندوستان کے مسلمان اور بعد میں ہندو بھی ایک زمانہ دراز تک فارسی لکھتے پڑھتے تھے - باوجود رواج کے ہندوستانی میں لکھتے وقت مصنفین بہت لیس و پیش کرتے تھے اور اس معمولی زبان کے استعمال کے متعلق بہت سے عذر کرتے تھے اور یہ سب کچھ ہونے کے بعد بھی وہ اپنی نئی تالیفات کا تعلق فارسی تصانیف سے قایم کرنے کی کوشش کرتے تھے جب ان ترجموں کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اکثر وہ ترجمہ تو کیا اصل کی نقل بھی نہیں ہیں بلکہ اسی مضمون پر جداگانہ کتابیں ہیں اور ظاہری ترتیب اور بنیادی امور میں دونوں اصل سے مختلف ہیں

علاوہ شاعری کے دوسری کتابوں کا بھی یہی حال ہے مثلاً آرائش محفل جو سجان رائے کی کتاب خلاصۃ التواریخ کا ترجمہ خیال کی جاتی ہے - ہندوستان کی تاریخ اور جغرافیہ نگاری (مقامات کا تذکرہ) ہے اور کسی فارسی کتاب کا ترجمہ یا خلاصہ نہیں ہے۔

میں نے "یوسف زلیخا" کے چھ مختلف نسخے دیکھے ہیں۔ ایک امین کا جو سنہ ۱۶۹۷ء میں لکھا گیا، دوسرا تپش کا جو مصنف نے قید خانے میں تصنیف کیا۔ تیسرا فدوی لاہوری کا جس پر اس کے حریف اور ہم عصر شاعر میر فتح علی نے بہت کچھ نکتہ چینی کی ہے اور "قصہ بوم و بقال" لکھ کر فدوی کے باپ کے پیشے پر طعن کیا ہے۔ چوتھا مجیب کا جو زمانہ حال کا شاعر ہے۔ پانچواں (مہدی علی) عاشق کا جو خمسہ کا ایک حصہ ہے۔ اور چھٹا نسخہ بمبئی میں سنہ ۱۸۴۸ء میں "عشق نامہ" کے نام سے طبع ہوا۔

ہندوستانی میں "لیلیٰ مجنوں" کے پانچ نسخوں کا مجھے علم ہے ایک تاج علی کا، دوسرا اعظم دہلوی کا جو شاہ جیلان کے نام سے بھی مشہور ہے۔ ہوس نے بھی ایک لیلیٰ مجنوں شاہ نامہ کی بحر میں لکھی ہے یہ آصف الدولہ نواب اودھ کے رشتہ داروں میں سے تھے اور رضی اور رضا اور رسا کے ناموں سے بھی مشہور ہیں۔ چوتھا ولا کی تصنیف ہے جو امیر خسرو کی فارسی تصنیف کے تتبع میں ہے۔ پانچواں ایک ترجمہ ہے جس کا ذکر ڈاکٹر سپرنگر نے کیا ہے اور یہ ان سب سے قبل کا ہے۔

جہانتک مجھے علم ہے بہرام گور کے قصے پر ہندوستانی میں تین کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک حیدری کی ہے جس کا نام "ہفت پیکر" ہے جو نظامی کی اصل فارسی تصنیف کا نام ہے۔ دوسری تابی (؟) کی ہے جو گولکنڈہ کا رہنے والا تھا اس کا سنہ تصنیف سنہ ۱۶۷۰ء ہے ایک حقیقت بریلوی کی ہے جو سنہ ۱۸۱۰-۱۱ء میں لکھی گئی، اس کا نام ہشت گلزار ہے۔ بظاہر یہ ہشت بہشت کی مناسبت سے ہی لیکن بجائے اس کے ہفت گلزار نظامی کی ہفت پیکر اور ہاتفی کی ہفت منظر کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہوتا۔ ہاتفی نے یہ نام اس لئے رکھا ہے کہ بہرام گور شاہ ایران یزدجرد کے بیٹے کے سات بیویاں تھیں اور سات مختلف باغوں میں الگ الگ رہتی تھیں۔

سکندر کے متعلق ہندوستانی میں مجھے دو قصوں کا علم ہے۔ ایک آگرے کے اعظم کا ہے جو اس نے نظامی کے سکندر نامے کے تتبع میں لکھا ہے۔ دوسرا نکہت دہلوی کا۔ یہ بھی سکندر نامی ہی کی تقلید میں لکھا گیا ہے۔

حاتم طائی کا قصہ ہندوستانی میں بھی ایسا ہی عام ہے جیسا فارسی میں۔ جہانتک میرا علم ہے یہ قصہ

ہندوستانی میں حیدری، سراج اور گوبند ناتھ نے لکھا ہے۔

شاہ و درویش کا قصّہ ہندوستانی فارسی اور ترکی تینوں زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ ہندوستانی میں (بینی نراین) جہاں کا قصّہ زیادہ تر مشہور ہے

امیر حمزہ (عم حضرت صلعم) کا عجیب وغریب قصّہ بھی کئی صاحبوں نے لکھا ہے ان میں سے دو کا مجھے علم ہے ایک تو عاشق کا ترجمہ ہے جس کی تفصیل میں نے کسی دوسری جگہہ لکھی ہے۔ دوسرا غالب لکھنوی کا۔ جو کہا جاتا ہے کہ فارسی کا ترجمہ ہے اور کلکتہ میں چھپا ہے۔

ان قصوں میں سے جو مشرق کے مشاہیر کے متعلق لکھے گئے ہیں میں صرف ایک کا اور ذکر کروں گا۔ یعنی ہُرمز بن شاہ پور شاہ ایران کا قصّہ جو ہرمز و بن شاہ پور کے نام سے مشہور ہے۔ یہ وہی شخص ہے جس نے مذہب مانی کو فروغ دیا۔ اہل مشرق مانی کو بہت بڑا مصوّر اور شعبدہ باز خیال کرتے ہیں۔

علاوہ ان قصوں کے جو اسلامی مشرق میں مقبول و معروف ہیں۔ چند ہندی قصّے بھی جنہیں ہندوستانی شعرا نے فراموش نہیں کیا۔ مثلاً شکنتلا کا دلفریب قصّہ، جو ڈراما کے تتبّع میں نہیں لکھا گیا بلکہ مہابھارت کے اصل قصے پر لکھا گیا ہے۔ میں نے اس کا ترجمہ ہندی سے کیا ہے (دیکھو ریویو اورنیٹل بابت ۱۸۵۲ء) مجھے اس قصے پر ہندوستانی میں چار کتابوں کا علم ہے۔ ایک نواز کا جسے فرخ سیر نے کبیشر کا خطاب دیا دوسرا کاظم علی جوان کا۔ تیسرا شکنتلا ناٹک جو کلکتہ میں ۱۸۰۲ء میں شائع ہوا اور ڈاکٹر گلکرسٹ کے رومن طریقے پر لاطینی حرفوں میں طبع ہوا۔ چوتھا غلام احمد کا جو ۱۸۴۹ء میں کلکتہ میں چھپا اور جس کا خلاصہ جرنل ایشیاٹیک بابت ۱۸۵۰ء میں شائع ہوا اور پانچواں ایک پارسی مصنف (بومن جی دوساجی) کا جس کا ذکر میں دوسری جگہہ کر چکا ہوں۔

اسی قسم کے قصوں میں ایک پدماوتی کا قصّہ بھی ہے وہ بادشاہ سیلون کی بیٹی تھی اور اس کی شادی چتوڑ کے راجہ رتن سے ہوئی تھی جسے علاء الدین نے ۱۳۰۳ء میں شکست دی تھی۔ ہندوستان کے قصہ نویس جائسی نے اس قصے کو نظم میں آب وتاب سے لکھا ہے اور اس قصّے میں فاتح کے ہاتھوں سے بچنے کے لئے پدماوتی ایک ہزار عورتوں کے ساتھ ستی ہوجاتی ہے۔ لیکن برخلاف اس کے جبل نے جو ہندی قصے کا مصنف ہے، اسے آگ کے نذر نہیں کیا بلکہ وہ اسلامی فوج کے سردار کو اس طرح دھوکا دیتی ہے

کہ سات پالکیاں ساتھ لے کر جاتی ہے جس میں بڑے کے مشہور گھوڑے کی طرح، راجپوت سپاہی سوار تھے اور وہ بے خبری میں مسلمانوں پر جا پڑتے ہیں اور انھیں شکست دے کر بھگا دیتے ہیں۔

دو اور ہندوستانی شاعروں نے بھی جن کا نام عبرت اور عشرت ہے اس بہادر راجپوت رانی کے قصے کو نظم کیا ہے۔

کرشن کا قصّہ متعدد ہندوستانی نظموں میں بیان کیا گیا ہے ان سب میں بہتر لالچ کی کتاب ہے جو فرانسیسی میں بھی ترجمہ ہو گئی ہے۔ اس پر بھوپتی اور کرشن داس اور لال نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ لال کی کتاب پریم ساگر ہندی ادب میں بہت قابل قدر کتاب ہے۔ اس میں نثر کے ساتھ نظم بھی جابجا پائی جاتی ہے۔ جس سے کتاب کا لطف بڑھ جاتا ہے۔

رام کے قصے نے والمیکی کی بدولت صرف سنسکرت ہی میں شہرت حاصل نہیں کی بلکہ ہندی میں بھی متعدد شاعروں نے اس کی داد دی ہے جن میں سے ایک تلسی داس ہے۔ تلسی کی راماین ۱۵۸۰ء سے قبل کی ہے اور اب بھی اہل ہند میں غالباً والمیکی سے زیادہ مقبول ہے۔ کیشو داس نے اس قصے کو رامچندریکا کے نام سے کہا ہے۔ یہ گویا دوسری راماین ہے۔ جس کی شرح جھگن لال نے لکھی ہے۔ سورچند اور دوسرے بہت سے ہندی شاعروں نے بھی اپنا زور قلم دکھایا ہے یہ قصّہ گو رسیو کی تصنیف اور ایم نوشے کے ترجمہ کی بدولت یورپ بھی پہنچ گیا ہے۔

اگرچہ ان تمام قصّوں کی بنیاد تاریخ ہے تاہم تخیل کی گلکاری سے خالی نہیں۔ اب ہم اُن فسانوں کا ذکر کرتے ہیں جو بالکل خیالی ہیں۔ ان میں ایک کامروپ کا قصّہ ہے۔ مختلف ہندوستانی مصنفوں نے اسے نظم اور نثر دونوں میں لکھا ہے۔ نظم میں تحسین الدین، ضیغم، آرزو، حسن، سراج نے طبع آزمائی کی ہے۔ نثر میں کندن لال نے اس قصے کو لکھا ہے جس کا نام "دستورِ ہمت" یا "ہمت" ہے اور یہ ایک فارسی شاعر کی طرف اشارہ ہے جس کی تقلید مصنف نے کی ہے۔ کہتے ہیں کہ سندباد کا قصہ اسی سے لیا گیا ہے جو الف لیلہ میں داخل ہو گیا نیز سینٹ برینڈین کے قصے کی اصل بنیاد بھی یہی ہے جو میری آف فرانس نے لکھا ہے۔ ہندوستانی کے مشہور خیالی فسانے یہ ہیں۔ نل و دمینتی (نل ودمن) جو یورپ میں زیادہ تر "نہا بھارت

کے نلوس کے" نام سے مشہور ہے، اس قصے کو بہت سے ہندوستانی شاعروں نے لکھا ہے۔ لیکن سب میں مشہور ہندی کے نامور شاعر سورداس کی نظم ہے۔ اس کے بعد بنگال کے میر علی کی تصنیف ہے جو "بہار عشق" کے نام سے موسوم ہے۔ حال میں لکھنؤ میں اسی قصے کو احمد علی نے بھی لکھا ہے۔

گلِ بکاولی ایک پر لطف قصہ ہے اس میں ہندی تعلیم کے ساتھ قرآن کی تعلیم بھی ملی جلی پائی جاتی ہے یہ بات ہندوستان میں عام ہے اور جدید ہندوستانی ادب کی نئی خصوصیت ہے۔ اس قصے کا تذکرہ میں نے نہال چند کی کتاب سے جس میں نظم و نثر دونوں پائی جاتی ہیں، جرنل ایشیاٹک بابت ۱۸۳۶ء میں کیا ہے۔ اسی کو نسیم نے نظم میں لکھا ہے جو آگرہ کالج میں پروفیسر تھا۔ یہ مثنوی گلزار نسیم کے نام سے مشہور ہے۔ ایک اور شاعر نے اسی قصے کو نظم کیا ہے اور اس کا تاریخی نام "تحفہ مجلس سلاطین" رکھا ہے اس سے ۱۱۵۱ہجری (۳۹-۱۷۳۸ء) نکلتا ہے۔ ریحان نے بھی ایک مثنوی "خیابانِ ریحاں" کے نام سے لکھی ہے یہ نظم دوسروں کی نسبت زیادہ مشہور ہے۔ یہ چالیس ابواب میں ہے اور ہر باب کا نام اس نے "گلگشت" رکھا ہے۔ ڈاکٹر سپرنگر کو لکھنؤ کے توپخانے میں اس قصے کا ایک قلمی نسخہ ملا جو دکھنی زبان میں تھا اور ۱۰۳۵ھ (۲۶-۱۶۲۵ء) میں تصنیف ہوا تھا۔

ہیر اور رانجھا۔ یہ پنجابی قصہ ہے جسے میں نے ایک نثر کی کتاب سے ترجمہ کیا۔ اس میں جگہ جگہ اردو فارسی اشعار بھی ہیں مصنف اس کا مقبول ہے یہ حال کا شاعر ہے۔ اسی نام کا ایک دوسرا شاعر بھی ہوا ہے لہذا دونوں میں امتیاز کرنا ضروری ہے۔

سسی پنوں۔ یہ قصہ بھی ہیر رانجھے سے ملتا جلتا ہے اُسے بھی مقبول نے نثر میں لکھا ہے اور محبت نے اسے نظم کیا ہے اور ہندو مصنفین اندرجیت منشی اور رانت پرکاش وغیرہ نے فارسی میں لکھا ہے۔

پھولبن اور اس کے عاشق تیلا شاہ کا قصہ۔ اسے کئی دکنی شاعروں نے نظم کیا ہے۔ محمد ابراہیم مترجم دکھنی انوار سہیلی کے قول کے بموجب غوری کی نظم بہت مشہور ہے۔

گل وصنوبر۔ مجھے اس قصے کے چھ نسخوں کا علم ہے ایک احمد علی کا جو خمسہ کا حصہ ہے۔ دوسرا نیم چند کھتری کا۔ تیسرا "گلشن ہند" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ نام اور کتابوں کا بھی ہے۔ چوتھا دکھنی زبان میں جس کا

ایک نسخہ نظام کے کتب خانے میں ہے۔ پانچواں جو لکھنؤ میں ۱۸۴۵ء میں طبع ہوا۔ چھٹا جو کلکتہ میں ۱۸۴۷ء میں چھپا اور جسے مؤلف نے فارسی کا ترجمہ بتایا ہے۔

چار درویشوں کا قصّہ - یہ قصّہ امّن نے لکھا ہے جس کا نام "باغ و بہار" ہے۔ یہ تاریخی نام ہے یہ کتاب ایسٹ انڈیا کے ملکی اور فوجی عہدہ داروں کے نصاب تعلیم میں داخل ہے۔ اس پر دوسرے ہندوستانی مصنفین نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان میں سے ایک عطاحسین تحسین ہے۔ اس کتاب کا نام نوطرز مرصع ہے۔

گرو پرمارتھم کا قصہ - تامل میں مشہور قصّہ ہے۔ لیکن ہندوستانی میں لکھا گیا ہے اور ۱۸۴۸ء میں مدراس میں طبع ہوا ہے۔

بیتال پچیسی اور **سنگھاسن بتیسی** - مشہور قصّے ہیں اور کسی تفصیل کے محتاج نہیں ہیں۔ دھرم نراین لالو، سورت اور کئی ہندی مصنفوں نے ان قصّوں کو لکھا ہے۔

محض یاد دہانی کے طور پر طوطا کہانی کا ذکر کرتا ہوں۔ اصل قصّہ سنسکرت میں ہے۔ اس کے آٹھ مختلف نسخوں سے واقف ہوں اور اسی قدر ہندی اردو اور دکھنی میں ہیں۔ میں صرف نام گنوا دیتا ہوں۔ خاور شاہ، لعل و گوہر، جذب عشق جس کا میں نے خلاصہ ترجمہ کیا ہے۔ نیز مہر و ماہ اور ماہ منور جس کا متن میں نے شائع کیا ہے۔

شاعری

(از جناب محمد عظمت اللہ خاں صاحب۔ بی اے)

The poets eye in a fine frenzy rolling	گوِی کی نفیس آنکھ وارفتہ سی گھومتی
Doth glance from Heaven to earth from earth to Heaven;	نظر ڈالتی ہے زمین پر کبھی آسمان پر
And as imagination bodies forth	تو جوں جوں تخیل میں ڈھلتے ہیں انجانی
The forms of things unknown, the poets pen	اشیاء کے پیکر۔ گوِی کا قلم اُن کی شکلیں
Turns them to shapes and gives to airy nothings	بنا کر مقرر بھی کرتا ہے ان خواب سی
A local habitation and a name.	ہستیوں کا مقام ایک بستے بسانے کو ایک نام۔

Shakespeare:
Midsummer Night's Dream.

انسان کی یوں بھی دو قسمیں ہو سکتی ہیں ایک وہ جو سخن گو ہیں دوسری وہ جو سخن فہم ہیں۔ نرے سخن گو کا ہی وجود ہوتا تو اس میں شک نہیں کہ وہ پرندوں کی طرح شعر الاپتا رہتا لیکن کوئی سننے اور سمجھنے والا نہ ہوتا تو بیچارہ شاعر اپنا سا مُنہ لے کر رہجاتا اور اس کے شعر پرندوں کے سریلے بولوں کی طرح ہوا کی نذر ہو جاتے، شاعر کے وجود کے ساتھ سخن فہم نوع کا ہونا لازمی ہے۔ لیکن اس کا عکس صحیح نہ ہوگا سخن فہم طبقہ کے موجود ہونے کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ شاعر پیدا کر سکے۔ شاعر اپنے وقت پر پیدا ہوتا ہے خواہ سخن فہم نوع اس کے استقبال کے لئے موجود ہو یا نہ ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نوعِ انسان

کی گوناگوں اقوام میں شاعر زیادہ قابل احترام سمجھا گیا ہے۔

جب کسی قوم میں وہ کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے جسے ترقی کہا جاتا ہے تو اس قوم کی ادبی دنیا یعنی سخن فہم طبقے میں ایک خاص گروہ پیدا ہونے اور ارتقا پانے لگتا ہے۔ اس گروہ کا پُرانا نام سخن سنج اور جدید لقب نقاد ہے۔ اس گروہ کا پیشہ یہ ہوتا ہے کہ شعرا کے کلام کو سخن سنجی کی ترازو میں تولے اور تنقید کی کسوٹی پر کسے۔ اس گروہ سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ تنقید کیا ہے ؟ تو اس میں شک نہیں کہ اس گروہ کے سربرآوردہ اصحاب بہت کچھ اصول اور قوانین تنقید پر لکھ ماریں گے مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ آپ اور میں خاک نہ سمجھیں۔ ادبیات کی ارتقا کے ساتھ ساتھ یہ تنقید پیشہ گروہ اس قدر قلم اور زبان کے زور سے ادبی دنیا پر چھا سا جاتا ہے کہ شاعر بیچارے اس سے اتنے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ اُس کی تیوری کے ذرا سے بل پر جان سی نکل جاتی ہے اور اس کی جھوٹ موٹ کی مسکراہٹ سے جان میں جان آجاتی ہے۔ جس طرح ہندوستان میں بنیئے نے کسان بیچارے کو جونک بن کر اپنے قابو میں کر رکھا ہے، اسی طرح یہ سخن سنج گروہ شاعروں اور نثر نگاروں کو اپنے چنگل میں لے لیتا ہے۔

نقاد لوگ صرف یہ سمجھتے ہی نہیں بلکہ جوش میں آ کر بعض اوقات لکھ بھی جاتے ہیں کہ شاعر ہونا آسان ہے لیکن سخن سنج ہونا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ یہ ایک پُرلطف دعویٰ ہے اور بعینہ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک آیا یہ کہے کہ ماں بننا سہل ہے بچوں کا پالنا پوسنا بچوں کا کھیل نہیں۔ نقاد بیچارے کو آنّا کا رتبہ بھی حاصل نہیں ہے اس لئے کہ اوّل تو شاعر طبعزاد دودھ پیتے ہی نہیں اور اگر عالم وجود میں آنے سے قبل اُن کی پرورش بطن شاعری میں کسی قسم کی ذہنی غذا سے ہوتی بھی ہے تو وہ اُن شعرا کے کلام سے ہوتی ہے جو اُس شاعر کے پیشرو یا ہم عصر ہوتے ہیں۔ یہ سب صحیح ہے لیکن پھر بھی نقاد کا وجود بالکل بے معنی اور بیکار نہیں۔ نقاد ایک طرح کا ترجمان ہوتا ہے اور شاعر کا خاص طور پر مطالعہ کر کے عامۃ الناس کو شاعر سے روشناس کراتا ہے۔ شاعر کے جواہر پاروں کو کھود کھود کر نکالتا اور دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ کام بھی اگر اس ہمہ گیر نظر اُن تھک محنت اور مذاق سلیم کے ساتھ کیا جائے جو سینٹ بیوے (Sainte Beuve) کی خصوصیات تھیں تو ظاہر ہے کہ ایسے کام سے عامۃ الناس

شاعر کے کلام سے زیادہ سبق اور مسرت حاصل کر سکتے ہیں۔ اُردو کی دنیائے ادب میں اس ناچیز راقم کا خیال ہے کہ ابھی تنقید کی صحیح ٹیکنک والے لوگ پیدا ہوئے ہیں اور خدا کرے جب ایسے لوگ پیدا ہوں تو وہ تنقید کی قوت کو اُردو ادب کی رکاوٹ میں نہیں بلکہ ترقی میں صرف کریں۔

شاعر ماں کے پیٹ سے شاعری کا عطیہ لاتا ہے اور اگر شاعر یہ نہ بیان کر سکے کہ شاعری کیا ہے ؟ تو اس کی شاعری میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں پیدا ہو سکتی۔ لیکن نقاد نقاد نہیں ہو سکتا جب تک اپنے دماغ میں اس کو واضح نہ کر لے کہ شاعری کیا شے ہے ؟ لیکن یہ سوال کچھ ایسا پر لطف ہے کہ اس پر صرف نقاد اصحاب نے ہی نہیں بلکہ خود شعرا نے بھی بہت کچھ خیال دوڑایا اور بہت کچھ لکھ ڈالا، اس مسئلہ پر وہی مثل صادق آتی ہے جتنے منہ اتنی باتیں اور پھر شاعروں اور نقادوں کی باتیں ! اگر ان سب باتوں کو کوئی صاحب ہمت مؤلف مختلف زبانوں سے لے کر اکٹھا کر دے تو بلا مبالغہ کسی قسم کے حواشی نوٹ مقدمہ دیباچہ اور تمہید کے یہ باتیں کئی جلدوں میں بھی نہ سما سکیں۔

بات یہ ہے کہ اس مسئلہ کا قطعی جواب تو اسی وقت ہاتھ آئیگا جب یہ مسئلہ حل ہو جائے کہ "جان کیا ہے"؟ شاعری خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو کچھ ایسی چیز ہے کہ ہمارے سانس کے ساتھ ہے، انسان کا سانس انفرادی زیست کے لئے جتنا ضروری ہے اتنا ہی سماجی زندگی کے لئے انمول ہے اس لئے کہ زبان سانس کا کھیل ہے بغیر زبان کے زندگی ممکن ہے مگر وہ انسانی زندگی نہیں۔ زبان شاعری ہے۔ یعنی اگر شاعری نہ ہو تو زبان ممکن ہی نہیں۔ جن اصحاب نے لسانیت کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ زبان شاعری ہے اور ہر زبان کے الفاظ ابتداءً شاعرانہ تخیل کے کرشمے ہیں جن کو مانجھ مونجھ کر اور جن سے طرح طرح کے معنی وابستہ کر کے نامعلوم اور بے گنتی شعرا نے اس قابل کر دیا ہے کہ آج اس زبان کے بولنے والے اُن الفاظ کو روز مرّہ زندگی اور ادبی ضرورتوں کے لئے بے تکلف لکھتے اور بولتے ہیں[۱]۔

بہر پھر کر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاعری کیا ہے ؟ اس پر راقم اپنا خیال آگے چل کر ظاہر کرے گا لیکن فی الحال اگر آپ اس بات کو مان لیں کہ شاعری کی جان تشبیہ ہے تو پھر اس کا مان لینا کہ شاعری کے بغیر

---

[۱] ملاحظہ ہو باب دوم "زبان شاعری ہے" "Words and their ways in English Speech" از گرینا ف اینڈ کٹ ریج (میکملن)

زبان کسر سے ممکن ہی نہیں کچھ زیادہ مشکل نہیں رہتا۔ وحشی سے وحشی لوگوں کی بول چال میں بھی تشبیہ کا ہونا اسی طرح لازمی ہے جس طرح عشق و محبت کا ان وحشی دلوں میں گھر کرنا ناگذیر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وحشی قبائل میں میرؔ اور غالبؔ کی سی منجھی منجھائی جچی تلی تشبیہ اور نورجہاں اور جہانگیر کی سی الفت کا لطیف اور شائستہ افسانہ نہ ہو۔

لیکن پھر سوال وہ کا وہی رہا کہ شاعری کیا ہے؟ ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اس کا جواب اور ایسا جواب جس پر سب آمنّا صدّقنا کہہ اٹھیں کوئی نہیں۔ البتہ شاعری کے متعلق میرا جو اپنا خیال ہے، اسی قارئین کرام کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ بہت آسان تھا کہ بڑے بڑے لوگوں نے ارسطو سے لے کر لفکاڈیو ہرن (Lafcadio Hearn) تک اور ابن رشیق سے لے کر مولانا حالی تک شاعری کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اس کو نہایت اطمینان اور مزے کے ساتھ دہرا دیا جائے، اس طرح ایک طرف تو مضمون پھیلتا جاتا اور دوسری طرف یہ سہولت ہوتی کہ میری انگلیاں تو دکھتیں لیکن دماغ آرام میں رہتا اس لئے کہ میں دوسروں کا سوچا لکھتا جاتا۔ مگر میں نہ اپنی انگلیاں زیادہ دکھانی چاہتا ہوں نہ دماغ۔ میں شاعری کی بے گنتی تعریفوں میں سے صرف ایک کو یہاں دُہراؤں گا یہ تعریف مسٹر اے سی براڈلی (A. C. Bradley) نے اختیار کی ہے اور وہ آکسفورڈ کی جامعہ میں شاعری کے پروفیسر ہیں۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ یہ تعریف پروفیسر صاحب کی طبع زاد ہے۔ پروفیسر بہت کم طبع زاد باتیں لکھتے ہیں۔ ان کا مطالعہ اس قدر وسیع ہوتا ہے کہ اُن کے قلم یا زبان سے جو کچھ جان بوجھ کر یا انجانی سے نکل پڑتا ہے اس کا حوالہ کسی نہ کسی کتاب میں ضرور ہوتا ہے وسیع مطالعہ والے حضرات کچھ ہیٹے سے ہو جاتے ہیں اور اسی کو بڑا تیر مارنا سمجھتے ہیں کہ جو جواہر پارے ادب میں موجود ہیں اُن ہی کو الٹ پھیر کر بیان کر جائیں۔ بہرحال یہ تعریف اگر الفاظ کا خیال نہ کیا جائے تو پروفیسر صاحب کی نہیں بلکہ شکسپیر کی ہے یہ ممکن ہے کہ شکسپیر نے بھی کہیں سے اڑالی ہو۔ جس طرح وہ اپنے کھیلوں کے ڈھانچ (پلاٹ) بے تکلف اوروں سے لے لیا کرتا تھا۔ مگر اس کی تحقیق اول تو مشکل اور دوسرے بے ضرورت البتہ شکسپیر کے متعلق اتنا خیال رہے کہ وہ نہ تو وسیع مطالعہ کا انسان تھا۔ یونہی سی لاطینی اور برائے نام یونانی جانتا تھا، اور نہ اس کے زمانہ میں برساتی کیڑوں کی طرح کتابیں تھیں اور

نہ لکھنے والے۔

خیر اب شاعری کی اس تعریف کو ملاحظہ فرمائیے۔ شکسپیر کے سندر الفاظ کا بھونڈا ترجمہ اس مضمون کی پیشانی پر دیدیا گیا ہے۔ مسٹر براڈلی کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:-

"شاعری تخیلی پیکروں کا پیدا کرنا ہے" "Poetry is the creation of imagery."

اتنی دیر تک اس تعریف کا انتظار قارئین کرام نے جن امیدوں کے ساتھ کیا ہوگا اس کے بعد یہ تعریف مجہول بالمجہول سے ضرور مایوسی ہونی چاہیئے۔ مگر کیا کیا جائے مجبوری ہے۔ انسان کی تعریفات مجہول سی ہی ہوا کرتی ہیں یہ عجیب لطیفہ ہے کہ جو چیزیں سمجھنے کے قابل ہیں اور اس عالم پر اسرار کی پہیلیاں بوجھنی بہت ضروری ہیں وہیں انسان کی منطق جواب دے دیتی ہے وہیں انسان الجھی الجھی سی باتیں بنانے لگتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کا نفس بھی کولھو کا بیل ہے آنکھوں پر اندھیری پڑی ہوئی ہے اور ایک دائرہ میں چکر کھاتا رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے چکر کھانے کو اندھیری کی وجہ سے آگے بڑھنا تصور کرلے۔

غرض اس شاعری کی تعریف کو پڑھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تخیل کیا ہے؟ اس سوال کے جواب دینے کے یہ معنی ہوں گے کہ قارئین کرام کو نفسیات کی بھول بھلیاں میں ڈال دیا جائے اور پھر اگر آپ کہیں یہ پوچھ بیٹھیں کہ نفس کیا ہے تو پھر اس مضمون کا خدا ہی حافظ ہے۔ نفس کے سمجھانے کو ضخیم جلدیں درکار ہیں اور پھر بھی یہ ناچیز تو کوئی چیز نہیں۔ بڑے بڑے دماغ بھی نہیں سمجھا سکتے تو اب یہ مضمون اسی طرح آگے چل سکتا ہے کہ آپ تخیل اور نفس کی تعریف اور توضیح کے طالب نہ ہوں۔

تخیلی پیکروں کا پیدا کرنا شاعری ہے۔ پیدا ہونے کی بہترین مثال افزایش نسل ہے۔ نر اور ناری دونوں جانب سے مادی اور نفسی عنصر میل کھاتے ہیں اور اس میل کا جو نتیجہ ہوتا ہے وہ ایک تیسری شے ہوتی ہے یعنی یہ کہنا بجا ہے کہ بچے میں ماں باپ دونوں کا حصّہ ہے دونوں کے حصّے کیا بلحاظ مادہ اور کیا بلحاظ نفس مل جل کر ایک نئی چیز بن جاتے ہیں بچہ ایک جداگانہ مستقل ہستی ہوتا ہے۔ یہ تصور ہے پیدائش کا اب ادبیات کے میدان میں اس تصور کو نظر کے سامنے رکھ کر خیال دوڑائیے کہ یہاں پیدا کرنے کا کیا مفہوم

ہو سکتا ہے ۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ ادب میں جو چیزیں پیدا کی جاسکتی ہیں وہ گوشت پوست سے مستغنی ہوتی ہیں ۔ ایک مثال لے لیجئے ۔ مولانا نذیر احمد نے اصغری' کو ادبی ہستی دی ہے ۔ اصغری ایک ایسی ہستی ہے جس نے گوشت پوست میں کبھی جنم نہیں لیا ۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مولانا نے جو اصغری پیدا کی ہے وہ اُس طرح نہیں پیدا کی جس طرح اُن کی اولاد پیدا ہوئی یعنی مولانا کے دماغ نے بغیر کسی بیوی کے اصغری کو پیدا کیا ۔ اب آپ کے یہ ذہن نشین ہو گیا ہوگا کہ افزایش نسل کے لئے نر اور ناری کا یکجا ہونا اٹل ہے ۔ ادبی ہستیوں کے لئے اس قسم کی یکجائی ضروری نہیں ۔ اور یہی وجہ ہے کہ مولانا کی اصغری محض ایک تخیلی پیکر ہے ۔ لیکن اس تخیلی پیکر کی خوبی یہی ہے کہ اس میں گوشت پوست کے سوا اور ساری باتیں ویسی ہی ہوں جو جیتے جاگتے سانس لیتے انسانوں میں ہوتی ہیں ۔ اصغری کا احوال ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی واقعی ایک شریف بیوی کی سوانح عمری ہے جو کسی زمانہ میں گزر چکی ہے اس مادی دنیا میں سانس لے چکی ہے ۔ اُس کی بات چیت اس کی چال ڈھال اس کے طور طریقے اس طرح بیان کئے گئے ہیں، اُن میں اس طرح جان پھونکی گئی ہے کہ اُن کو پڑھ کر ہمارے تخیل کے پردے پر ایک تصویر کھنچ جاتی ہے اور تصویر بھی ایسی ہستی کی گویا ہم نے کبھی اس کو اپنی آنکھوں دیکھا ہے ۔

اگر آپ اس تفہیم سے اُکتا نہ گئے ہوں تو میری خاطر اس پہلو سے بھی غور فرمائیے کہ ہم اپنے ہم جنسوں کو دورانِ زندگی میں دیکھتے بھالتے ہیں ۔ اُن میں اپنے گھر والے رشتہ ناتے والے دوست احباب ملنے جلنے والے بھی ہوتے ہیں جن سے ہمیں زیادہ ملنے جلنے کا موقع ملتا ہے اور ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جن سے سرسری شناسائی یا عارضی روشناسی ہو جاتی ہے یہ جتنی صورتیں ہم دیکھتے ہیں ۔ اُن میں سے بعض واضح اور گہری ۔ بعض موہوم اور سطحی ہمارے تخیل کے صفحات پر مرتسم ہو جاتی ہیں موہوم سی صورتیں اگرچہ وہ گوشت پوست والے چلتے پھرتے انسانوں کی سی کیوں نہ ہوں، بسا اوقات ہمارے تخیل کے صفحہ پر سے اڑ جاتی ہیں ۔ اب اس قوت کو ملاحظہ کیجئے کہ کسی شخص کا سرے سے گوشت پوست والا وجود ہی نہیں مگر ایک خلاق دماغ اپنے تخیل کے جادو سے اس کی تصویر کھینچتا ہے اور اصغری بالکل ایسی معلوم دیتی ہے کہ گویا کسی اپنے رشتہ کی دیکھی بھالی ہوئی کا نقشہ سامنے

رکھا ہے۔

اس بیان سے تخیل کی دو صورتیں ظاہر ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ آپ نے ایک اصلی انسان کو دیکھا اور اس طرح کافی غور سے دیکھا کہ جب اس کی صورت بھی سامنے نہ ہو وہ موجود بھی نہ ہو تو اس وقت بھی آپ کا تخیل دماغ میں اس کی صورت پیش کر سکتا ہے تخیل کی دوسری قوت یہ ہے کہ مولانا نذیر احمد نے ایک فرضی عورت کو تخیلی پیکر دیا اور اس طرح دیا کہ ان کے الفاظ نے آپ کے تخیل کے پردہ پر بھی بن گوشت پوست والی ہستی کے باوجود بھی ایک ایسی تصویر کھینچ دی جیسی اپنے کسی خاص عزیز قریب یا مخلص دوست کی جس سے آپ بے تکلف ملتے جلتے ہوں جس کے دل کی باتیں آپ پر روشن ہوں جس کے رجحان اور جذبات سے آپ بخوبی واقف ہوں اور آپ کے دماغ پر سے یہ تصویر ایک دفعہ کھینچنے کے بعد پھر کبھی محو نہیں ہو سکتی۔

اُردو ابیات کے میدان نظم میں ایسا کیرکٹر جو اصغری کی طرح جیتا جاگتا ہو مجھے نہیں ملا۔ اُردو میں ڈراما (ناٹک) کے رواج نہ پانے سے نظم میں کسی شخص کے خیالی پیکر کے پیدا کرنے کا ایک زبردست شعبہ گویا مفقود ہی رہا۔ دوسرے یہ ستم ہوا کہ ہمارے شعرا کو پریشاں گوئی اور ریزہ خیالی کی کچھ ایسی لت سی پڑ گئی کہ مسلسل نظم کا لکھنا نہ صرف دوبھر ہی ہو گیا بلکہ مانے ہوئے اُستادانِ فن کے بھی قابو کی بات نہ رہی۔ یہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ شاعری کی جان تخیلی پیکروں کا پیدا کرنا ہے اور اسی لئے ہر شاعر میں جو دراصل شاعر ہو خواہ وہ ردیف وقوافی کی زنجیروں میں بندھا ہو۔ بھانت بھانت کی پردیسی بحروں میں جکڑا ہو خواہ غزل کے خواب پریشاں میں مبتلا ہو اور غیر مسلسل تک بندی کی بھول بھلیاں میں قید ہو تخیلی پیکر پیدا کر ہی لیتا ہے۔ اس قسم کے تخیلی پیکر مصوّر کی تصویر کے مماثل ہوتے ہیں اُن میں پوری طرح جان نہیں پڑتی۔ اس کی بہترین مثال ناچیز راقم کی رائے میں میرحسن والی ذیل کی تصویر ہے میرحسن واقعی شاعر تھے اور ان کی اس تصویر میں نری ایک چوکھٹے والی بے جان سی تصویر ہی نہیں پائینگے بلکہ اس میں چلت پھرت آپ کو ملے گی اور اس طرح ایک حد تک کچھ جان سی پڑی ہوئی نظر آئیگی اُردو کے مشہور و معروف سراپا بھی اس تصویر کے سامنے بے جان سے ہیں ان تمام سراپاؤں کے

پڑھنے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواب میں موہوم سی دیکھی ہوئی صورت کا خاکا کھنچا جا رہا ہے۔ لیکن ٹھامٹا بھیانک سا جیسے ہمارے بعض اُردو اخباروں میں تصاویر دی جاتی ہیں۔ بہر حال میرحسن نے بینظیر اور بدر منیر کا آمنا سامنا کرا دیا ہے اور

"گرے دونوں آپس میں ہو کر اسیر"

"ستارہ سی وہ دلربا" نجم النسا گلاب چھڑکتی ہے دونوں ہوش میں آتے ہیں۔ شہزادہ تو وہیں رہ گیا نقش پا سا بھچک۔

لیکن بدر منیر وہاں سے لجا کر اِٹھلاتی ہوئی بارہ دری کی طرف بھاگتی ہے۔ اور میرحسن فرماتے ہیں۔

کہ وہ نازنیں بھی جھجک منہ چھپا کمر اور چوٹی کا عالم دکھا
چلی اس کے آگے سے منہ موڑ کر ....
وہ گُدّی وہ شانے وہ پشت و کمر وہ چوٹی کا کولے پہ آنا نظر
....
وہ کنگھی وہ چوٹی کھنچی صاف صاف کناری کا پیچھے چمکتا موباف
کہوں اس کی چوٹی کا کیا رنگ ڈھنگ کہ جوں آخری شب ہو جھمکے کا رنگ
نمایاں ہو یوں اوڑھنی سے جھلک کہ جو ابر میں برق کی ہو چمک
....
وہ پنیھ اس کی شفاف آئینہ ساں تس اوپر وہ چوٹی کا پڑنا وہاں
.... کہ جوں ہوئے دریا پہ کالی گھٹا

جن الفاظ سے تصویر کھینچی ہے وہ یہ ہیں۔

"کمر اور چوٹی کا عالم دکھا"

اور اس مصرع کی بھی جان "عالم" ہے۔ "وہ چوٹی کا کولے پہ آنا نظر" یہ تصویر کو اور واضح کرتا ہے اور "کناری کا پیچھے چمکتا موباف" تصویر کو روشن کرتا ہے، اوڑھنی میں سے جھلک اور برق کی ابر

میں سے چمکنے کی تشبیہ نے تصویر کو مکمل کر دیا اور اس میں سرعت پیدا کر دی۔ بدر منیر کے دور نکل جانے پر پیٹھ کی شفاف سطح پر چوٹی کا لہرانا سمندر پر دو کالے بادلوں کی ایک پٹی کا ہچکولے کھانا ایک دل فریب تشبیہ ہے اور اس سے یہ تصویر دلکش ہو جاتی ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ تخیلی پیکر کسی انسان کا کیرکٹر یا انسان کی مصور والی تصویر ہی ہو، صبح شام کے سورج کی روشنی کے رنگ برنگی قوس قزحی نظارے، پہاڑوں کے اتار چڑھاؤ، ابھار اور ڈھلاؤ سمندر کا سانس لینا، سیہ موجوں کا پہاڑوں کی طرح ابھرنا، بادلوں کی طرح پھیلنا، ندیوں کا سانپ کی طرح لہرانا، جھیلوں کا آنکھیں پھاڑ کے ستاروں کا تکنا، زمین کا نشیب و فراز درختوں کے جھنڈ، گھانس کا لہلہانا، موسموں کی بہاریں، غرض فطرت کا ہر منظر سہاونا یا ڈراونا، سماج کا مدو جزر، انسانی تعلقات کی پیچیدگیاں، اقتصادی بلندیاں اور پستیاں، سیاسی سکون اور تلاطم، صداقت پر قربانیاں، گندم نما جو فروشیاں، نفس کی کیفیتیں، جذبات کا جوار بھاٹا، خواہشات نفسانی کا حیرتناک کھیل، غرض فطرت انسانی کا انفرادی اور اجتماعی ہر رنگ شاعر کی مصوری کے لئے ایک زبردست موضوع ہے۔ فطرت کے بے گنتی روپ انسان اور سماج کے بے شمار سوانگ ان سب کی تصویر کھنچ سکتی ہے، ان کو تخیلی پیکر دیا جا سکتا ہے۔

پانی سورج کی تمازت سے بخار بن جاتا ہے اور قدرت کا یہ عمل ہر جگہ جاری ہے، سمندر کے سینہ پر، زمین کے مسامات میں، درختوں کے پتوں پر، جنگل کی جھیلوں اور ندیوں میں۔ ہر جگہ پانی صورت بدلتا رہتا ہے اور پھر کرۂ ہوا کے بلند اور سرد طبقوں میں، بادل کے بھیس میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ایک قدرت کا روزانہ کرشمہ ہے، شیلی (Shelly) نے 'بادل' کے نام سے ایک لی رِک نظم لکھی۔ یہ نظم لطافت، سریلے پن اور تخیلی پیکروں کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس کے آخری بند کے پہلے چار مصرعوں کا ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔ ایک اعلیٰ شاعر کے اعلیٰ پایہ کے کلام کا ترجمہ دوسری زبان میں ایک کٹھن کام ہے۔ یہ ترجمہ محض اس موقع کے لئے نذر ناظرین ہے۔ اتنا واضح رہے کہ اس نظم میں 'بادل' زبان حال سے گویا ہے۔

I am daughter of Earth and Water ہاں ہاں میں ہوں لاڈلا بیٹا سُندر پرتھی اور پانی کا

And the nursling of the sky امبر نے ہر گودیں پالا

I pass through the pours of the Ocean and shores میں گذرتا ہوں مساموں میں سمندر کے ساحل کے اور

I change but I cannot die. روپ بدلتا پر نہیں مرتا

میں جب ان مصرعوں کو پڑھتا ہوں ۔ شے لِی کے مصرعوں نہ کہ اس ناکافی ترجمہ کو ۔ تو میرے تخیل کی سیرہین کے سامنے ایک دہواں دہار منظر کھل پڑتا ہے ۔ بھاپ کا ہر طرف سے کسی کے کھُلے بالوں کی طرح لہرا لہرا کے اُٹھنا ، ہوا کی اونچائیوں میں بادل بن کر پھولنا اور پھلنا ۔ طرح طرح کی شکلیں ۔ بنا نا ہاتھیوں کی طرح جھومنا ، روئی کے گالوں کی طرح پھٹنا اور ہوا میں بہنا ، کہیں سورج کی کرنوں سے جگر جگر کرنا ، کسی طرف رات کی سی سیاہی لے کر ڈراونا سا بننا اور پھر مینہ کی دھاریں اور وہی پانی کا پانی ۔ یہ ہے تخیلی پیکر جو میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ آخر کا مصرع جس کا ترجمہ میں نے یہ کیا ہے ۔ " روپ بدلتا پر نہیں مرتا " میری اس سب سے گہری خواہش کو کہ میں غیر فانی ہوں ، عجیب موہوم اور لطیف پیرایہ سے ایک ٹہوکا سا دے دیتا ہے ۔

اُردو شاعری میں ایسے مسلسل اشعار جو تصویر کی تصویر ہوں اور حیات انسانی کا تجربہ بھی ہوں ، تلاش کرنے سے ضرور مل جاتے ہیں ۔ لیکن شاعری کے عام رنگ کا زہریلا اثر اس قدر سرایت کر گیا ہے کہ جو شعرا طبعاً اس رنگ کی نظمیں لکھ سکتے تھے ان کو بھی غزل گوئی اور حیات اصلی سے آنکھیں بند کر لینے سے پیشتر محض قافیہ پیما بنا دیا ، جہاں تک اردو شاعری پر نظر دوڑائی جاتی ہے ، تو ایسی نظمیں یا اشعار جن میں تخیلی پیکر کے ساتھ ساتھ اصلیت بھی ہو بڑی مشکل سے ہاتھ آتے ہیں ۔ نظیر اکبر آبادی البتہ ایک ایسا شاعر ہے جس کے کلام میں اس قسم کی نظمیں اور اشعار نسبتاً بہت زیادہ ملتے ہیں مگر یہی وہ شاعر ہے جس کو ہمارے سخنوروں اور سخن سنجوں نے نام دھر دھر کے اس قدر نکو بنا دیا کہ دنیائے اُردو کی مہذب محفلوں سے تقریباً نظیر کے کلام کو خارج کر دیا گیا ہے ۔ لیکن نظیر کو عام حلقہ نے سر آنکھوں پہ لیا اور اس کی نظمیں فقیروں کی زبان سے ہندوستان

کے دور دور گوشوں میں محلوں کی ڈیوڑھیوں غریبوں کی جھونپڑیوں بازاروں اور گلیوں میں گونجتی رہیں۔ یہ تاثیر کے جادو سے بھرا ہوا مصرع کس نے نہیں سنا۔

"سب ٹاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا"

یہ اردو کی انمٹ چیزوں میں سے ہے اور تخیلی پیکر اس قدر جیتا جاگتا اور الفاظ ایسے موزوں اور برجستہ ہیں کہ اردو میں یہ مصرع ایک ضرب المثل سی ہو گیا ہے اور ایک دفعہ کان میں پڑنے کے بعد ممکن نہیں کہ پھر حافظہ سے نکل جائے۔ اس نظم کا ایک بند یہ ہے۔

ہر منزل میں اب ساتھ ترے یہ جتنا ڈیرا ڈانڈا ہے	زر دام درم کا بھانڈا ہے بندوق سپر اور کھانڈا ہے
جب نائک تن کا نکل گیا جو ملکوں ملکوں ہانڈا ہے	پھر ہانڈا ہے نا بھانڈا ہے نا حلوا ہے نا مانڈا ہے
سب ٹاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

اب ریل نے وہ پرانے بنجارے کے ٹاٹھ بھی پڑے رہنے دئے اور اس لئے قارئین کرام کو بغیر خاص مطالعہ اور تخیل پر زور دئے اس بند کا تخیلی پیکر مستحضر نہ ہو سکے گا لیکن شمالی ہند کے جاڑے کی تصویر دیکھئے۔

جب ماہ اگھن کا ڈھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی	اور ہنس ہنس پوس سنبھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
دن جلدی جلدی چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی	پالا بھی برف پگھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
چلا غم ٹھونک اچھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

دل ٹھوکر مار پچھاڑا ہو اور دل سے ہوتی ہو کشتی سی	تھر تھر کا زور اکھاڑا ہو بجتی ہو سب کی بتیسی
ہو شور پھپھو ہو ہو کا اور دھوم ہو سی سی سی کی	کلے پر کلا لگ لگ کر چلتی ہو منہ میں چکی سی
ہر دانت چنے سے دلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

ہر ایک مکاں میں سردی نے آ باندھ دیا ہو یہ چکر	جو ہر دم کپ کپ ہوتی ہو ہر آن کڑاکڑ اور تھر تھر

بیٹھی ہو سردی رگ رگ میں اور برف پگھلتا ہو پتھر جھڑ باندھ مہاوٹ پڑتی ہو اور تس پر لہریں لیکر
سنّاٹا باؤ کا چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

اس تصویر کی توضیح کی ضرورت نہیں۔ تصویر صاف اور چلتی پھرتی ہے۔ البتہ "ہنس ہنس پوس سنبھلتا ہو" اور "دن جلدی جلدی چلتا ہو" کس قدر جان ڈالنے والے اور روشن رنگ بھرنے والے اور اہمیت میں ڈوبے الفاظ ہیں۔

ہر اچھے اور اعلیٰ ترین کلام میں تخیلی پیکر کا ہونا لازمی ہے۔ خواہ وہ کلام ایک مصرع یا بیت کی صورت میں ہو خواہ ایک مستقل نظم ہو جس میں بہت سے مصرعے اور طرح طرح کی ترکیبوں سے بند بنائے گئے ہوں۔ اُردو شاعری میں ایسی ابیات بہت کم ملیں گی جن میں تخیلی پیکر مخفی ہو یہ ننھی منی تصویریں سی ہوتی ہیں جن کو کلان بیں سے دیکھنے پر مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے۔

میر کے اس شعر کو لیجئے ؂

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا! اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

اس شعر کی ذہنی بندی سے جو نقشہ میری آنکھوں کے سامنے بندھ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک پلنگ پر ایک شخص دراز ہے سوکھ کر کانٹا چہرہ پر زردی کھنڈی ہوئی البتہ منہ کی راہ سے دم نکلا ہے اور مردنی چھاگئی ہے۔ ایک سن رسیدہ آدمی جو اس بدنصیب مرنے والے کا کوئی بڑا بوڑھا ہے پلنگ کی پٹی کے پاس کھڑا ہو کر جھک کر اُسے دیکھتا ہے۔ یہ دیکھ کر کہ وہ بدنصیب ہوچکا اپنی ران پر ہاتھ مار کر بول اٹھتا ہے:۔

دیکھا! اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

اس شعر میں "دیکھا" کا لفظ وہ بجلی کا بٹن ہے جس کو دباتے ہی اس شعر والا تخیلی پیکر دماغ میں تصویر کی طرح سامنے آجاتا ہے۔

غالب کا شعر ہے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

یہ ایک نفسیاتی واقعہ ہے کہ جب انسان اپنی آرزوؤں کے پورا کرنے میں ناکامیاب ہوتا ہے تو اپنے ماحول سے اس کا دل اکھڑ سا جاتا ہے، متواتر ناکامیوں سے اس کا جی ہٹیا ہو جاتا ہے اور جس شخص سے خواہ وہ جان پہچان کا ہو یا شناسا نہ ہو دوست ہو یا اجنبی وہ ملتا ہے اُسے یہی خیال ہوتا ہے کہ سب میری ناکامیوں پر دل میں ہنستے ہیں اور میری غیبت میں میرا تمسخر اڑاتے ہیں۔ غرض اس کے دل میں یہ ٹھن جاتی ہے کہ کسی طرح اصلیت سے بھاگ جاؤں۔ اصلیت سے بھاگنا کئی طرح ہو سکتا ہے۔ خودکشی کر لی جائے اپنے مقامی ماحول کو بدل دیا جائے اور کسی اور جگہ سکونت اختیار کر لی جائے یا یہ کہ اپنے حواس کو نشہ کی ترنگوں میں ڈبو دیا جائے اور اس طرح اصلیت کو فراموش کیا جائے اب غالب کا اوپر والا شعر پڑھیئے۔ ایک شخص ہیبت زدہ حال نہ کپڑوں کا ہوش نہ تن کی خبر زیست سے اکتایا ہوا آنکھیں پھٹی پھٹی جن میں لذت حیات کی چمک کے بجائے وحشت اور دیوانہ پن کی سی جھلک ہے پہلو بدلتا بے چین سا بیٹھا ہوا ہے۔ ایک دوست ایک نصیحت کرتا ہے کہ شراب نہ پینی چاہیئے اور جیسی نصیحت کرنے والوں کی عادت ہوتی ہے ایک لمبا چوڑا وعظ کرتا ہے اور عامیانہ استدلال پیش کرتا ہے کہ لہو ولعب اور عیش رانی کو خدا اور رسول نے منع فرمایا ہے وغیرہ وغیرہ جس شخص کو اس طرح نصیحت کی جا رہی ہے وہ کوئی عامیانہ شخص نہیں ہے۔ اس کی نظر نفس کی گہرائیوں پر پڑتی ہے۔ اکتا دینے والے اور وہ بھی مولویانہ وضع کے ناصح کی بڑ کو سنتے سنتے آخر بے تاب ہو کر وہ بیچارا چیخ اٹھتا ہے کہ میں اُسے تعلیم کرتا ہوں کہ مے نوشی بُری چیز ہے روسیاہی کا باعث ہے۔ لیکن میری مے نوشی لہب ولعب کے خیال سے نہیں ہے۔ میں اس دنیا کے آلام و مصائب ناانصافیوں اور ناکامیوں یا ایک لفظ میں اس دردناک اصلیت سے بیزار ہوں میں اُس سے بھاگنا چاہتا ہوں اور اس کی یہ صورت ہے کہ شراب پی کر اس اصلیت اور اپنے آپ کو

بُھلا دینا چاہتا ہوں اور یہ ایسے وقت ہو سکتا ہے کہ مجھ پر دن رات نشہ کا اتنا کیف ضرور رہے کہ اصلیت سے اور خود سے بے خبر سا رہوں۔ میں معمولی شرابیوں کی طرح بدمست اور مدہوش نہیں ہوتا اور نہ ہونا چاہتا ہوں۔

اب زیادہ مثالوں کی نہ تو ضرورت اور نہ اس مضمون میں گنجایش۔ قارئین کرام ہر شاعر کے مطالعہ کے دوران میں ایسی مثالیں پاتے جائیں گے۔ اتنا البتہ ضرور یاد رکھنا چاہئے کہ ہر شعر والا تخیلی پیکر ہر شخص کے لئے من وعن یکساں نہیں ہو سکتا اوپر کی مثالوں میں جو تخیلی پیکر پیش کئے گئے ہیں وہ وہ ہیں جو اس ناچیز راقم کے تخیل کے پردے پر ان اشعار کے مطالعہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ بڑی چیز یہ ہے کہ شعر سے تخیلی پیکر پیدا ہو۔ ہر مطالعہ کرنے والے کے تخیل پر جو تصویر کھچے گی وہ جداگانہ ہوگی اور ہونی چاہئے۔

شاعر کے پاس وہ جادو کی چھڑی جس کے چھوتے ہی "کچھ نہیں" سے تصویروں کا مرقع نکل پڑتا ہے تشبیہ ہے۔ شاعر کے ذہن میں جہاں پھڑکتی ہوئی تشبیہ آئی اور تخیلی پیکر ڈھلنے لگے۔ تیر بہدف تشبیہ کا انتخاب شاعر کی نظر پر منحصر ہے۔ کوئی نہیں سکھا سکتا کہ شاعر کس طرح موزوں تشبیہ تلاش کرے اور چنے۔ یہ نظر ماں کے پیٹ سے ملتی ہے۔ "تشبیہ" کے ذہن میں ابھر آنے کے بعد دوسرا مرحلہ شاعر کا یہ ہوتا ہے کہ اس ذہنی تشبیہ کو جو جگنو کی طرح ذہن میں کبھی موہوم کبھی واضح پھرتی رہتی ہے ایسے الفاظ کا جامہ پہنایا جائے کہ پڑھنے والوں کے تخیل میں جو تخیلی پیکر پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے اُس کو چھیڑ جگائے اور اس طرح شاعر اپنے تخیل کی قوت یعنی تشبیہ الفاظ کی مناسبت سے پڑھنے والے کو مجبور کر دے کہ اس کے تخیل کے پردہ پر بھی ویسا ہی تخیلی پیکر پیدا ہو جائے۔ اعلیٰ شاعر کے کلام کا مطالعہ اسی وجہ سے انمول شے ہے کہ ایسے شاعر کے تخیل کے جادو سے ہمارے تخیل کی پیدا کرنے والی قوت جاگ اٹھتی ہے اور اس دنیا میں پیدا کرنے والی قوت سے کام لینے میں۔ خواہ اس قوت کی جولان گاہ مسہری ہو خواہ ادبیات موجد کی تجربہ گاہ ہو یا مصنوعات کا کارخانہ (ورک شاپ) جو مسرت اور لذت حاصل ہوتی ہے اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی لذت نہیں۔

اب اگر آپ نے شاعری کی اس تعریف کو سمجھ لیا ہے تو گویا اس مضمون کی پہلی قسط کا جو منشا تھا وہ پورا

ہوگیا۔ مجھے اس سے قطعاً بحث نہیں کہ آپ اس تعریف کو تسلیم بھی کریں۔ دوسری قسط میں اس تعریف کی روشنی میں اُردو شاعری پر نظر ڈالنی مقصود ہے اور صرف اتنی استدعا ہے کہ دوسری قسط کے پڑھنے کے دوران میں آپ اس کا خیال نہ فرمائیں کہ جو کچھ اردو شاعری کے متعلق لکھا جائے گا وہ کہاں تک آپ کی شاعری والی تصویر کے مطابق ہے بلکہ آپ کی اس پر نظر رہے کہ جو تعریف شاعری کی اس تحریر میں پیش کی گئی ہے اس کے مدنظر اس ناچیز راقم کے خیالات اُردو شاعری کے بارے میں درست ہیں یا نہیں رہا یہ امر کہ وہ خیالات آپ کے نقطہ نظر سے مغالطہ انگیز ہیں یا مغالطہ سے پاک ہیں ایک بے تعلق سی بات ہے اور مجھے اس سے کچھ سروکار نہیں۔

حامداً و مصلیاً
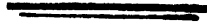
میلاد نبوی صلعم

(از نتیجۂ فکر جناب سید ہاشمی صاحب)

کہیں کہیں نکل آئے ہیں پھول کانٹوں پر
کہ جھاڑیاں ہوئیں گلشن کے نام سے آباد ....
کیا کسی نے نہ خاشاک و خار کو پھر یاد
نفوسِ چند کا اے اہلِ ارض صدقہ ہے   کہ سجدہ گاہ ملائک ہے خاکِ آدم زاد

جھکے ہوئے ہیں ستارے کہ آج کس کے طفیل
ہوئی ہے عرش سے اونچی زمین سفلہ نژاد
علیہ صلِّ و سلِّم و آلہ الامجاد!

مقدمۂ دیوان درد

(از جناب مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی۔ المخاطب بہ نواب صدر یار جنگ بہادر)

کوئی درد آشنا کہہ گیا ہے ؎

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار ز یک ساغر دریں بزم اند سرمست

ولے۔ با بادۂ بعض حریفاں فریبِ چشمِ ساقی نیز پیوست

مشو منکر کہ در اشعارِ ایں قوم ورائے شاعری چیزے دگر ہست

خواجہ میر درؔد علیہ الرحمۃ کے دم قدم سے "ورائے شاعری" مضامین سے اُردو ادب فیضیاب ہوا۔[1]

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں!

عموماً اُردو شاعری کا سرمایۂ ناز حسنِ ظاہر کے انداز ہیں جن میں حسنِ بیان نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ خواجہ صاحب کی چشمِ حق بیں جمال حقیقی کے جلوؤں سے منور تھی۔ وہی نور انکے کلام میں تاباں ہے۔ میر تقی میرؔ لکھتے ہیں۔ "گلچینِ خیال اور اگل معنی دامن دامن"۔ یہی وجہ ہے کہ خواجہ صاحب کے کلام کا پایہ عام شاعری سے بالاتر ہے۔

ادبِ اُردو سید راس مسعود صاحب کے خاندان کی سرپرستی کا برسوں سے منت پذیر ہے۔ سرسید نے اُردو نثر کو "بیان مطالب" کی قوت بخشی۔ نکتہ شناس "پوتے" نے نظم اُردو کی خدمت کی۔ "انتخاب زرین" کی اشاعت سے اُردو نظم کا نام روشن کیا۔ سونے میں سہاگا ڈالا۔ اساتذۂ اُردو کے دواوین خوبی و خوش اسلوبی سے شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ اوسی سلسلے کی ایک کڑی۔ "دیوان درد" بھی ہے۔ شروانی دہقانی مقدمہ نگاری پر مامور ہی۔ عین سعادت کہ خواجہ صاحب کی بزم ادب میں باریابی کا ذریعہ ہاتھ آیا۔ ع

آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

---

[1] دیوان مطبع نظامی بدایوں میں زیر طبع ہے۔

خواجہ صاحب کے حالات

نام خواجہ میر۔ درد[1] تخلص صحیح النسب حسینی سید ہیں۔ آبائی سلسلہ بارھویں پشت میں خواجہ بزرگ بہاؤالدین نقشبندی قدس سرہ سے اور چھبیسویں پشت میں حضرت امام عسکری رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ مادری سلسلۂ نسب حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔
خواجہ صاحب کے والد کی والدہ بھی حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ کی اولاد میں تھیں۔ والد کا نام خواجہ ناصر۔ عندلیب تخلص نانا میر سید محمد حسنی تھے جو بیٹے تھے نواب میر احمد خاں شہید کے۔ نواب صاحب پانی پت کے معرکے میں نادر شاہ کے مقابل میں شہید ہوئے۔ جہانکشائے نادری میں اُنکا ذکر ہے۔ میرزا رفیع سودا کے ممدوح تھے۔ خواجہ صاحب کے نسب کے بیان میں تذکرہ نویسوں نے فاحش غلطیاں کی ہیں۔ ہمارا بیان خواجہ صاحب کے علم الکتاب سے ماخوذ ہے۔ مسکن پرانی دلّی میں تھا۔ اُسی محلہ میں شاہ ولی اللہ صاحب کی بھی سکونت تھی۔ "اُجڑے دیار" کی آبادی و مردم خیزی۔ اللہ اکبر!

خواجہ ناصر صاحب کے والد بخارا سے تحصیل علم کے بعد عہد عالمگیری میں وارد ہندوستان ہوئے تھے۔
خواجہ محمد ناصر صاحب ہندستان میں پیدا ہوئے۔ ابتداءً شاہی منصبداروں میں شامل تھے آخر منصب ترک کرکے یاد الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ حضرت قبلۂ عالم خواجہ محمد زبیر سے بیعت تھے۔ حضرت شاہ گلشن پیر صحبت میں شاہ گلشن کی نسبت خواجہ صاحب ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ اُنکے فارسی کلیات میں دو لاکھ کے قریب شعر تھے

---

[1] اِس تخلص میں ایک خالص لطف ہے۔ حضرت شاہ گلشن حضرت شاہ محمد وحدت گُل کے مرید تھے۔ اب شجرۂ تخلص ملاحظہ ہو۔

شاہ محمد وحدت	گُل
حضرت شاہ سعد اللہ	گلشن
خواجہ محمد ناصر صاحب	عندلیب
خواجہ میر صاحب	درد
خواجہ محمد میر صاحب	اثر

دیکھو "گل" کی جلوہ نمائی سے "ظہور گلشن" ہوا۔ گلشن نے "نالۂ عندلیب" پیدا کیا۔ نالۂ عندلیب سے "درد" جلوہ افروز ہوا۔ درد سے "اثر"۔ ؎ ایں سلسلہ از طلائے ناب ست + ایں خانہ تمام آفتاب ست

فن موسیقی میں کامل مہارت تھی حج سے مشرف ہوئے تھے۔ اُن کی مدح میں فرماتے ہیں ؎

چوں مرقع صد بہار از فقرِ من گُل میکند | در فقیری بہرہ مند از فیضِ شاہ گلشنم

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی روح پرفتوح سے طریقۂ محمدیہ حاصل کیا۔ اُن کی تصنیف "نالۂ عندلیب" کا حجم اٹھارہ سو صفحے کا ہے جس کو آزاد نے "ایک رسالہ" لکھا ہے۔ بزبان فارسی ہے۔ قصے کے پیرایہ میں معارفِ بلند اور مطالب عالیہ بیان فرمائے ہیں۔ موقع موقع پر کثرت سے اشعار درج ہیں۔ وجہ تصنیف خود یہ بیان فرمائی ہے کہ "اکثر آدمی مجھ سے مختلف مطالب اور مسائل دریافت کیا کرتے تھے۔ صوفی طریقت کے جویا تھے۔ مُلّا احکام شرعیہ پوچھتے تھے۔ مثلاً جبر و اختیار کا مسالہ۔ بعض جوان مذہب شیعہ و سنّی کی تحقیق چاہتے تھے بعض اخلاقِ ستودہ کے متلاشی تھے۔ کسی کو عشقِ مجازی کی حکایتوں کا شوق تھا۔ اہلِ عقل کو عقلی پیرایہ کی جستجو تھی۔ اِسی عرصہ میں حضرت قبلۂ عالم نے رحلت فرمائی۔ ادائے تعزیت کے لیے اعزہ اور احباب کا مجمع میرے مکان پر ہوا۔ اُسی موقع پر افسانہ کے پیرایہ میں "بزبانِ ہندی" مطالب بالا کے جوابات خواجہ صاحب نے بیان کئے۔ تین شب و روز یہ صحبت رہی۔ اپنے اپنے مطالب کے جواب پاکر سامعین پر عجب عالم طاری ہوا۔ سامعین مُصر ہوئے کہ اِس افسانہ کو قلمبند کردوں۔ عرصہ تک ٹالا۔ آخر اشارۂ غیبی پاکر فارسی زبان میں لکھدیا۔ طریقۂ تالیف یہ تھا کہ عشا کے بعد مخصوص احباب کے روبرو زبانی بیان کرتا۔ میر درؔد لکھتے جاتے۔ احیاناً وہ نہ ہوتے تو بیدارؔ میرے مرید قلمبند کرتے۔ کبھی وہ بھی نہ ہوتے تو خود میں ہی لکھتا جاتا اس طرح ۱۱۵۳ھ میں یہ کتاب ختم ہوئی۔ "نالۂ عندلیب" نام پایا۔ میر درد صاحب نے تاریخ لکھی ع

نالۂ عندلیب گلشنِ ماست

کتاب کو پڑھو اور کمال اور بیان کی قوت کا اندازہ لگاؤ۔ خواجہ عندلیبؔ صاحب نے ۶۶ برس کے سِن میں شعبان ۱۱۷۲ھ میں رحلت فرمائی۔ رضی اللہ عنہٗ۔

خواجہ میر درؔد ۱۱۳۳ھ میں پیدا ہوئے تحصیل علم اپنے والد ماجد سے کی۔ تفصیل تحصیل نظر سے نہیں گزری۔ لیکن تصانیف شاہد ہیں کہ نقلی اور عقلی علوم میں کامل تھے۔ خصوصاً علم الکتاب کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ تفسیر۔ حدیث۔ فقہ۔ تصوف۔ اور معقولات میں پوری مہارت حاصل تھی۔ ابتدائے شباب میں دنیا دار رہے۔ جاگیر اور معاش کے اہتمام میں پوری تگ و دو کی۔ امرائے شاہی اور مقربان بارگاہ کے ناز اُٹھائے۔ ۲۸ برس کی عمر میں جذبہ

حق نے اپنی طرف کھینچا۔ سب کو چھوڑ کر اُدھر جھکے۔ لباس درویشی پہنکر آستانہ جاناں پر سر جھکا دیا۔ ۳۹ برس کی عمر میں خواجہ عندلیب صاحب کی رحلت کے بعد مسند نشیں ارشاد ہوئے۔ اور آخر دم تک قدم نہ ہٹا۔ مصیبتوں کے دریا چڑھے اور اُترے۔ یہاں پائے استقامت کو جنبش بھی نہ ہوئی۔ انہی مصایب میں "حملۂ نادری" بھی تھا۔ خواجہ صاحب بارھویں صدی ہجری کے اولیائے کبار سے ہیں۔

تصنیف کا شوق ابتدائے عمر سے تھا اور آخر عمر تک رہا۔ پندرہ برس کی عمر میں بحالت اعتکاف رسالہ "اسرار الصلوٰۃ" لکھا۔ اُنتیس ۲۹ برس کی عمر میں رسالۂ "واردات" لکھا۔ رسالہ مذکور ۱۱۷۲ھ میں ختم ہوا۔ اس کے بعد ایک مدت تک اُس کی شرح "علم الکتاب" لکھی۔ علم الکتاب کے بعد "نالۂ درد" لکھا جو ۱۱۹۰ھ میں پورا ہوا۔ میر اثر نے تاریخ کہی۔ ع۔ نالۂ عندلیب دردِ من ست۔ "نالۂ درد" کے بعد ۱۱۹۳ھ میں رسالہ "آہِ سرد" ختم ہوا۔ تاریخ از میر اثر۔ ع
آہِ سرد ما نماید گرمی رفتار ما۔ "آہِ سرد" کے بعد رسالہ "دردِ دل" کی نوبت آئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ رسالہ "شمع محفل" لکھا گیا۔ دونوں کو ساتھ لکھنے کی وجہ یہ تحریر فرمائی ہے کہ "نالۂ درد" اور "آہِ سرد" کی تالیف کے بعد جب رسالۂ "دردِ دل" لکھنا شروع کیا تو خیال آیا کہ اس کے بعد ایک رسالہ "شمع محفل" کے نام سے لکھوں گا۔ مگر چونکہ سن باسٹھ ۶۲ برس کا ہو چکا فرصت مفقود۔ لہذا دونوں کو ساتھ ساتھ لکھنا شروع کر دیا۔ صفر ۱۱۹۹ھ میں دونوں رسالے ختم ہوئے۔

فنِ موسیقی میں خواجہ صاحب کو پورا دخل تھا۔ میاں فیروز خاں گویّوں کا اُستاد حاضر ہو کر فن کے نکتے حل کرتا۔ دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو ہر مہینے میں ایک مجلس سماع مکان پر ہوتی اس طرح کہ قوال بلا طلب حاضر ہو جاتے اور جب تک اُن کا دل چاہتا سُناتے اور چلے جاتے۔ نہ بلائے جاتے نہ روکے جاتے۔ سماع کی نسبت خواجہ صاحب فرماتے ہیں: "سماع من جانب اللہ ست وحق بریں امر ہمہ وقت گواہ کہ خود بخود گویندگاں می آیند و مادام کہ می خواہند می سرایند۔ نہ آنکہ فقیر ایشاں را می طلبد وشنیدن سرود را چوں دیگراں عبادت می فہمد بلکہ ہماں معاملہ نہ انکار میکنم نہ ایں کار میکنم در بیش ست وعقیدۂ من ہماں ست کہ عقیدہ بزرگانِ من ست۔" (نالۂ درد۔ ۳۷)

۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ کو انتقال فرمایا اور اپنے والد ماجد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ تاریخ وفات از بیدار

تاریخ۔ قطعہ

آفتابِ اُمتِ دینِ محمدؐ خواجہ میر ۔۔۔ مظہرِ علم علی و وارثِ اثنا عشر

حضرتِ دردآنکہ از دردِ فراقِ عندلیب | نالۂ یا ناصرش میکرد بر دلہا اثر
حیف گردُنیا بعمر شصت و ہشتم سالگی | جانبِ اعلاء علیئین او کرده سفر
بندۂ بیدار کان ہست از غلامانش یکے | جُست از وقت وصال در روز و ماہش چون خبر
یک پہر شب مانده ہاتف کرد واویلا و گفت | ہائے بود آدینہ و بست و چہارم از صفر

اس تاریخ میں خواجہ صاحب کی عمر اڑسٹھ برس کی لکھی ہے۔ حالانکہ خود خواجہ صاحب کے بیان سے چھیاسٹھ برس معلوم ہوتے ہیں۔ جیساکہ آگے چلکر معلوم ہوگا۔ مزار شہر پناہ کے باہر شاہ جی کے تالاب کے متصل ہے۔ میں بھی فاتحہ خوانی سے مشرف ہوا ہوں۔ والحمدللہ علیٰ ذالک نزع میں یہ مصرع خواجہ صاحب کے زبان پر تھا۔ ع۔ درد ہم جاتے ہیں پر چھوٹے اثر جاتے ہیں۔ میر اثر خواجہ صاحب کے بعد سجادہ نشیں ہوئے۔ یہ سلسلہ خواجہ محمد نصیر متخلص بہ "رنج" تک جاری رہا جو خواجہ صاحب کے نواسے تھے۔ خواجہ صاحب کے صاحبزادے ضیاء الناصر تھے۔ تخلص "الم" تھا۔

تصانیف | بیان بالا سے خواجہ صاحب کی تصانیف کے یہ نام معلوم ہوئے۔ اسرار الصلوٰۃ رسالہ واردات۔ علم الکتاب۔ نالۂ درد۔ دردِ دل۔ آہ سرد۔ شمع محفل انکے علاوہ دیوان فارسی۔ دیوان اُردو۔ جملہ تصانیف بالا شائع ہو چکی ہیں۔

اسرار الصلوٰۃ چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں نماز کے ارکان پنجگانہ کے اسرار سیر سیر کرکے بیان فرمائے ہیں۔

واردات۔ یہ ایک سو گیارہ واردات کا مجموعہ ہے۔ ہر وارد کا نام جداگانہ ہے۔ مثلاً۔ وارد اول "فاتح الواردات" وارد ثانی "نور من اللہ"۔ علیٰ ہذا القیاس۔ وجہ تالیف "واردات" کی یہ ارشاد فرمائی ہے کہ اکثر اوقات غلبۂ حالات میں (جو عبارت ہے شدت مشاہدہ کی حالت سے اور استیلاء تالہ سے) جو معانی دل پر منکشف ہوتے تھے وہ رباعیوں کی صورت میں منظوم ہو جاتے تھے۔ جب یہ رسالہ تمام ہوگیا تو ۱۱۷۲ھ میں خواجہ عندلیب صاحب کی خدمت میں پیش ہوا اور پسند فرمایا گیا۔ رسالۂ واردات میں معرفت و حقیقت کے مطالبِ عالیہ بیان فرمائے ہیں۔ ہر وارد کا ایک دیباچہ ہے۔ اول و آخر رباعی ہے۔ درمیان میں شارحانہ نثر۔ نمونہ۔ وارد اوّل۔

رُباعی اوّل

درخلوتِ ماکہ رنگِ صد انجمن ست | باخویش زباں چو شمع گرم سخن ست

عالم آئینہ خانہ است و ما را — ہر سو کہ اشارت ست با خویشتن ست

رُباعی آخر کی

از فیض تو ہر خرابہ معمور آمد — وز لطف تو ہر غمزدہ مسرور آمد
بختِ سیہش رخت زعالم بربست — ہر سایہ کہ زیر سایۂ نور آمد

وارد دویم۔ رُباعی آخر کی۔

ہستی و عدم خراب میخانہ اوست — امکان و وجوب مست پیمانہ اوست
چشمِ دل تو اگر حقیقت بین ست — ہر ذرۂ خلق روزنِ خانہ اوست

"علم الکتاب" رسالہ بالا کی شرح ہے جو میر اثر کی فرمائش سے لکھی گئی۔ باریک خط کے بڑے بڑے صفحے ۸۴۴ ہیں۔ خواجہ صاحب کے علمِ الٰہی کا تبحر اور کمالاتِ معرفت کی حقیقت اِس تصنیف سے واضح ہوتی ہے۔ جا بجا عربی طویل عبارتیں بے تکلف غایت بلاغت کے ساتھ مثلِ چشمہ رواں ہیں۔ مطالب حقہ کا ہجوم ہے۔ آیات اور احادیث اس روانی اور آسانی سے ہر موقع پر درج ہوتی جاتی ہیں کہ پڑھنے والے کا قلب اُنکے انوار سے پرنور و معمور ہو جاتا ہے سلوک کے مسائل کو آیات و احادیث سے مجتہدانہ اور عارفانہ قوت کے ساتھ ثابت و مدلل فرمایا ہے۔ "نالۂ درد" میں فرماتے ہیں کہ "نالۂ عندلیب" اور "علم الکتاب" طریقۂ محمدیہ کے سلوک کے لیے کافی ہیں۔ یہ کتاب متانت و قوت تحریر میں شاہ ولی اللہ صاحب کی بہترین تصانیف کے ہم پلہ ہے۔

"نالۂ درد" "علم الکتاب" کے بعد لکھا گیا دیباچہ میں فرماتے ہیں۔

"علم الکتاب کے ختم ہونے پر جو مطالب "قلب حیران" پر تراوش کرتے تھے اُن کو میر اثر جمع کرتے گئے۔ جب مجموعہ تیار ہو گیا "نالۂ درد" نام رکھا۔ اِس میں لفظ ناصر کے عدد ۳۴۱ نالے ہیں۔ یہ رسالہ سوز و گداز اور ولولۂ شوقی سے معمور ہے چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

دردمی باردا زرسالۂ درد — شرح دردِ دل ست نالۂ درد

"آہ سرد"۔ اس میں بھی ۳۴۱ سرد آہیں ہیں۔ "نالۂ درد" و "آہِ سرد" دونوں مل کر گویا ایک کتاب ہیں۔

"آہِ سرد"، دونوں ختم ہوگئے۔ مگر دردِ دل بدستور تھا۔ ناچار "دردِ دل" لکھا۔ اس میں ۳۴۱۔ درد ہیں۔ ہر درد میں مطالبِ عرفاں کی شرح ہے۔

"شمع محفل"۔ اس میں ۳۴۱ نور ہیں اور ہر نور معارفِ بلند سے معمور۔ رسالہ کا آغاز خواجہ صاحب کی عمر کے باسٹھویں سال میں ہوا تھا۔ چھیاسٹھ برس کی عمر تک دردِ دل کے ساتھ اس کی تحریر جاری رہی۔ اس رسالہ کا خاتمہ حیرت خیز اور واقعہ عبرت انگیز ہے۔ خاتمہ میں فرماتے ہیں۔ "اب میری عمر کا چھیاسٹھواں سال ہے اور یہ رسالہ ختم ہو رہا ہے۔ مبارک اسم اللہ کے بھی عدد ۶۶ ہیں۔ صحیفۂ واردات ۱۱۷۲ھ ہجری میں ختم ہوا تھا اُسی سال والد عالی مرتبہ نے چھیاسٹھ برس کی عمر میں رحلت فرمائی تھی۔ حُسنِ اتفاق کہ اِس رسالہ کا خاتمہ امسال ہوا جو میرا سالِ ارتحال ہے یہ رسالہ رسالۂ "شمع محفل" کے ساتھ ۱۱۹۵ھ میں شروع ہوا تھا۔ ۱۱۹۹ھ میں ختم ہو رہا ہے۔ ظاہرا یہ خاتمہ توأم ہے سکوت خاتمہ بالخیر راقم رسالہ سے۔ خواجہ صاحب کے کلام کا خلاصہ ختم ہوا۔ دیکھو اُسی صفر کی ۲۴ تاریخ کو خواجہ صاحب نے رحلت فرمائی۔ یہ کیا تھا۔ سائنس کے رمز شناس سوچیں۔ "شمع محفل" کا نور (۳۲۹) اِس راز پر روشنی ڈالتا ہے۔ جہاں فرماتے ہیں کہ "مجھ سے فرمایا گیا ہے کہ سالِ ارتحال و حالِ انتقال تجھکو پیشتر سے بتلایا جائیگا۔ یہ پیدا جل ناگہاں نہیں پہنچیگا"۔ چاروں مذکورۂ بالا رسالوں میں یہ التزام ہے کہ سوائے اپنے اشعار فارسی کے اور کسی شاعر کا کلام درج نہیں کیا۔

"دیوانِ فارسی"۔ دیوانِ فارسی مختصر ہے ۱۳۰۹ھ ہجری میں مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوا ہے۔ غزلیں ہیں۔ رُباعیاں ہیں۔ مخمس وغیرہ بھی ہیں۔ زبان کا وہی انداز ہے جو فارسی گو شعرائے ہند خانِ آرزو وغیرہ کا ہے۔ معرفت کی قوت کے لحاظ سے بہت بلند پایہ ہے۔ ایک شعر سُن لیجئے۔

شد منشاءِ ظہورِ دو عالم وجودِ ما

جوشید نشائتین زجوشِ شرابِ ما

اِس شعر سے زورِ کلام اور قوتِ نسبت کا اندازہ کیجیے۔ اگر "نالۂ درد" وغیرہ کے اشعار بھی شامل دیوان ہو جائیں تو ایک ضخیم مجموعہ مرتب ہو جائے۔ نمونہ غزل فارسی۔

غزل

جوشش زد بادۂ توحید بہ میخانۂ ما   بحر دارد بہ گرہ قطرۂ پیمانۂ ما

بیخودی پردہ کشائے حرم دل باشد
بستہ احرام رہش لغزشِ مستانۂ ما

دیدہا آئینہ باشد بامیدے کہ کند
جلوۂ یار قدم رنجہ بکاشانۂ ما

زینت و زیب زنان باد مبارک بزناں
سازِ دنیا نکند ہمتِ مردانۂ ما

منتِ طبع رسا درد بمنت نکشم
آشنا کردہ بما معنئ بیگانۂ ما

غزل

آئینہ ایم فرما تا در حضور آئیم
ہر جلوۂ کہ داری در خود ترا نمائیم

عرفانِ تیز بیں را حیرت گرفت آخر
اکنوں بہ نور ایماں چشم یقیں کشائیم

از آشنائیے ما بیگانگی ست ورا
بیگانہ وار ہستیم از بسکہ آشنائیم

ما چشم نقشِ پائیم دیدِ قصور داریم
گو در رہش فتادیم اما برہ نیائیم

او دلبر و دل آزار ما دل ز دست دادہ
یارب چہ پیش آمد آمادۂ بلائیم

ما از وفا نپرسیم تو از جفا نگوئی
تا چند آزمائی تا چند آزمائیم

یاراں زِ ہر بانی دانند ہر چہ دانند
ما خوب می شناسیم اے درد آنچہ مائیم

متفرق

درد سلطانِ بحر و بر گشتم
کہ لبِ خشک و چشم تر دارم

ولہ

صبحِ روزِ فراقِ شام بود
اے شبِ وصل شامِ تو سحرست

(دانو دخاں)

ولہٗ

فروغ ماہ ور شبہا توان دید بہندوستان نماید نور ایمان

ولہٗ

در دست چراغے کہ دریں راہ بگیرم آئینہ بکف از دل آگاہ بگیرم

"دیوان اُردو"۔ اس کا بیان آگے آتا ہے۔

ادبِ اُردو

خواجہ صاحب اُردو شعرا کے تیسرے دور میں ہیں۔ میر و میرزا معاصر تھے۔ دورِ سوم کے شعرا کی نسبت آزاد آبحیات میں لکھتے ہیں: "زبانِ اُردو ابتدا میں کچا سونا تھی۔ اِن بزرگوں نے اُسے کدورتوں سے پاک صاف کیا اور ایسا بنا دیا ہے کہ جس سے ہزاروں ضروری کام اور آرائشوں کے سامان حسینوں کے زیور بلکہ بادشاہوں کی تاج و افسر تیار ہوتے ہیں...... یہ اپنی صنعت میں کچھ کچھ تکلف بھی کریں گے مگر ایسا جیسے گلاب کے پھول پر شبنم یا تصویر پر آئینہ۔ انکا تکلف بھی اصل لطافت پر کچھ لُطف زیادہ کریگا اُس کی خوبی پر پردہ نہ ہوگا۔ تم میر صاحب اور خواجہ میر درد کو دیکھو گے کہ اثر میں ڈوبے ہونگے"۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: "اپنے اُستادوں اور بزرگوں سے یہی سُنا کہ مرزا جان جاناں۔ سودا۔ میر۔ خواجہ میر درد۔ یہ چار شخص تھے کہ جنھوں نے زبانِ اُردو کو خراط او تارا ہے"۔

کلام بالا سے خواجہ صاحب کے ادبی صفات یہ واضح ہوئے۔ زبان کو پاک اور کلام کو آراستہ کیا۔ خراط اوتارا۔ اِس سے بھی بڑھکر شہادت میر تقی میر اور میر حسن کی ہے۔ میر صاحب جب اکبر آباد سے دلی آئے تو خواجہ صاحب کی خدمت میں شرف اندوز ہوتے رہے۔ اُنکے مشاعرہ میں شریک ہو کر دار الخلافہ کے مذاق سے آشنا ہونے اور اہلِ زبان کی صحبت سے فیض حاصل کرنے کا موقع انکو ملا۔ میر صاحب کی ترقی دیکھ کر خواجہ صاحب فرماتے: "میر محمد تقی تو میر مجلس خواہی شد"۔ جب وہ مشاعرہ خواجہ صاحب کے یہاں بند ہو گیا۔ تو میر صاحب نے انکی فرمایش سے اپنے یہاں مقرر کیا۔ اپنے مشاعرہ کی نسبت کہتے ہیں: "واللہ کہ بذاتِ ہمیں بزرگ ست"۔ میر صاحب کو صاف اقرار ہے کہ انکا کمال خواجہ صاحب کے پاک انفاس کا ممنونِ کرم ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: "الحمد للہ والمنۃ کہ حرف آں سر سلسلۂ خدا پرستان مؤثر افتاد۔ باطنِ آں خضر قافلۂ اہلِ عرفاں کہ از ظاہرش ظاہر ترست زود کار کرد"۔ (دیکھو تذکرہ میر تقی۔ حالات خواجہ صاحب) میر حسن نے بھی ابتدائ ذوقِ شاعری کی پختگی خواجہ صاحب کی صحبت میں حاصل کی

کریم الدین لکھتے ہیں "بچپن سے میر حسن کو شوق نظم کا تھا۔ جب اِس شوق کی ترقی چاہی خواجہ میر درد کی صحبت میں آئے
اسی فیض صحبت سے وہ اپنے ارادہ پر مضبوط اور قائم رہے" (ترجمہ کا سنڈ ڈی ٹاسی) خود میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے
ہیں کہ "میرے اُستاد میر ضیا رہیں مگر مجھ سے اُنکے طرز کا کما حقہٗ نباہ نہو سکا۔ اِس لیے میں نے دوسرے بزرگوں
کی دمثل خواجہ میر درد۔ میرزا رفیع سودا۔ اور میر تقی میر) پیروی کی" خواجہ صاحب کی خصوصیت خاص یہ ہی کہ اُردو شاعری
کے قالب میں حقیقت و معرفت کی روح پھونکی۔ مردہ جسم کو زندہ کیا۔ نمایاں وصف یہ ہے کہ اُردو ادب میں

مذاقِ صحیح

پیدا کیا۔ میر تقی میر اور میر حسن اُن کے صحبت یافتہ ہیں۔ اثر اور قائم اُن کے شاگرد ہیں۔ نیز فراق
بھکاری داس۔ عزیز نثار۔ اَلم صاحبزادہ ہیں۔ ایک قریبی رشتہ دار شاعر تخلص ہیں۔

میر اثر کی مثنوی "خواب و خیال" افسوس ہی کہ ابتک دستیاب نہیں ہوئی مگر جو اشعار اُس کے محفوظ ہیں
اُن سے اور خواجہ حالی کی شہادت سے عیاں ہی کہ مثنوی مذکور ایک نمونہ تھی حُسنِ ادب کا۔ آبحیات میں آزاد نے
تصریح کی ہی کہ میر حسن جو اندازِ بیان دِلّی سے لائے تھے وہ اُن کے خاندان نے آخر تک قائم رکھا۔ چنانچہ میر
انیس کہدیتے تھے کہ "یہ میرے گھر کی زبان ہے۔ حضرات لکھنؤ اس طرح نہیں فرماتے" نہ صرف یہ بلکہ اندازِ گفتگو۔ طرزِ
معاشرت میں بھی آخر تک امتیاز قائم رہا۔ جن صاحبوں نے میر نفیس اور میرزا اوج کو دیکھا ہی وہ میرے بیان کی تصدیق
کرینگے۔ اب یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مثنوی خواب و خیال۔ مثنوی بدر منیر اور مراثی انیس سے جو فخر و شرف ادب اُردو کو حاصل
ہوا وہ خواجہ صاحب کے فیضِ تربیت کا ممنون ہے۔

خواجہ صاحب شاعری کی نسبت ایک موقع پر فرماتے ہیں۔ اس سے اندازہ کرو کہ کیسی پاکیزہ شاعری کا مفہوم
خواجہ صاحب کے ذہن میں تھا۔ "شاعری ایسا کمال نہیں جس کو مَرد۔ آدمی اپنا پیشہ بنالے اور اُس پر ناز کرے۔
البتہ انسانی ہنروں میں سے ایک ہنر ہے بشرطیکہ صلہ حاصل کرنے اور در بدر پھرنے کا آلہ نہ بنے اور مدح اور ہجو دُنیا
کمانے کے لیے نہ کہے ورنہ گداگری کی ایک صورت ہی اور طامعی اور بدنفسی کی دلیل" (نالہ درد ۲۸) - ایک اور موقع
پر فرماتے ہیں "اِس سے پہلے بہت ہی کم آدمی ایسے نظر آتے تھے جو "سلسلہ جُنبانِ سخن" ہوں۔ آپ کہیں دوسروں سے
سُنیں۔ دِل بے اختیار چاہتا تھا کہ دل پر جو معارف تازہ وارد ہوتے تھے اُن کو سخن فہم نکتہ سنجوں کے سامنے بیان
کروں اور اُن سے ہمکلام ہوں یہ نتیجۂ انسانیت ہی اور نشانِ آدمیت۔ کلام مربوط عجیب لذت رکھتا ہے اور دل کو

شگفتہ کر دیتا ہے۔ علمہ البیان کا یہی خلعت ہے جو خلیفۃ اللہ کو پہنایا گیا ہے۔ پاک فرشتوں کی سجود یہ مشتِ خاک اسی نعمت کی بدولت ہوئی ہے۔ اب معنیٰ فہم انسانوں سے زمانہ بالکل خالی ہو چکا ہے۔ بعض جہلا توحید اس انداز سے بیان کرتے ہیں جو عین الحاد ہے۔ بعض جنگجو مذہب و ملت کی باتیں اس طرح کرتے ہیں جو منشاءِ فساد ہو جاتی ہیں۔ کچھ خام طبع باہم مکر جوشِ اخلاص کا اظہار کرتے ہیں اور بیہودہ گوئی کے معرکے گرم کرتے ہیں عقل و فہم کہاں۔ خدا ایسی صحبتوں کے شر سے محفوظ رکھے"۔

خود اپنی شاعری کی نسبت فرماتے ہیں: "فقیر کے اشعار باوجود رتبۂ شاعری کی رعایت کے۔ پیشۂ شاعری اور اندیشۂ ظاہری کے نتائج نہیں۔ بندہ نے کبھی شعر بدون آمد کے۔ اہتمام آورد سے موزوں نہیں کیا اور بہ تکلف کبھی شعر و سخن میں مستغرق نہیں ہوا۔ کبھی کسی کی مدح یا ہجو نہیں لکھی۔ کبھی فرمائش یا آزمائش سے متاثر ہو کر شعر نہیں کہا"۔

علم الکتاب صفحہ ۹

عشقِ مجازی کا مفہوم خواجہ صاحب کے یہاں معمولی سطح سے بلند تر ہے۔ فرماتے ہیں: "بوالہوسی عشقِ مجازی نہیں ہے اور اس مجاز کو حقیقت کی راہ نہیں کہہ سکتے پیر کی محبت وہ عشقِ مجازی ہے جو مطلوب حقیقی تک پہنچا دیتی ہے۔ ؎ درد سر افزود از عشقِ بتاں ؛ درد من میخواستم درد دلے"۔ ایک اور موقع پر فرماتے ہیں: "میں کبھی رسمی عشق بازی میں گرفتار نہیں ہوا۔ لیکن دل "عاشقانہ صادقانہ" پایا ہے۔ محبوبوں سے تو کبھی سابقہ نہیں رہا البتہ دوستوں کی صحبت بے تکلفانہ میں وقت گزارا ہے۔ دوستانِ ہمدم جب جمع ہوں اور "محفلِ زندہ دلی" گرم فرمائیں اس "مُردہ دلِ افسردہ خاطر" کو بھی یاد کر لیں اور فاتحہ خیر سے شاد"۔

مضامین بالا سے واضح ہوا ہوگا کہ خواجہ صاحب کی شاعری کی نوعیت اور تخیلِ شعر کی حقیقت کیا تھی؟

خواجہ صاحب کا دیوان اُردو مختصر ہے۔ عام طور پر جو مطبوعہ نسخے ملتے ہیں بہت غلط ہیں۔ اسی لیے جناب سید راس مسعود صاحب کو صحیح نسخے کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا۔ اور بہت صحیح پیدا ہوا۔ حیدرآباد میں ایک سے زائد قلمی دیوان دردؔ کے نسخے میرے ہاتھ آئے۔ سید صاحب کی فرمائش سے میں نے سید معین الدین صاحب شاہجہاں پوری (مترجم نپولین اعظم وغیرہ) کو تصحیح و مقابلے کی تکلیف دی۔ اہل ادب کو ممنون ہونا چاہیے کہ نہایت محنت و دیدہ ریزی سے اُنھوں نے ایک صحیح نسخہ مرتب فرما دیا اُسی نسخہ سے یہ دیوان طبع ہوا ہے۔ طبع کے بعد جب میں حیدرآباد سے حبیب گنج

آیا تو کتاب خانہ میں ایک قدیم مطبوعہ نسخہ موجود ملا جو دہلی کے مطبع مصطفائی میں ۱۸۵۵ء میں اہتمام سے طبع ہوا تھا۔ یہ نسخہ بہت صحیح ہے اور متعدد صحیح نسخوں کے مقابلہ سے چھاپا گیا تھا۔ میں نے اِس نسخہ سے بھی مقابلہ کرنے کی خواہش سید معین الدین صاحب سے کی اور اُنھوں نے مہربانی سے محنت کر کے مقابلہ کیا۔ یہہ دیکھکر مسرت ہوئی کہ حالیہ مطبوعہ نسخہ قدیم سے بالکل مطابق نکلا صحت میں بھی اور مقدارِ کلام میں بھی۔

خواجہ صاحب کے کلام میں بعض ایسے الفاظ ضرور ہیں جو اب متروک ہو چکے ہیں۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ جو زبان آج فصیح سمجھی جاتی ہے کل اُس کے کتنے الفاظ غیر فصیح اور نامانوس مانے جائینگے۔ لیکن اسی کے ساتھ معرفت اور حقیقت کا رنگ۔ کلام کی پاکیزگی تخیل کی بلندی درد کی چاشنی سوز و گداز کا کُندن ہر جگہ عیاں ہے تاباں ہے اشعار ذیل اس دعوے کے شاہد ہیں:۔

غزل

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کی رقم کا — حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا
جس مسندِ عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے — کیا تاب گزر ہووے تعقل کے قدم کا
بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن — آباد ہے تجھ سے ہی تو گھر دیر و حرم کا
ہے خوف اگر جی میں تو ہے تیرے غضب کا — اور دل میں بھروسا ہے تو تیرے ہی کرم کا

مانند حباب آنکھ تو اے دردؔ کھلی تھی
کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

دیگر

مژگان تر ہوں یا رگِ تاکِ بریدہ ہوں — جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں
کھینچے ہے دور آپ کو میری فروتنی — افتادہ ہوں پہ سایۂ قدِ کشیدہ ہوں
ہر شام مثلِ شام ہوں میں تیرہ روزگار — ہر صبح مثلِ صبح گریباں دریدہ ہوں

کرتی ہے بوئے گل تو میرے ساتھ اختلاط — پر آہ میں تو موجِ نسیمِ وزیدہ ہوں

چاہے ہے یہ مری تپشِ دل کہ بعد مرگ — کُنجِ مزار میں بھی نہیں آرمیدہ ہوں

اے دردؔ جا چکا ہے مرا کام ضبط سے

میں غمزدہ تو قطرۂ اشکِ چکیدہ ہوں

دیگر

ہر طرح زمانے کے ہاتھوں سے ستم دیدہ — گر دل ہوں تو آزردہ خاطر ہوں تو رنجیدہ

ہم گلشنِ دوراں میں اے خفتگیٔ طالع — سرسبز تو ہیں لیکن جوں سبزۂ خوابیدہ

اے شورِ قیامت رہ اودھر ہی میں کہتا ہوں — چونکے ہے ابھی یاں سے کوئی دل شوریدہ

اوروں سے تو ہنستے ہو نظروں ہی ملا نظریں — ایدھر کو نظر کوئی پھینکی بھی تو دزدیدہ

مجھ پر بھی تو یہ عقدہ تو کھول صبا بارے — زلفوں نے کسے بھیجا یہ نامۂ پیچیدہ

بدخواہ سبھی عالم گو ہووے تو ہو لیکن، — یارب نہ کسی کے ہوں دشمن یہ دل و دیدہ

کرتا ہے جگہ دل میں جوں ابروئے پیوستہ

اے دردؔ یہ تیرا تو ہر مصرعۂ چسپیدہ

دیگر

کاش تا شمع نہ ہوتا گزرِ پروانہ — تم نے کیا قہر کیا۔ بال و پرِ پروانہ

شمع کے صدقے تو ہوتے ابھی دیکھا تھا اُسے — پھر جو دیکھا تو نہ پایا اثرِ پروانہ

کیوں اُسے آتشِ سوزاں میں لیے جاتی ہے — سوجھتا بھی ہے تجھے کچھ نظرِ پروانہ

ایک ہی جست میں لی منزلِ مقصود اُسنے — راہروِ رشک کی جا ہے سفرِ پروانہ

شمع تو جل بجھی اور صبح نمودار ہوئی

پوچھوں اے دردؔ میں کس سے خبرِ پروانہ

اُس کی بہارِ حسن کا دل میں ہمارے جوش ہے دیگر فصلِ بہار جس کے ہاں ایک یہ گل فروش ہے

خلوتِ دل نے کر دیا اپنے حواس میں خلل
حسن بلائے چشم ہے۔ نغمہ وبالِ گوش ہے

ہووے تو درمیان سے اپنے تئیں اُٹھائیے
بار نہیں ہے اور کچھ سر پہ وبالِ دوش ہے

نالۂ و آہ کیجیے خونِ جگر ہی پی جیے
عہدِ شباب کہتے ہیں موسمِ ناؤ نوش ہے

خیر تجھے جو چاہیے بدرقۂ جنوں نہ چھوڑا
ہم نے جہاں کی سیر کی۔ رہزنِ خلق ہوش ہے

غیرِ ملال زاہدا۔ کیا ہے طریقِ زہد میں
دِل ہو شگفتہ جس جگہ۔ کوچۂ مے فروش ہے

اپنے تئیں تو کام کچھ خرقہ و جامہ سے نہیں
دردؔ اگر لباس ہے دیدۂ عیب پوش ہے

دیگر

آفتِ جان و دل تو یاں وہ بتِ خود فروش ہے
پہلے ہی جس کے پیشکش۔ صبر و قرار و ہوش ہے

دل کو سیاہ مست کر۔ کچھ بھی تجھے جو ہوش ہے
کہتے ہیں کعبہ اس کو۔ اور کعبہ سیاہ پوش ہے

کس کی یہ ہوتی ہے صبا گفت و شنید باغ میں
غنچے سبھی وہاں ہیں۔ گل بھی تمام گوش ہے

آتشِ گل جنوں مرا گرم کرے سو یہ نہیں
سینہ ہمیشہ آگ ہے دل میں سدا ہی جوش ہے

حادثۂ زمانہ کیا تیری جفا سو کیا بلا
ہم کو سپہر مت ڈرا نیش بھی یاں تو نوش ہے

ہم نے تو ایک معصیت چاہی چھپے نہ چھپ سکی
اپنے گناہ کو ترا عفو ہی پردہ پوش ہے

آہ کہیں یہ ناتواں حال کرے سو کیا بیاں
منہ پہ ہے مہرِ خاموشی دل میں بھرا خروش ہے

دور نہیں ہوا ہمیں رنجِ شعور ساقیا
اک دو سہ جام اور بھی باقی ابھی تو ہوش ہے

محنت و رنج و غم سے یاں دردؔ نہ جی چھپائیے
بار سبھی اُٹھائیے جب تئیں سر پہ دوش ہے

آخر میں یہ لکھ دینا ضروری ہے کہ جو حالات اس مقدمے میں لکھے گئے ہیں اُن کا ماخذ خود خواجہ صاحب کی تصانیف ہیں بعض حالات یا مضامین ایسے بھی درج ہوئے جو دوسری کتابوں سے ماخوذ ہیں اُن کا حوالہ موقع پر دیدیا گیا ہے۔

میں ممنون ہوں کہ سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی سے قیمتی مدد ملی ہے۔ ناشکری ہوگی اگر میں نہ لکھوں کہ خواجہ صاحب کی نادر اور نایاب تصانیف (علم الکتاب، ونالۂ درد وغیرہ) اور خواجہ عندلیب صاحب کی نالۂ عندلیب کی اشاعت کی سعادت نواب سیّد نورالحسن خاں مرحوم بھوپالی کو نصیب ہوئی۔ یہ دین وعلم کی ایسی بیش بہا خدمت تھی جو ہمیشہ اہل دل کو اُن کا ممنون رکھے گی۔ جزاہ اللہ خیرا

اللہ بس۔ باقی ہوس

نوٹ۔ یہ دیوان جس کا یہ مقدمہ ہے سلسلۂ آصفیہ مطبع نظامی بدایوں کا تیسرا نمبر ہے۔ قیمت مجلد عہ۔ غیر مجلد عہ

مرے حُسن کے لئے کیوں مرے؟

(نتیجۂ فکر جناب محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی اے)

(۱)

نہ بھلے کی تھی نہ بُرے کی تھی مجھے کچھ جہاں کی خبر نہ تھی — تمھیں عیش کا ہی جو دھیان تھا تمھیں میری چاہ اگر نہ تھی

مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے!

(۲)

بہت اپنی چاہ جتا جتا مِرے دل کو موہ کے لے لیا — مرے واسطے یہ بہشت تھی تمھیں دل لگی تھی یہ کھیل تھا

مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے!

(۳)

مری چاہ تھی بڑی قیمتی میں غریب تھی یہ امیر تھی — تھے امیر تم یہ نہ چاہ تھی میں امیر تھی یہ فقیر تھی

مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے!

(۴)

نہ تھا اس جہان میں آسرا مری جان تھی یہ جہان تھا — مرے سُکھ تمھیں تمھیں چین تھے تمھیں چاہ ہے یہ گمان تھا

مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے!

(۵)

مرے حسن کی جو بہار تھی مری کھل رہی تھی کلی کلی یہ تمھیں پہ میں نے نثار کی مرا دھن لیا مری جان لی
مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے!

(۶)

مری چاہ لی مرا دل لیا جو طلب کیا وہ تمھیں دیا جونہی حسن سے مرے دل بھرا وہ پھری نگاہ وہ دل پھرا
مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے!

(۷)

تمھیں چاہ اور کی جب ہوئی مری وہ بہشت تو جا چکی مگر آرزو یہ ضرور تھی تمھیں دیکھ لیتی کبھی کبھی
مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے!

(۸)

مرا پاش پاش یہ دل ہوا مری چاہ کا وہ دیا بجھا مرے دل کو تم نے یہ کیا کیا نہیں اب بھی وہ کسی اور کا
مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے!

(۹)

نہیں اب بھی وہ کسی اور کا یہ نہ اگلا سا مرا دل رہا تمھیں یاد آؤں میں پھر اگر تو یہ پاؤ گے کہ وہ خواب تھا
مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے!

(۱۰)

مرے دل سے ہوگا یہ کب بھلا تمھیں دے سکوں کوئی بددعا وہ ہوا جو ماتھے پہ تھا لکھا مرے دل سے آئے گی یہ صدا
مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے!

اُردو رسمِ خط میں اصلاح

از

جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی پرنسپل عثمانیہ کالج حیدرآباد (دکن)

اُردو رسمِ خط کی اصلاح کے متعلق متعدد مضامین اُردو کے مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ کافی بحث ہونے کے بعد ایک مجلس حیدرآباد میں امور بحث طلب کے فیصلے کے لئے منعقد ہوئی۔ جس میں اصحاب ذیل شریک تھے۔

ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی، ایم اے، پی ایچ ڈی پرنسپل عثمانیہ کالج، مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے ناظم دارالترجمہ، مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دارالترجمہ، مولوی وحیدالدین صاحب سلیم پروفیسر عثمانیہ کالج، مولوی سید احمد علی صاحب ناظر تعلیمات ضلع ناندیڑ، مولوی سجاد مرزا صاحب بی اے (کینٹب) پرنسپل مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ اورنگ آباد۔ عبدالحق۔

بعض صاحب بوجہ بُعد اور بعض اس وجہ سے کہ تاریخ جلسہ عید کے متصل تھی۔ شریک جلسہ نہ ہوسکے ان میں سے بعض صاحبوں نے بذریعہ تحریر اپنی رائے بھیج دی یا جن خیالات کا اظہار وہ اپنے مضامین میں فرما چکے تھے اُن کا حوالہ دیدیا۔ ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی نے جو تجاویز جلسے میں پیش کیں وہ ارکان مجلس نے تقریباً سب منظور کرلیں جو اس مضمون کے پڑھنے سے واضح ہونگی۔ ڈاکٹر صاحب نے اِن تجاویز میں اُردو ٹائپ کی مشکلات کو پیش نظر رکھا ہے اور ان کا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس میں سہولت پیدا کی جائے۔ مثلاً اُنھوں نے اعراب بجائے حروف صحیح کے حروف علت پر رکھے ہیں۔ یعنی ٹائپ میں وَ اور یَ مع اعراب رہیں گے۔ جہاں ضرورت ہوگی لگادیئے جائیں گے۔ اگر برخلاف اس کے مروجہ طریقہ پر عمل کیا جائے تو تمام حروف مع اِن اعراب کے الگ بنانے پڑیں گے اور اس سے ٹائپ میں جو دِقّت

بڑھ جائے گی وہ ظاہر ہے۔ امید ہے کہ جو صاحب اس مضمون کو مطالعہ فرمائیں گے وہ اس اصول کو مدنظر رکھینگے

علاوہ اس کے ارکان مجلس نے بالاتفاق اوقاف کے لئے مفصلۂ ذیل علامات اور اسماء مقرر کئے

انگریزی نام	اردو نام	علامت
فل اسٹاپ (Full stop .) کے لئے	وقفہ	–
کولن (colon :) "	نیم وقفہ	:
سیمی کولن (Semi-colon ؛) "	رابطہ	؛
کاما (Comma ،) "	سکتہ	،
اِن ورٹڈ کاماز (Inverted Commas " ") "	واوین	" " (عبارت کے اوپر)
نوٹ آف اِن ٹروگےشن (Note of Interrogation ؟) "	سوالیہ	؟
نوٹ آف انٹرجیکشن (Note of Interjection !) "	ندائیہ	!
بریکٹس (Brackets ( )) "	قوسین	( )
(Dots ......) "	نقطے	......

املا کے متعلق بعض امور کسی دوسرے جلسے میں فیصلے کے لئے پیش ہونگے۔

اڈیٹر

اُردو، تحریر میں دو قسم کی خرابی ہے: (۱) ایک حرُوفِ صحیح سے (۲) دوُسری حرُوفِ علّت سے متعلق۔

(۱) اُردوُ کی الف بے میں کئی کئی حرفوں کی آواز ایک ہے؛ جیسے ا اور ع کی آواز ایک ہی ہے۔ اِسی طرح ت اور ط کی، ث، س اور ص کی، ح اور ہ کی، ذ، ز، ض، اور ظ کی آواز ایک ہے اُردوُ کی ضرُورت کے لئے صِرف ا، ت، س، ہ اور ز کافی ہیں اور باقی حرف (ع، ط، ث، ص، ذ، ض اور ظ) بے ضرُورت ہیں اور اِسی لئے یہ حرف صِرف عربی لفظوں کے لکھنے میں کام آتے ہیں۔ اِن حرفوں کے وجود سے لکھنے والے کو تکلّف ہوتا ہے لیکن لکھی ہوئی عبارت کے پڑھنے میں کوئی دِقّت نہیں ہوتی

پس اِس وقت اِن ٹھیٹ عربی حرفوں کو میں خارج از بحث تصوّر کرتا ہوں اور اپنی تقریر کو دُوسری قِسم کی خرابی کے رفع کرنے کی تجویزوں تک محدُود رکھتا ہوں۔

(۲) اُردُو کی الف بے میں حرفِ عِلّت کم ہیں اس لئے (۱) ایک حرفِ علّت کئی آوازوں کے لئے لکھا جاتا ہے؛ اور (ب) خفیف عِلّت کے نشان یعنی اعراب لکھے ہی نہیں جاتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ساری تحریر میں تلبیس پیدا ہوگئی ہے اور پڑھنے والے کو عبارت کے صحیح پڑھنے میں مشکل سے کامیابی ہوتی ہے اور اِسی لئے رسمِ خط میں اِصلاح کی ضرورت لاحق ہے۔

اِصلاح کا مقصود

(۱) موجودہ کتابت کے اِلتباس کو دُور کرنا؛

(۲) التباس کے دُور کرنے کو ایسی علامتیں یا نشان مقرر کئے جائیں جو نامانوس نہ ہوں؛

(۳) رسمِ خط کے مقرر کرنے میں یہ لحاظ رکھا جائے کہ ٹھپّے کے چھاپے کے لئے جہاں تک ہوسکے آسانیاں پیدا ہوں؛

(۴) جہاں تک ہوسکے حرفوں کو اِعراب (یعنی زبر، زیر، پیش) سے مستغنی کرنا

اصلاح کی تدبیریں

(۱) جہاں تک ہوسکے ہر لفظ الگ الگ لکھّا جائے۔ کئی لفظوں کو ملاکر لکھنے سے چھپائی میں بھی دقّت ہوتی ہے اور پڑھنے میں بھی "آپنے"، "تمنے"، "مینے"، "آپکیخدمتمیں"، "عرفانعلیخانصاحب"، "ہادیعلیبیگصاحب"، "جسدن"، "جسکو"، "اُسیدن"، "مجھسے"، "نکیجئیگا"، "نجائیگا"، کو اُسی طرح غلط سمجھنا چاہیئے جیسے عربی میں "سوفتعلمون" غلط سمجھا جاتا ہے۔ صحیح صورتیں یہ ہوں گی: "آپ نے"، "تم نے"، "میں نے"، "آپ کی خِدمت میں"، "عرفان علی خاں صاحب"، "ہادی علی بیگ صاحب"، "جِس دِن"، "جِس کو"، "اُسی دِن"، "مجھ سے"، "نہ کیجئے گا"، "نہ جائے گا"، "سوْفَ تَعْلَمُوْن"، اِسی طرح "کان پور" "ناگ پور" "بھرت پور"، "اُودے پور"، "جے پور"، "فرّخ نگر" "شاہ جہان پور" وغیرہ لکھنا چاہیئے۔ اگر اس قاعدے

پر پابندی کے ساتھ عمل کیا جائے تو ٹھپّے کے چھاپے کے لئے حرف جوڑنے میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔ دوسرے یہ کہ بہت سے حرف اِعراب سے مستغنی ہو جائیں گے۔

(۲) ہر لفظ کا اخیر حرف اُردو میں ساکن ہوتا ہے۔ اِس لئے اُس پر جزم لگانے کی ضرورت نہیں۔

(۳) سوا لفظ کے اخیر حرف کے جس حرفِ صحیح پر کوئی علامت یا اِعراب نہ ہو اُسے عمُوماً مفتوح پڑھنا چاہیئے۔

(۴) لفظ کے اخیر حرف کے سِوا جو حرفِ صحیح ساکن ہو اُس پر جزم کا نشان ضرور لگانا چاہیئے۔ البتہ اُردو فعل کے مادّے میں جو ایسے حرف آئیں اُن کو جزم لگائے بغیر چھوڑ دینے میں کوئی حرج نہیں جیسے کھیلنا، کاٹنا، جھپٹتا ہے، لپکتا تھا وغیرہ میں اگر ل، ٹ، ک پر جزم نہ ہو تو بھی اِن کے پڑھنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ یہی حال اُن اُردو لفظوں کا ہے جو بہت عام ہیں جیسے اپنا دوسری، پانچواں وغیرہ۔

(۵) ہر مُشدّد حرف پر تشدید کا نشان ضرور لگانا چاہیئے۔

(۶) جب آ مضموم یا مکسُور ہو اور اُس کے بعد کا حرف، حرفِ صحیح ہو تو آ پر اعراب ضرُور لگانا چاہیئے۔ جیسے اِس، اُس، اِدھر، اُدھر۔

(۷) اُردو میں اگر آ یا وَ کے بعد ہمزہ آئے تو اُس ہمزہ کے لئے کوئی شوشہ نہ بنایا جائے بلکہ آ کے بعد ہی اُس کے برابر ہمزہ لکھا جائے۔ جیسے آءِی، آءِے، کوءِی، بھاءِی، جاءِے، لاءِے، سوءِے، کھوءِے وغیرہ

(۸) دو لفظوں کے درمیان مناسب فاصلہ دیا جائے۔

(۹) جو مُرکّب لفظ دو یا تین لفظوں سے مل کر بنے ہوں اُن کے اجزا الگ الگ لکھے جائیں۔ لیکن اُن کے درمیان فاصلہ نہ دیا جائے۔ جیسے پن گھٹ، پوّن چکّی، دِل کش، دل جیب وغیرہ (مگر دِل میں دِل پر) البتّہ جو دو لفظ ایک دوسرے کے ساتھ ایسے وصل ہوئے ہیں کہ کوئی آواز جاتی ہی رہی ہے وہ ملاکر لکھے جائیں گے جیسے دِلارام، دِلازار، سیلاب وغیرہ

(۱۰) فارسی اِضافت کے کسرے کو ہمیشہ تحریر میں لانا چاہیئے۔ یہ جو دس قاعدے بیان ہوئے، تھوڑے

سے اہتمام سے اِن پر آسانی سے عمل ہو سکتا ہے اور اِن میں کوئی ایسی نئی بات نہیں جو نامانوس ہو۔ اب حرف وَ اور یَ کی کتابت کا معاملہ باقی ہے جو نہایت اہم ہے۔ اُس کے لئے یہ گیارھواں قاعدہ میں نے تجویز کیا ہے:-

(۱۱) وَ اور یَ کی مختلف آوازوں کے لئے صورتیں بھی مختلف ہوں اور وہی ہمیشہ استعمال کی جائیں لوہے کے چھاپے کے لئے اِن میں سے ہر صورت کا ایک الگ ٹھپّا ڈھال لیا جائے۔

وَ اور یَ جب حرفِ علت ہوں تو اُن کی چار چار آوازیں ہوتی ہیں اور جب حرفِ صحیح ہوں تو ایک ایک آواز یعنی واو کی کُل پانچ آوازیں ہوئیں اور اتنی ہی یَ کی، مگر یہ یاد رہے کہ یَ کی تین آوازوں میں سے ہر آواز کے لئے دو صورتیں اس وجہ سے ہو جاتی ہیں کہ یَ لفظ کے آخر میں پوری لکھی جاتی ہے اور بیچ میں ہو تو ایک شوشے اور نقطوں سے ظاہر کی جاتی ہے۔ پس وَ اور یَ کی سب ملا کر تیرہ صورتیں ہوتی ہیں، جن کے لئے حسب ذیل حرفوں کا مقرر کرنا مناسب ہوگا:-

حرفِ علّت

واو

مجہول و : چور، شور، مور، ڈھول، چکور، لاؤ، جاؤ، پاؤ بھر آٹا، تاؤ، ناو۔

معرُوف وُ : دوُر، نوُر، پھوُل، جھوُل، دھوُل، جھاڑوُ کھاؤُ، اُڑاؤُ۔

ماقبل مفتوح وْ : جوْ، سوْ، نوْ، جوْر، طوْر، دھوْل دھپّا، کھوْلتا پانی

مخلوط اور معدولہ وٓ : خوٓاب، خوٓاہر، درخوٓاست، خوٓاہش، خوٓاجہ، خوٓد، خوٓش، خوٓشبو۔

(تشریح۔ (۱) مجہول کے لئے کوئی نئی علامت مقرر نہیں کی گئی۔

(۲) معروف کے لئے اُلٹا پیش دیا گیا ہے جیسے مدظلہٗ کی ہ پر عموماً دیا جاتا ہے۔

(۳) ماقبل مفتوح کے لئے سیدھا جزم اوپر لگایا گیا ہے
(۴) مخلوط یعنی جس واو کے بعد آ یا ی آئے اُس پر اُلٹا جزم لگایا گیا ہے۔
معدول واو کے لئے کسی اور نشان کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ مخلوط اور
معدول واو اِنے گنے فارسی لفظوں میں آتا ہے اور ان میں سے ہر لفظ
خ سے شروع ہوتا ہے۔

فائدہ۔ الفِ ممدودہ یا یاے ممدودہ کے بعد اگر و (مجہول) آئے تو اُس کی
آواز پوری نہ رہے گی؛ جیسے تاو، پاو، ناو، گھاو، پڑاو (ایسی
صورت میں ء کی ضرورت نہیں) اِسی طرح سیو، دیو وغیرہ۔ مگر
جب لفظ کا ایک ٹکڑا الف ممدودہ پر یا یاے ممدودہ پر ختم ہو جائے
تو ء کا لکھنا ضروری ہے؛ جیسے آءو، جاءو، وغیرہ]

یاے	آخر میں	بیچ میں	
مجہول	ے	یہ	: کے، سے، بٹیر، سیر (وزن)، شیر، ہیر پھیر
معروف	ی	یٖہ	: کی، پانی، پیر، تیر، شیر (دودھ)، کھیر، بھیڑ (مجمع)۔
ماقبل مفتوح	ىٰ	یٰہ	: ہے، شے، مے؛ شیخ، سیر، سیل، سیلاب
مخلوط		یٗہ	: پیاس، پیارا؛ تیوری، کیوں، جیوں تیوں

[تشریح (۱) مجہول کے لئے کوئی نئی علامت مقرر نہیں کی گئی۔
(۲) معروف کے لئے دونوں نقطوں کے بیچ میں نیچے کی طرف ایک شوشہ
بڑھایا گیا ہے جیسے خوش نویس محض خوب صورتی کے لئے یے کے
نقطوں کے نیچے لگاتے ہیں۔ پس کوئی نامانوس چیز نہیں ہے۔
(۳) ماقبل مفتوح اور مخلوط کے لئے سیدھا اور اُلٹا جزم اوپر لگایا گیا ہے

(۴) آخر میں یے کی تین صورتیں (ی، ے اور ئ) استعمال ہی ہوتی ہیں اِن کی محض پابندی مقصود ہے۔ کوئی نئی تجویز اس امر میں پیش نہیں ہے۔

فائدہ۔ الفِ ممدودہ یا واوِ ممدودہ کے بعد اگر ـــٓے (مجہول) آئے تو اُس کی آواز پوری نہ رہے گی؛ جیسے چاے، راے، گاے، ناے، علماے کرام، اُردوے معلّی بوے گل (ایسی صورت میں ءٓ کی ضرورت نہیں) مگر جب لفظ کا ایک ٹکڑا الف ممدودہ یا واوِ ممدودہ پر ختم ہو جائے تو ءٓ کا لکھنا ضروری ہے جیسے آءے، جاءے، جاءِیے، کھوءے، کھوءِیے وغیرہ]

حرفِ صحیح

واوِ صحیح : وٖ : کِوٖاڑ، جوٖاب، ثوٖاب، وٖارث، وٖہ۔

یاے صحیح : یٖہ : کیٖا، دیٖا، یٖاد، یٖار، خیٖال، یٖہ

نون غنّہ : ں، نٔ : کہاں، یہاں، ہنٔسنا، پھنٔس گیا۔

ہاے ملفوظ : ہٖ، ہٖہ : بیاہٖ، نباہٖ، چاہٖ، راہٖ، کلاہٖ، سیہہ بخت

〃 مخلوط : ھ : بھاو، گھاو، پھیر، دھاوا، کڑھائی

〃 مختفی : ہ، ـہ : پردہ، زردہ، بندہ، مورچہ، درجہ۔

(یہ بھی وہی پرانی باتیں ہیں۔ بس اِن پر عمل پابندی کے ساتھ ہو۔)

عام طور پر تمام کتابوں کی اور اخباروں وغیرہ کی چھپائی میں اوپر کے گیارہ قاعدوں کی پابندی کی جائے تو کافی ہے۔

البتہ جو کتابیں مبتدیوں کے لئے ہوں یا جو لغت کے فن پر ہوں اُن میں اِن قاعدوں کی پابندی کے علاوہ جہاں جہاں ضرورت ہو زیر اور پیش کا نشان بھی لگایا جائے۔

واو اور یے کی مختلف آوازوں کے لئے الگ الگ حرفوں کے مقرر کر لینے کا ایک بڑا فائدہ

یہ ہے کہ اُن سے قبل جو حرف آئیں وہ اِعراب سے مستغنی ہو جاتے ہیں؛ جیسے "وہ بھی کبھی جرأت کبھی سودا کبھی میر کے انداز میں غزل لکھتے تھے مگر اخیر میں خواجہ میر درد کی طرز میں آ گئے تھے۔" اِس عبارت میں "بھی" کا لفظ اس لئے اِعراب سے مستغنی ہوا کہ ی کی جو شکل لکھی گئی ہے وہ معروف ہے اور اُس سے پہلے کا حرف اُس کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے گا۔ یہی حال "کے"، "تھے"، "کی" کا ہے۔ "کبھی" پر اِعراب کی اِس لیئے ضرورت نہیں کہ کَ مفتوح ہے اور بھ کا حرفِ علت یٖ ہے جس کا معروف ہونا اُس کی شکل سے ظاہر ہے۔ "سودا" میں سَ کو وٗ اور دَ کو آ اعراب سے مستغنی کرتا ہے۔ "میر" کے دونوں حرفِ صحیح اس لئے اعراب کو نہیں چاہتے کہ پہلے کے بعد حرفِ عِلّت مُشکّل ہے اور دوسرا، لفظ کا اخیر حرف اور اس لئے ساکن اور جزم کے نشان سے مستغنی ہے۔ اب ذیل کی عبارتوں کو لو:-

۱- آؤ چلیں، شب بو کی بھینی خوشبو کو سونگھیں؛ تُم بھی سونگھو، میں بھی سونگھوں۔

۲- بے چارے غریب آدمی کے لیئے جو کی سوکھی روٹی پلاو زردے کا حُکم رکھتی ہے۔

۳- حمید نے تھوڑی سی سپر کی تھی اُس میں نو سو سیر جو پیدا ہوا، سارے گھر نے پورے سال بھر خوب پیٹ بھر کے کھایا اور بیس رُپئے کا غلّہ بیچ لیا سو الگ۔ جو میں تو اِتنا فائدہ ہوا مگر جوار جو اُس بچارے نے بوئی تھی ساری کی ساری پانی میں گل گئی کہ دوسری فصل میں بیج ڈالنے تک کو ایک دانہ مُیسّر نہ آیا۔

۴- وہ صُبح کو آئے تو کروں باتوں میں دوپہر
اور چاہوں کہ دِن تھوڑا سا ڈھل جائے تو اچھا
ذوق

(۱) تُم۔ (۲) پُلاو، حُکم (۳) رُپئے، لِیا، فائدہ، بِچارے، مُیسّر (۴) صُبح، دِن۔ ۱۰ میں یہ دس لفظ ہیں جن میں صرف ایک ایک حرف اِعراب کے نشان کا محتاج رہا باقی تمام حروف اُن گیارہ قاعدوں کی پابندی سے کسی مزید اعراب کے محتاج نہیں رہے۔

بے اِعْراب کی

معمولی چھپی ہوئی عبارت

بھائی، جس دن تم کو خط بھیجا تیسرے دن
ہردیو سنگھ کی عرضی اور پچیس، روپے کی
رسید اور پان سو کی ہنڈوی پہنچی۔ تم سمجھے بابو
صاحب نے پچیس روپے ہردیو سنگھ کو دیے
اور مجھ سے مجرا نہ لیے۔ بہ ہر حال ہنڈوی بارہ
دن کی میعادی تھی، چھے دن گزر گئے تھے، چھے دن
باقی تھے۔ مجھ کو صبر کہاں؟ مِتّی کاٹ کر روپے
لے لئے، قرض متفرق سب ادا ہوا! بہت
سبک دوش ہوگیا۔ آج میرے پاس معـللعہ نقد
بکس میں اور چار بوتل شراب اور تین شیشے گلاب
کے توشہ خانے میں موجود ہیں۔ الحمدُ لِلّٰہِ علیٰ
اِحْسانِہٖ۔ بھائی صاحب آگئے ہوں تو میر
قاسم علی خاں کا خط اُن کو دے دو اور میرا
سلام کہو اور پھر مجھ کو لکھو تا کہ میں اُن کو خط لکھوں
بابو صاحب بھرت پور آ جائیں تو آپ کاہلی نہ
کیجئے گا اور اُن کے پاس جائیے گا کہ وہ تمھارے
جویائے دیدار ہیں۔

غالب (اُرْدوئے مُعلّیٰ)

اِعْراب والی عبارت

مُبْتَدِیوں کے پڑھنے کے لیے

بھائی، جِس دِن تُم کو خط بھیجا تیسرے دِن
ہَردیو سِنگھ کی عَرضی اَور پَچّیس رُوپئے کی رسید
اَور پان سَو کی ہُنڈوی پُہنچی۔ تُم سمجھے بابُو صاحب
نے پچّیس رُوپئے ہَردیو سِنگھ کو دِیے اَور
مُجھ سے مُجْرا نہ لیے۔ بہ ہر حال ہُنڈوی بارہ
دِن کی میعادی تھی، چھے دِن گُزر گئے تھے،
چھے دِن باقی تھے۔ مجھے صبر کہاں؟ مِتّی کاٹ کر
رُوپئے لے لیے، قرض مُتفرِّق سب ادا ہُوا! بہت
سُبک دوش ہو گیا۔ آج میرے پاس معـللعہ نقد
بکس میں اَور چار بوتل شراب اَور تین شیشے گلاب
توشہ خانے میں مَوجُود ہیں۔ الحمدُ لِلّٰہِ علیٰ
اِحْسانِہٖ۔ بھائی صاحب آ گئے ہوں تو میر
قاسم علی خاں کا خط اُن کو دے دو اَور میرا
سلام کہو اَور پھر مُجھ کو لِکھّو تا کہ مَیں اُن کو خط
لِکھُّوں۔ بابُو صاحب بھرت پُور آجاویں تو آپ کاہلی
نہ کیجیے گا اَور اُن کے پاس جائیے گا کہ وہ تُمھارے
جو یائے دیدار ہیں۔

غالب (اُرْدُوئے مُعلّیٰ)

بے اعراب کی عبارت

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے:
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا۔

(غالب)

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہاے راز کا
یاں، ورنہ، جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا۔

(غالب)

منہہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئنہ کس کا؟

(میر)

عشق بُرے ہی خیال پڑا ہے، چین گیا، آرام گیا؛
جی کا جانا ٹھیر گیا ہے: صبح گیا یا شام گیا۔

(میر)

اعراب والی عبارت

ہنوز اِک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے:
دِلِ افسُردہ گویا حُجرہ ہے یُوسُف کے زِنداں کا

(غالِب)

محرَم نہیں ہے تو ہی نوا ہاے راز کا؛
یاں، ورنہ، جو حِجاب ہے پَردہ ہے ساز کا

(غالِب)

مُنّہہ تکا ہی کرے ہے جِس تِس کا؛
حیرتی ہے یہ آئِنہ کِس کا؟

(میر)

عِشق بُرے ہی خیال پڑا ہے، چین گیا، آرام گیا
جی کا جانا ٹھیر گیا ہے: صُبح گیا یا شام گیا۔

(میر)

اوپر کی عبارت دو طرح پر لکھی گئی ہے: پورے اعراب کے ساتھ بھی اور ادھورے اعراب کے ساتھ بھی اُس سے یہ بات اچھّی طرح واضح ہو گئی کہ جو قاعدے کتابت کے بیان ہو چکے ہیں اُن پر عمل کیا جائے تو بہت تھوڑے نشان لگانے سے عبارت کی تشکیل ہو جاتی ہے یعنی تلبیس نہیں رہتی اور چوں کہ اعراب بہت گھٹ گئے ہیں اور واو، یے وغیرہ حرفوں کی مختلف آوازوں میں سے ہر ایک نے ایک مستقل حرف کی صورت اختیار کر کے اپنے ماقبل حرف کو اعراب سے مستغنی کر دیا ہے اور پھر امکان بھر ایک ایک لفظ الگ لکھا گیا ہے اِس لئے لوہے کے چھاپے میں بھی کما حقہٗ آسانی ہو گی۔

آخر میں مجھے اتنا عرض کرنا ہے کہ بعض لفظ ضرور ایسے ہیں جن کو ہم مجوّزہ قاعدوں کے مطابق نہیں لکھ سکتے۔ جیسے "ہونا" کا ماضی مطلق "ہؤا"، "ہوئی" اگر ان دونوں لفظوں کو قاعدے کے

مطابق لکھے تو یوں ہوں گے: "ہُٹا"، "ہُٹی" یہ مروّج شکل سے بہت دُور پڑجاتے ہیں اور سچ پوچھو تو صوت کے لحاظ سے بھی کچھ زیادہ ٹھیک نہیں۔ پس اس خاص صورتیں کہ ہم کو ایک ایسی آواز کو کتابت میں لانا ہے جو ہوٓ اور ءٓ کے بین بین ہے، بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتابت یوں کی جائے: "ہُوءا"، "ہُوءی"

اِسی طرح بعضے لفظوں میں "وٗ" لکھا جائے مگر اُس کی آواز خفیف ہو گی جیسے "کان پوٗر" اِس کا فصیح تلفظ "کان پُر" ہے پس ایسی صورتوں میں بہتر یہی ہے کہ لفظ کی اصل کا لحاظ کرکے اُس کی کتابت کی جائے یعنی "کان پوٗر"، "شاہ جہاں پوٗر" گو کہ اُس کا تلفظ "ــــ پُر" کیا جائے۔

نستعلیق ٹھپّے کے بنانے میں جو دقّتیں ہیں اُن کا جو حل میرے ذہن میں ہے اُسے میں کسی دوسرے موقعے پر بیان کروں گا۔

کلامِ وَہّاج
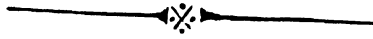
[جناب وہّاج الدین حید ر صاحب وہّاج جو آج کل ریاست بھوپال میں ایک منصب جلیلہ پر مامور ہیں اُردو کے بڑے قادر الکلام شاعر ہیں۔ حضرت وہّاج کو زمانۂ طالب علمی سے شعر و شاعری کا لپکا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ خوب کہتے ہیں۔ اُن کے کلام میں صفائی، شیرینی اور گھلاوٹ پائی جاتی ہے۔ آپ نے ایک خط اپنے دوست مولوی محمد حسین صاحب محوؔی کو لکھا ہے جس میں اپنی چند مختصر نظمیں بھی درج فرمادی ہیں۔ یہ نظمیں بہت قابل قدر ہیں اور یقین ہے کہ ناظرین لطف حاصل کریں گے۔ اڈیٹر]

.. .. نسیم باغ کا آنا اور گل و سنبل سے اٹھکھیلیاں کرنا، قاآنی نے اپنا حصہ کرلیا ہے میں نے آپ کی اُردو میں اُسی نمونہ کے مطابق، جس کا ذکر آپ سے کیا تھا۔ جو کچھ لکھا ہے وہ حسب فرمائیش لکھتا ہوں۔ مولانا عبدالحق صاحب کو بھی سنایئے گا۔ اس نمونہ کے متعلق جو نوٹ لکھا تھا وہ بھی منقول ہے۔

نوٹ : اکثر کہا جاتا ہے کہ جو موقع اظہار جذبات کا اور اُن کے اثرات کا بہاشا میں ہے، وہ اُردو میں بھی فارسی کی طرح نہیں ہوتا۔

اقتباسِ نامۂ وہاج | یہ بحث کہ فارسی اور اُردو نیز عربی بلکہ دیگر مشرقی و مغربی زبانوں کی شاعری میں یہ موقع اور اثر کس قدر ہے، طویل اور محتاج تفصیل ہے۔ اُردو زبان کے متعلق صرف یہ تسلیم کرنا لازمی ہے کہ فارسی کی طرح کی اس میں بھی عورتوں کی طرف سے خطاب نہیں کیا جاتا اور جو اثر بلحاظ نزاکت بیان و انداز تقریر عورتوں کی زبان میں ہے۔ اُس کا مقابلہ مَردوں کی زبان اور طرزِ بیان سے نہیں ہوسکتا۔ مگر غور کرنے سے ظاہر یا محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح نثر اُردو میں عورتوں کی زبان میں بالفاظ اُردو اظہارِ جذبات اور خیالات کا اندازہ کامیابی کے ساتھ ہوچکا ہے۔ نظم میں بھی ممکن العمل ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس صنف نظم پر مثل دیگر اصناف کے ہنوز توجہ نہیں کی گئی ہے۔ (ریختی کی افسوس ناک مثال خارج از بحث ہے) بالفعل میں اسی خیال کی تمثیل میں بغیر دعوۂ تکمیل

چند نمونے پیش کرتا ہوں۔ جن میں گو عورتوں کی طرف سے بہ تمام و کمال التزام نہیں ہے۔ نہ یہ اُردو میں بہ حالت موجودہ مستحسن معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بعض لوازم موجود ہیں۔ مثلاً حتی الامکان اُردو اور بھاشا کے الفاظ جو اُردو میں جوازاً مستعمل ہیں۔ اُن کی تلاش کی جائے اور فارسی، عربی وغیرہ کے الفاظ نیز ترکیبات اضافی سے اجتناب کیا جائے۔ یہ غزل تو آپ سن ہی چکے ہیں۔ جس کے دو شعر لکھتا ہوں : ؎

کیسی ادا سے آ بیٹھی دل میں — لے لوں بلائیں میں پیاری نظر کی
طور کو پھوکا جس کی لپک نے — تھی وہ تجلی تمھاری نظر کی

صبح بہار بھی آپ سن چکے ہیں۔ اس کے بھی چند شعر لکھے جاتے ہیں :

کیا صبح ہے سہانی — پہنے ہے جوڑا دھانی
سبزے میں کیا لہک ہے — پھولوں میں کیا مہک ہے
دُلھن بنی ہر کیاری — جوبن پہ ہے پھلواری
پیڑوں نے زیور پہنا — بھاری ہے کیا کیا گہنا
سنبل نے گیسو کھولے — شبنم نے موتی رولے
کلیاں چٹک رہی ہیں — چڑیاں چہک رہی ہیں
کیا گل ہے کیا گل کاری — کیا شان ہے میں واری
بیلا، چنبیلی، جوہی — ہر پھول میں ہے تو ہی
گل پر فدا ہے بلبل — تجھ پر ہے صدقے ہر گل

قاآنی کا فارسی شعر حسب ذیل ہے :-

نرمک نرمک نسیم، زیر گلاں می خزد — غلغب ایں می کند، عارضِ آں می مزد
سنبلِ ایں می کشد، گردنِ آں می گزد — گہ بچمن می چمد، گہ بسمن می وزد
گاہ بشاخِ درخت، گہ بلبِ جویبار

اُردو میں اس طرح تصویر کھینچی گئی ہے :

(۱)

دھیمی دھیمی نسیم، سبزہ پہ سوتی ہوئی سو کے اُٹھی ہی تو مُنہ ، اوس سے دھوتی ہوئی
نہروں پہ لہرا گئی، لہروں سے ٹکرا گئی کیاریوں پر چھا گئی ، پیڑوں پہ منڈلا گئی

(۲)

سرو نے لپٹا لیا ، کٹ گئی شرما گئی مُڑ گئی کترا گئی ، کَپ گئی تھرّا گئی
رُک گئی، گھبرا گئی، جُھک گئی دَہرا گئی اُس کو بھی بَل دیدیا آپ بھی بل کھا گئی

(۳)

ہلکی ہلکی نسیم، شاخوں میں بہتی ہوئی کلیوں سے ہنستی ہوئی، پھولوں میں بستی ہوئی
چوس لیئے اِن کے ہونٹ، چوم لیا اُن کا مُنہ کلیوں سے اِٹھلا گئی، پھولوں سے اِترا گئی

(۴)

بھینی بھینی نسیم! تو نے کھِلائی بہار جھوم کے مستوں کی طرح دھوم سے آئی بہار
باغ سے فردوس کے ، بَن کے دُلھن آ گئی چھوڑ کے پردیس کو اپنے وطن آ گئی

(تاج الدین حیدر (بھوپال)
بیرسٹر ایٹ لا

اصلاحِ اُردو

(جناب سید الطاف حسین صاحب کاظم)[1]

ماہ اپریل کے رسالۂ اُردو جلد سوم حصّہ دہم میں دو اور مضامین اصلاح رسم خط کے متعلق دیکھے گئے۔ جن میں متعدد و مختلف مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ علت غائی ان تمام مضامین کی یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ اُردو رسم خط رومن کیرکٹر یا دیوناگری کے برابر سہل ہو جائے، لیکن اس مدعا کے لئے ہماری بحثیں نسبتاً زیادہ باقاعدہ ہونی چاہئیں یعنی اول ان تمام تغیرات کو قلمبند کرلیا جائے جن سے ہم مطلوبہ نتیجہ حاصل کرسکتے ہیں۔ پھر بدفعات ایک ایک بات پر بحث کی جائے ہر بحث میں فریقین کو یہ اصول پیش نظر رکھنا لازم ہوگا کہ اگر ہم گزشتہ دور کی تحقیقات کو یک قلم باطل سمجھ لیں تو یہاں تک نہیں پہنچ سکتے اور سب کو آنکھ بند کرکے صحیح تسلیم کرلیں تو آگے نہیں بڑھ سکتے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اول اردو کتابت کو صحت و سہولت میں دیوناگری کی برابر بنایا جائے اس کے بعد برتری کی کوشش کی جائے اس لئے اوقاف و اعجام کی بحث ابھی قبل از وقت ہے۔

اصلاح رسم خط میں اہم بات یہ ہے کہ متحد الصوت حروف بھی خارج کر دیئے جائیں اور لکھنے میں محض تلفظ کی ہی پابندی کی جائے تو بھی اُردو حروف تہجّی کی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ رومن کیرکٹر کی برابر اُس وقت بھی سہولت پیدا نہ ہوگی۔ کیونکہ ایک عین عَہد میں اور شکل کا ہی بُعد میں اور وضع کا اور نزاع میں اور صورت کا وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ دیوناگری کو اس شترگربگی کی ہَوا بھی نہیں لگی۔

لہذا

ان چند در چند خیالات کی بنا پر جو جو مسائل بظاہر قابل غور معلوم ہوتے ہیں ایک جگہ لکھکر ہم اپنے خیالات مختصراً

---

[1] یہ مضمون مجلس کے فیصلے کے بعد وصول ہوا۔ چونکہ اس میں بعض اور امور پر بھی بحث ہے لہذا درج کیا جاتا ہے (اڈیٹر)

پیش کئے دیتے ہیں، اختلافی دلائل کے جواب میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔ اختلاف کی صورت میں ایک ہی مسئلہ زیر بحث آنا چاہیئے، اور جن جن شقوں سے اتفاق ہو وہ سب ایک دفعہ ہی لکھ دیتے جائیں تاکہ مباحث جلد کسی منفی یا مثبت نتیجے پر پہنچ جائیں۔

۱۔ حروف تہجی کی ترمیم

(۱) حروف ثقیلہ اور حروف غنہ بڑھائے جائیں۔

(۲) حروف متحدالصوت خارج کر دیئے جائیں۔

(۳) دو یاء میں سے ایک رکھی جائے۔

(۴) ژ کو بھی خارج کیا جائے۔

(۵) اقسام و خواص۔

۲۔ رسمِ خط کی اصلاح

(۱) اقسام واو

(۲) اقسام یاء

(۳) مرکبات

۳۔ تلفظ کی پابندی

(۱) حروفِ مغیرہ کا اثر۔

(۲) تنوین۔

(۳) آل اضافی۔

(۴) عیسیٰ موسیٰ وغیرہ الفاظ

(۵) گنبد۔ دُنبہ " "

(۶) واوِ معدولہ

۴۔ بعض حروف کی رسم خط

(۱) حروف تہجی ہر زبان کے جزء لا یتجزیٰ۔ عنصر یا مفرد آوازیں ہیں۔ ہر مفرد آواز کے لئے ایک شکل یا نشان مقرر کرکے اُس کا نام رکھ لیا گیا ہے، اس لئے حروف تہجی میں ایک آواز کے لئے دو شکلیں یا دو آوازوں کے لئے ایک شکل ہو تو نقص میں داخل ہے۔ یا سرے سے بعض آوازیں ہی نہوں تو وہ حروف تہجی مکمل نہیں۔ یہ ایک سادہ عقلی اصول ہے۔

۱۔ اُردو حروف تہجّی کو دیکھئے تو وہ کسی طرح اس معیار پر کھرے نہیں اُترتے اس میں ز، ذ، ض، ظ وغیرہ ایک آواز کی چند شکلیں بھی موجود ہیں اور بہت سی آوازوں کی شکلیں موجود بھی نہیں تھیں۔ چنانچہ کل کی بات ہے۔ ایک آواز کے لئے دو نشان ملاکر کام نکالا جاتا تھا اور کھا کے ہجے ک ہ ا زبر کھا کئے جاتے تھے۔ جو کسی طرح صحیح نہیں سمجھے جاسکتے۔ اس وقت کو پنجاب یونیورسٹی نے حروف تہجّی میں حروف ثقیلہ بڑھاکر رفع کردیا اور تعصب کو چھوڑکر ٹھنڈے دل کے ساتھ غور کیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ بہت اچھا کیا اور اُردو پر احسان کیا۔ لیکن جس قدر ثقیل آوازیں تھیں اول تو وہ بھی پوری نہیں بڑھائی تھیں۔ دوسرے اُن سے زیادہ غنغنی آوازیں سب کی سب باقی رہ گئی تھیں جو کثرت سے ہمارے روزمرہ میں آتی ہیں چنانچہ جس طرح کھیل، کھلونا کے صحیح ہجے بغیر حروف ثقیلہ کے نہیں ہوسکتے اسی طرح ہنسلی اور بنگلہ کے بغیر حروف غنہ کے ممکن نہیں ہیں اس لئے ہم نے اپنے جدید قاعدہ اُردو میں حروف غنہ بڑھا دیئے ہیں اور حق یہ ہے کہ اس کے لئے کسی دقیق فلسفیانہ کاوش کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ایک ضمنی مگر اہم فائدہ ان سے یہ پہنچتا ہے کہ ترکیب الفاظ میں حروف کی جو شکلیں بدل جاتی ہیں اُن سے بچہ حروف تہجّی میں ہی واقف ہوجاتا ہے۔ اور بہت جلد چل نکلتا ہے۔ المختصر ہمارے نزدیک جب تک حروف غنہ نہ بڑھائے جائیں گے اُردو حروف تہجی کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔

۲۔ متحد الصوت حروف کا اخراج بظاہر ایک بڑا معاملہ معلوم ہوتا ہے مگر جب کہ ان اشکال و حروف پر نہ اسلام کا دار و مدار ہے نہ مسلمانوں کی قومیت کا انحصار۔ تو یہ چنداں پس و پیش کا معاملہ معلوم نہیں ہوتا خصوصاً ایسی صورت میں کہ ایک یقینی و نقد فائدہ بھی نظر آتا ہے ان حرفوں کا سب سے بڑا فائدہ موجودہ حالت میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر لفظ اپنا شجرۂ نسب ساتھ رکھتا ہے اور فوراً معلوم ہوجاتا ہے کہ اس لفظ کا مادّہ کیا ہے اور

کس لفظ سے مشتق ہوا ہے۔ جس سے ہم اس لفظ کی املا میں غلطی نہیں کرتے لیکن جب تمام متحد الصوت حروف خارج ہو کر سب کی جگہ صرف ایک ہی حرف رہ جائے گا تو غلطی کا امکان و احتمال ہی نہ رہے گا لہذا یہ فائدہ محض کوہ کندن و کاہ برآوردن ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جس طرح اب عبدالعظیم کے معنی سمجھ میں آتے ہیں اس طرح ابدل آزیم کے معنی سمجھ میں نہ آسکیں گے مگر یہ بھی کچھ بات نہیں ہے۔ روٹی، ٹکڑا، کاغذ، دوات، سفید سُرخ وغیرہ صدہا الفاظ کے معنی سمجھ میں نہیں آتے اُس وقت ناموں کے معنی سمجھنے کی کیا ضرورت پیش آئیگی اب بھی ہزاروں لفظ ہیں جن کی شکل اُردو لباس میں نہیں پہچانی جاتی اور دوسری زبان کے لغت سے پتا لگایا جاتا ہے۔ اس وقت بھی عربی لغت سے وقت ضرورت ایسے الفاظ کے معنی سمجھ لیا کریں گے۔

۳۔ جب متعدد حروف اس لئے نکالے جاتے ہیں کہ وہ متحد الصوت ہیں، تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک ہی حرف بجنسہ دو جگہ رکھا جائے۔ لہذا ایک ت بھی خارج ہونے کے لائق ہے۔ جس طرح ایک واو تین صورتوں میں کام دے سکتا ہے۔ ایک تی بھی دے سکتی ہے۔ اس میں تعمیم کا زرّیں اصول بھی نہیں ٹوٹتا۔

۴۔ علیٰ ہذا جب متحد الصوت حروف باوجود اس کے کہ ان کے الفاظ ہمارے روزمرہ میں موجود ہیں نکالے جانے ضروری قرار دیئے جائیں۔ تو ژ جس کا کوئی لفظ ہمارے روزمرہ میں نام کو نہیں آتا کیا وجہ ہے کہ حروف تہجّی میں داخل رکھا جائے۔

۵۔ اس تمام اضافہ و اخراج کے بعد حروف تہجّی کی تین قسمیں ہوگئیں

ا ــ حروف قدیمہ = ۲۶

ا ب پ ت ٹ ج چ خ د ڈ ر ز س ش غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ء ی

ب ــ حروف ثقیلہ = ۱۴

بھ پھ تھ ٹھ جھ چھ دھ ڈھ ڑھ کھ گھ لھ مھ نھ

ج ــ حروف غنّہ = ۱۲

اںٔ بۂ پۂ جۂ ڈۂ کۂ مۂ ہۂ بھںٔ چھںٔ دھںٔ گھںٔ

حروف قدیمہ بھی کئی قسموں میں منقسم ہو سکتے ہیں مثلاً :

ا - حروف علت ‌ آ ‌ و ‌ ی

ب - ‌ ر ‌ ناقصہ ‌ ڑ ‌ ء ‌ ن ‌ جن سے کوئی لفظ کبھی شروع نہیں ہوتا۔

ج - ‌ ر ‌ منفصل جو لفظ کے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور ملا کر نہیں لکھے جاتے مثلاً آ ر ز و ڑ د ڈ ذ

د - ‌ ر ‌ متصل مثلاً ج ب ن وغیرہ جو اول و آخر لفظ کے ہر حصے میں ملا کر لکھے جاتے ہیں

ہ - یہ کلیہ ہے کہ حروف غنہ ساکن یا موقوف صورت میں کبھی نہیں آتے ہمیشہ صرف متحرک ہوتے ہیں

(۲) رسم خط -

۱ - واو تین طرح کی ہوتی ہے۔ واو مجہول، جس کے ماقبل حرف پر غیر جنس حرکت ہو۔ جیسے لَو کے لام پر زبر۔ دوسری واو معروف جس کے ماقبل پر حرکت ہم جنس یا پیش ہو۔ جیسے لُو۔ تیسری واو متوسط جس پر کوئی حرکت نہ ہو ہم جنس نہ غیر جنس۔ اس کی آواز دونوں واووں کے بین بین ہوتی ہے جیسے لو

۲ - واو کی طرح یاء کی بھی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ حرکت ہم جنس اور غیر جنس کے لحاظ سے آوازیں تبدیل ہوتی ہیں۔ یہ امر تقریباً طے شدہ ہے کہ واو اور یاء متوسط کے ماقبل پر کوئی حرکت ہم جنس یا غیر جنس نہیں ہوتی۔

۳ - واو اور یاء کے علاوہ مرکب الفاظ میں مولوی سید ہاشمی صاحب کی رائے کے بموجب جو اجزاء لفظ ترمیم ہو کر مستقل لفظ نہیں رہے وہ ملا کر لکھنے چاہئیں۔ اور جو اجزاء اصلی حالت میں بامعنی لفظ ہیں اُن کو جدا جدا لکھنا مناسب ہے جیسے پنگھٹ اور کام چور

(۳) تلفظ کی پابندی

۱ - حروف معزرہ کا اثر! اس میں پروفیسر نعیم الرحمٰن صاحب کی رائے قابل تسلیم ہے۔ کہ جن الفاظ کے آخر میں ہاء مختفی سے پہلے ع ہو تو ہاء مختفی کو یاء سے بدل دینا چاہئیے۔ مگر جب ع حروف تہجی سے خارج ہو جائے گا، تو الف یاء سے بدلا جائے گا۔

۲ - تنوین کی جگہ بھی نوُن لکھا جانا مناسب ہے۔ چنانچہ فوراً سے فورن لکھا جائے گا۔

۳ - آل اضافی کو اُڑا کر تلفظ کی پابندی سے صرف لام ساکن لکھا جائے اور اس کا ماقبل مضموم ہو۔ جیسے عبدُلکریم۔

۴ - عیسیٰ - موسیٰ الفاظ میں یاء کی جگہ الف لکھا جائے گا۔

۵ - گنبد، دُنبہ میں صاف میم ہی لکھا جائے۔

۶ - واو معدولہ کو معدوم کر دیا جائے اور سیدھے طور سے خاب، کمخاب، خُراک لکھنا مناسب ہوگا۔

ادب

دیوانِ غالب

۱۔ علی گڑھ کے مکتبۂ جامعۂ ملّیہ اسلامیہ نے غالب کے اُردو کلام کو نہایت آب و تاب سے شائع کرکے اُردو بولنے والی قوم پر ایک بڑا احسان کیا ہے ایسی اچھی چھپائی اور اتنی خوبصورت جلد میں کسی اُردو شاعر کا دیوان اب تک نظر سے نہیں گزرا تھا۔ کتاب شہر برلین (جرمانیہ) کے مشہور ایرانی چھاپے خانے "مطبع کاویانی" میں دو رنگوں میں چھاپی گئی ہے۔ سیاہ متن کے گرد سرخ جدول بہت بھلی معلوم ہوتی ہے شاعر کا تخلص جابجا سُرخ حرفوں میں نمایاں ہے تقطیع جیبی ہے اس لئے ہر صفحہ پر زیادہ سے زیادہ چودہ مصرعے آئے ہیں۔ کتاب کی لوح کے مقابل غالب کی رنگین تصویر لگی ہے جو جرمانی رنگ آمیزی اور چھپائی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ کتاب کی جلد کپڑے کی ہے جس پر سنہرا کام اور اُس کے بیچ میں سیاہ نستعلیق حرفوں میں کتاب کا نام بہت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ پشتے پر اوپر کی جانب ایک سیاہ چیپٹی پر مہین سنہرے نستعلیق خط میں کتاب کا نام بڑے سلیقہ سے چھاپا گیا ہے۔

۲۔ چونکہ کتاب نسخ ٹھپے کے حرفوں میں چھپی ہے اس لئے لمبی ے کہیں نہیں دکھائی دیتی مگر معروف یٰ کے نیچے دو نقطے لگا کر اسے ممتاز کر دیا ہے اور ٹ ڈ ڑ پر بجائے ط کے چار نقطے سلیقے سے لگائے ہیں جو ہرگز بُرے معلوم نہیں ہوتے۔

۳۔ الغرض غالب کا یہ نسخہ ظاہری خوبیوں میں اپنا جواب نہیں رکھتا ہے اس لحاظ سے قیمت بھی بہت کم ہے یعنی صرف (سے۔)

۴۔ افسوس صرف اس قدر ہے کہ صحت کا کافی انتظام نہیں کیا گیا۔ بعض جگہ کوئی حرف چھپنے سے رہ گیا ہے

مثلاً ص ۱۳ س ۲ (نیچے سے)، ص ۴۱ س اخیر ص ۴۷ س ۳، ص ۶۸ س ۱ (نیچے سے)، ص ۱۹۷ س ۹ ص ۲۰۱ س ۴ (نیچے سے) ص ۲۴۸ س ۵ (نیچے سے)، ص ۲۷۲ س ۵ (نیچے سے) کہیں کوئی پورا لفظ غایب ہے جیسے ص ۲۳۲ س ۶ کے شروع اور ص ۲۶۹ س ۱۱ کے آخر سے "غالب"۔

۵۔ چند اور غلطیاں بھی نظر پڑیں جن کی تصحیح یہاں کی جاتی ہے:۔ ص ۹ س ۷۔ "سوئے ہیں" کی جگہہ "سوتے ہیں" چاہیئے۔ ص ۱۳ س ۴۔ "نہ" کے بجائے "نہ" چاہیئے۔ ص ۱۱۵ "کسی کی خواب" کی جگہہ "کسی کے خواب" چاہیئے ص ۱۱۹ س ۱۱ "ہو" کی جگہہ "کہ" چاہیئے اور پورا مصرعہ یوں لکھا جائے: بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر کہ، مجھ کو قرار ص ۱۲۱ س ۵ (نیچے سے) "ہوا" کی جگہہ "ہو" چاہیئے ص ۱۲۸ س ۱۰ "ٹھنٹا" کی جگہہ "ٹھنڈا" چاہیئے ص ۱۸۷ س ۷ "سمجھ کہ" کی جگہہ "سمجھ کے" ہونا چاہیئے۔ ص ۲۰۷ س ۷ "غالب" مصرعے میں سماتا نہیں "اسد" چاہیئے ص ۲۳۷ س ۹ "تیر اگزر" کی جگہہ "تیر اگزر" چاہیئے۔ ص ۲۶۶ "اب کے سال" اور "اب کے بار" چاہیئے۔ ص ۲۷۲ س ۴ "فشردن" کی جگہہ "فسردن" چاہیئے۔

۶۔ کہیں کہیں وقف کے نشان لگائے گئے ہیں لیکن اس میں بھی احتیاط سے کام نہیں لیا گیا۔ جہاں ضرورت تھی وہاں اکثر نشان نہیں لگائے گئے اور بعض جگہہ غلط نشان لگے ہیں۔ مثال کے طور پر چند مقامات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ص ۳۸ س ۷ "لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں، لگاؤ" ص ۱۱۸ س ۱۰ "کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیوں کر ہو" ص ۱۲۸ س ۴ "جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے" ص ۱۴۶ س ۷ "اور اگر ہو بھی؟" ص ۱۶۵ س ۲ "دل بھی یارب کئی دئے ہوتے" ص ۱۶۶ س ۲ "وای؟"

پہلی مثال میں سکتے کا نشان "سمجھیں" کے بعد نہیں بلکہ "لاگ ہو" کے بعد اور دوسری مثال میں "نہ ہوا" کے بعد ہونا چاہیئے تھا۔ تیسری میں سکتے کا اور چوتھی میں استفہام کا نشان ہونا ہی نہ چاہیئے تھا۔ پانچویں و چھٹی مثال میں استفہام کے نشان کی جگہہ خطاب کا نشان (!) چاہیئے تھا۔ ذیل میں بعض مثالیں درج کی جاتی ہیں اگر ان میں ایک آدھ جگہہ وقف کے نشان ہوتے تو متن کے پڑھنے والے کو بڑی آسانی ہو جاتی۔ (نشانات جو قوسین کے اندر نظر آتے ہیں وہ میری تجویز ہے۔

ص ۹۴ س ۵ "جو ہوا غرقۂ مے [،] بخت رسا رکھتا ہے" ص ۱۰۱ س ۲ (نیچے سے) سب [،] رقیبوں سے ہوں ناخوش [؛] پر زنانِ مصر سے ، ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں"۔

ص ۱۱۹ پر پہلے اور پانچویں شعر کے علاوہ بھی ہر شعر کے دوسرے مصرعے میں " تو کیوں کر ہو" سے پہلے سکتے کا نشان ہوتا تو بہتر تھا۔

ص ۱۴۵ س ۲ (نیچے سے) " کروں بے دادِ ذوقِ پر فشانی عرض [،] کیا قدرت؟ ص ۲۰۸ س ۷ ۔ " تکلف برطرف [،] ہے جاں ستاں تر لطفِ بدخویاں" ص ۲۲۵ س ۷ " کون ہے [،] جس کے در پہ ناصیہ سا" ص ۲۵۸ س ۹ " تار ریشم کا نہیں [،] ہے یہ رگِ ابرِ بہار"۔

۷۔ الف پر زیر یا پیش کہیں نہیں لگایا گیا جس سے "اِس" اور "اُس" میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔ ہمزہ کی کتابت بالکل بے اصول ہے "سخت جانی ہائے"۔ "جوئے شیر"، "تروئے کار"، "نسخہ ہائے وفا"، "دریائے خوں"، "حنائے پائے خزاں" وغیرہ میں ہمزہ نہ لکھنا چاہیے۔ اسی طرح "بوئے گل" کی جگہ "بوئی گل" اور "پائے ثبات" کی جگہ "پائی ثبات" اور ص ۱۲۸ پر اخیر سطر میں "فرماں روائے" کی جگہ "فرماں روائی" لکھا گیا ہے جو بالکل غلط ہے یاد رہے کہ کسرۂ اضافت کا بدل ہمزہ بھی ہے اور یٰ بھی پس ایک اضافت کے لئے ہمزہ اور یٰ دونوں لکھنا درست نہیں ہوسکتا۔ مختفی ہ پر ختم ہونے والے لفظوں کے بعد ہمزہ سے اور آ یا وٗ پر ختم ہونے والے لفظوں کے بعد یٰ سے اضافت کو ظاہر کرنا چاہیئے۔ بے شک عام طور پر اضافت کی کتابت میں بڑی بدنظمی پھیلی ہوئی ہے مگر دیوانِ غالب کے زیرِ تبصرہ نسخے کے ترتیب دینے والوں کو اس بدنظمی میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور بھی جگہ ہمزہ بے محل لکھا گیا ہے مثلاً ص ۱۸ س ۷ "دیدۂ و دل" (یعنی "دیدہ و دل") ص ۱۰۸ س ۱ "دیئے" (یعنی "دیے") ص ۹۶ س ۹ "فتنۂ و فساد" (یعنی فتنہ و فساد)۔

۸۔ ایک دوسری بدنظمی اردو کی کتابت میں یہ بہت عام ہے کہ جس جگہہ پر ے بولتے وہاں بھی ہ لکھتے ہیں جیسے "بندہ نے کہا"۔ "پردہ کے پیچھے" وغیرہ۔ غالب کے اس نئے نسخے میں عموماً ایسا نہیں کیا گیا ہے۔ مگر کہیں کہیں غلط رسمِ خط اختیار کرلیا ہے۔ چنانچہ ص ۱۱ س ۳ (نیچے سے) "بت کدہ کا در" ص ۳۶ س ۳ "ریختہ کے" ص ۱۱۳ "بت خانہ میں" ص ۱۶۳ س ۷ "شعلہ میں" ص ۲۰۶ س ۵ "کعبہ سے" اور س ۷ "مے خانہ کا" حال آں کہ ہونا چاہیئے تھا : "بت کدے کا در"، "ریختے کے"، "بت خانے میں"، "شعلے میں"، "کعبے سے"، "مے خانے کا" ص ۱۰۵ س ۱

شعر میں "آئینہ" کے بجائے "آئینے" لکھنا نہایت ضروری ہی: ہوئے اُس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے۔
پرافشاں جوہر آئینے میں مثل ذرّہ روزن میں۔

۹۔ لفظوں کو الگ لکھنے کی کوشش کی گئی ہی، لیکن بعض جگہ نہایت بے پروائی کے ساتھ دو ایسے لفظوں کو ملا کر لکھ دیا ہے جن کا ملانا غلط ہی جیسے "اسقدر"، "رضوانکا"، "رضوانسے"، "نسیانکا"، "شبنمستانکا" "خستہ جانکی" اسی طرح بعض جگہوں پر دو لفظوں یا ایک ہی لفظ کے ٹکڑوں میں غلط فاصلہ دے دیا ہی جس سے پڑھنے والے کو اکثر دھوکا ہوتا ہے" جیسے "مشکل پسند آیا" کی جگہ "مشکل پسند آیا" لکھ دیا ہے۔ یا ص ۲۳۶ س اخیر "گو درز" لکھنے کے عوض "گو درز" لکھا ہے۔

یہ نہیں معلوم ہوتا کہ "رہیو"، "کہیو" وغیرہ کی ی پر تشدید کس قاعدے سے لگائی گئی۔ شاید یہ غلطی بدایوں کے چھپے ہوئے نسخے سے اخذ کی گئی ہی۔

۱۱۔ "تماشا" کا املا عموماً صحیح لکھا گیا ہے لیکن دو ایک جگہ غلط اِملا "تماشہ" بھی نظر پڑا (ص ۸، ۲۳) یاد رکھنے کی بات ہی کہ عربی لفظوں میں تماشا، تقاضا وغیرہ اور فارسی ترکی لفظوں میں تمغا، چلپا، ناشتا وغیرہ الف سی صحیح اور ہ سے غلط ہیں۔ بعضے حضرات تو ستم کرتے ہیں کہ "اِستعفا" کو "استعفیٰ" لکھتے اور اسی کو عربی صرف کے مطابق سمجھتے ہیں یہ نہیں جانتے کہ عربی میں "اِستعفاء" (استفعال کے وزن پر) ہی۔ اور "طالب" کی جمع یاروں نے "طُلبا" بنا رکھی ہی حالاں کہ عربی میں "طلبہ" ہے۔

۱۲۔ ص ۱۶۲ س ۱ "باربد" کی دوسری ب پر خاص اہتمام سے پیش لگایا گیا ہی۔ لیکن یہ درست نہیں بلکہ صحیح تلفظ "بارَبد" ہی فارسی میں کئی لفظ ایسے ہیں جن پر لاحقہ بَد (بمعنی صاحب) داخل ہُوا ہی جیسے موبَد سپہبَد، بارَبد قدیم فارسی زبان میں یہ لفظ پت تھا (سنسکرت پَتِ)

۱۳۔ غالب کے دیوان کے قابلِ اطمینان نسخوں کے متن سے اس متن میں بعض ایسے اختلافات نظر پڑے جن پر مجھے نہایت تعجب ہوا اور جن کا حل سوا اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ شاعر کو اصلاح دینے کی کوشش کی گئی ہی۔ مگر یہ بات تصحیح کے اصول کے بالکل خلاف ہی۔ مصحح کو متن میں تغیر تبدّل کرنے کا ہرگز اختیار نہیں ہی البتہ اگر مختلف نسخوں کی قرأت مختلف ہو تو وہ ایک کو ترجیح دے سکتا ہی یا اگر سب قرأتیں ایسی ہوں کہ معنی بنتے ہی نہ ہوں تو اپنے قیاس سے ایک نیا لفظ

متن میں داخل کرے لیکن اس کی اطلاع ضرور کردے افسوس ہی کہ غیر محتاط مصحح یا شارح اس اصول کی پرواہ نہیں کرتے چنانچہ مولوی ابوالحسن صاحب بدایونی نے حافظ کے کلام میں سینکڑوں تصرف کئے ہیں فرماتے ہیں کہ :-

"دگر کنم طمع نیم بوسہ صد افسوس
زحقّہ دہنش چوں شکر فرو ریزد

میں "افسوس" سہو کاتب ہی "دشنام" ہونا چاہئے" لیکن اگر وہ کسی فارسی لغت کی کتاب کی طرف رجوع کرتے تو یقیناً ایسے دہوکے میں نہ پڑتے کیونکہ ان کو معلوم ہو جاتا کہ "افسوس" کے جو معنی اُردو میں مشہور ہیں اس کے سوا بھی یہ لفظ کچھ معنی رکھتا ہی - کتاب زیر تبصرہ ص ۱۷

حیف اس چار گرہ کپڑہ کی قیمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

پہلے مصرعے میں بھی "قسمت" ہی "قیمت" نہیں - مصحح نے غالباً حسرت کے خیال کا تتبع کیا -

ص ۳۸ قاصد کی اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے

اصل میں "کی" نہیں "کو" ہے اور یہ فارسی محاورے کے مطابق ہے

ص ۵۳ کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق
ہے مکرّر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

اصل میں "میں" ہے نہ کہ "پہ" -

ص ۸۷ تماشا کر اے محوِ آئینہ داری .
تجھے کس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں !

اصل نسخے میں "کر" نہیں بلکہ "کہ" ہے جس کو یقیناً "کر" پر ترجیح ہے -

ص ۱۰۰ زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ .
وگرنہ ہم تو زیادہ توقع رکھتے تھے

توقّع کا عین گرتا ہے اصل نسخے میں دوسرا مصرعہ یوں ہی :

وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے تھے

ص ۲۵۵

وضع میں اِس کو اگر جانیے قاف تریاق

اصل نسخے میں "جانیے" نہیں "سمجھئے" ہے۔

ص ۲۵۸ دیکھیں کہہ دے کوئی اس سہرے سے بہتر سہرا

لیکن غالب نے تو یوں کہا ہے:

دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

ص ۲۶۲ پر جو چوتھا شعر درج ہے اُسے دو شعر قبل یعنی پہلے شعر کے بعد ہی درج ہونا چاہئیے تھا۔

ص ۲۶۸ ہے قلم میرا ابر گوہر بار

غالب نے اس مقام پر "قلم میری" لکھا ہے کسی کو کیا اختیار ہے کہ اُستاد کے لفظ کو بدلے۔

مکتبۂ جامعۂ ملیہ کے کارپردازان سے امید ہے کہ آئندہ اِشاعت میں صحت کا بہتر انتظام کریں گے اور غالب کو اصلاح دینے کی گستاخی کی تکرار نہ کریں گے۔

(ڈاکٹر عبدالستار صدیقی)

کرشمۂ عشق

یہ دیوان پیر شیر محمدؐ صاحب عاجز صدیقی چشتی نظامی کا ہے۔ اُن کے خاندان میں بڑے بڑے بزرگ ہوئے ہیں اور تصوف کا چراغ آپ کے گھرانے میں ہمیشہ روشن رہا ہے۔ خود بھی اس کا ذوق رکھتے ہیں۔ غزلیات میں کوئی خاص بات نہیں۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اگرچہ آپ کا وطن علاقہ سندھ میں ہے اور وہیں آپ نے نشو و نما پائی مگر زبان صاف اور فصیح ہے اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اہل زبان کا کلام نہیں۔

خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی نے اس پر دیباچہ لکھا ہے اور اکثر صاحبوں نے تقریظیں اور تاریخیں تحریر فرمائی ہیں۔ کتاب اعلیٰ حضرت حضور پر نور خسرو دکن خلد اللہ ملکہٗ کے نام سے معنون کی گئی ہے (حجم ۱۲۲ صفحہ قیمت عہ/ - پتہ - مینیجر کتب خانہ چشتی صدیقی ۔ گھانگہ خورد - ڈاک خانہ جلال آباد

ضلع فیروز پور)

ترانۂ حبیب یہ بھی پیر صاحب موصوف کی ایک نعتیہ نظم ہے۔ یہ نظم بہت سیدھی سادی صاف اور بے تکلف لکھی گئی ہے جسے لڑکے لڑکیاں بھی آسانی سے پڑھ سکتی اور یاد کر سکتی ہیں۔ بحر بہت رواں اور آسان ہے (چھوٹی تقطیع پر ۳۶ صفحے۔ کاغذ اچھا۔ لکھائی جلی اور صاف قیمت ۵ر)

سیر و سفر یہ ہز اکسلینسی راجہ راجایان سرکشن پرشاد مہاراجہ بہادر یمین السلطنۃ کے سی آئی ای۔ جی سی آئی ای کا سفرنامہ اورنگ آباد دولت آباد خلد آباد، بمبئی، احمد آباد، اجمیر متھرا، آگرہ وغیرہ مقامات کا ہے۔ جہاں کہیں تشریف لے گئے ہیں وہاں کے حالات بے تکلف بیان کئے ہیں۔ تاریخی حالات کا بھی جابجا اضافہ کیا ہے جس سے کتاب میں لطف پیدا ہو گیا ہے۔ مہاراجہ یمین السلطنۃ بہادر حیدر آباد کے نہایت روشن خیال امیر ہیں علمی ذوق رکھتے ہیں۔ شعر و سخن کے دلدادہ۔ اردو نظم و نثر دونوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ آپ کا کلام ملک میں مشہور ہو چکا ہے۔ یہ سفرنامہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

مختار الصرف (یعنی تصریف انگریزی و اردو) ہر زبان میں فعل سب سے مشکل ہوتا ہے۔ جب تک فعل کی مختلف گردانوں اور صیغوں پر قدرت حاصل نہ ہو، زبان نہیں آسکتی۔ مولوی سید مختار احمد صاحب نے بڑی تفصیل کے ساتھ انگریزی فعل To come کی تمام گردانیں ترتیب کے ساتھ مع اردو ترجمہ اور مثالوں کے اس رسالہ میں لکھ دی ہیں اور فعل کے استعمال کی کوئی صورت ایسی نہیں جو اس میں درج نہو۔ طلبہ کو اس سے بڑی مدد ملے گی اور وہ آسانی کے ساتھ انگریزی فعل کے مختلف استعمالوں سے واقف ہو جائیں گے۔

(کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔ قیمت درج نہیں۔ مؤلف سے مل سکتی ہے۔ پتہ بیگم بازار۔ حیدر آباد دکن)

تاریخ

تاریخ الامّت - حصّہ سوم - خلافت بنی اُمیہ

تاریخ الامّت - مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری، استاد تاریخ اسلام جامعۂ ملّیہ اسلامیہ علی گڑھ کی تصنیف سے ہے۔ پہلے دو حصّے اس سے قبل شایع ہو چکے ہیں۔ یہ تیسرا حصّہ خلافت بنی امیہ پر ہے۔ یہ تاریخ مولانا نے صاف اور شستہ زبان میں لکھی ہے جو طلبا اور عام شایقین کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔ بنی امیہ کی تاریخ پڑھنے کے قابل ہے اس سے معلوم ہوتا ہی کہ کیونکر خلافت بادشاہت ہوگئی۔ جمہوریت کا رنگ بدل کر استبداد تک پہنچ گیا اور آزادی مفقود ہوکر غلامی آگئی۔ مولانا نے تمام واقعات سادہ طور سے بیان کر دئے ہیں اور تعصب اور طرف داری کو دخل نہیں دیا۔ جامعہ ملیہ قابل مبارک باد ہی کہ اس نے طلبا، اور عام پڑھنے والوں کے مطالعہ کے لئے کتابوں کا اچھا ذخیرہ جمع کر دیا ہی جس میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہی۔ یہ کتاب اچھے کاغذ پر چھپی ہے۔ لکھائی اور چھپائی بھی اچھی۔ حجم ۴۶۵ صفحے قیمت عہ ہی جامعۂ ملیہ علی گڑھ سے مل سکتی ہی۔

مذہب

(۱) **بصائر القرآن** قرآن پاک میں جا بجا مختلف قصّے اور روایتیں بیان کی گئی ہیں۔ جن کا مقصد لوگوں کو نصیحت دینا یا عبرت دلانا یا کوئی مفید سبق سکھانا ہی۔ مولوی محمّد مہدی صاحب اسسٹنٹ مہتمم دفتر تاریخ ریاست بھوپال نے یہ بڑا اچھا کام کیا ہی کہ ان تمام قصّوں کو ایک جگہہ جمع کر کے کتاب کی صورت میں شائع کر دیا ہی۔ اس کتاب میں زیادہ تر انبیاء علیہم السلام کے قصّے ہیں اور علاوہ اُن کے دوسرے قصّے بھی مذکور ہیں جن کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہی۔ قابل مؤلف نے یہ تمام قصّے بے کم و کاست اسی طرح بیان کئے ہیں جس طرح قرآن پاک میں لکھے ہوئے ہیں البتہ قوسین میں وضاحت کے لئے کہیں کہیں الفاظ اور جملے اضافہ کر دئے ہیں۔ اس کے سوا انھوں نے

اپنی طرف سے کوئی کمی بیشی نہیں کی۔ اور سب قصّے صاف سیدھے اور شستہ زبان میں بیان کئے ہیں جسے چھوٹے بڑے سب آسانی سے پڑھ سکتے ہیں۔ ایک مفید کام یہ کیا ہے کہ ہر قصّے کے آخر میں اس کے نتائج بھی لکھ دئے ہیں۔ جو بہت مفید اور سبق آموز ہیں۔

(کتاب تقطیع پر بہت اچھی چھپی ہے۔ قیمت عہ۔ حجم ۲۰۸ صفحے۔ ظل السلطان بک ایجنسی بھوپال سے مل سکتی ہے)

(۲) اُسوۂ صحابیات

مولوی عبدالسلام صاحب ندوی نے یارانِ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے درس آموز و ہمت افزا و جذبات آفریں زندگی کے بعض خصائص اپنی تالیف "اسوۂ صحابہ" میں آشکار کئے تھے۔ اس میں صحابیات کے تذکرے بھی تھے۔ جو اب ایک علیحدہ رسالہ کی صورت میں "اسوۂ صحابیات" کے نام سے نظر افروز ہوا ہے۔

کوئی شک نہیں کہ جمع حوادث میں کافی محنت کی گئی ہے۔ بڑی بڑی کتابوں کے حوالے دئے ہیں جن میں بعض کے مقابلے ہم نے بھی کئے اور صحیح پائے۔ تاہم جناب مولوی صاحب کی محویت و استغراق اگر اجازت دے تو ایک دو باتیں عرض کرنے کی ہیں:

(۱) گوناگوں عنوانات میں کوئی بھی ایسا نہیں جو تشنۂ بحث نہ ہو۔

(۲) ہر ایک بیان مزید وسعت کا نیازمند ہے جس کے لئے کچھ تھوڑی سی اور بھی کاوش درکار تھی۔

(۳) جن مآخذ سے اقتباس یا استنباط کیا گیا ہے ویسے ہی بلکہ بعض صورتوں میں وہی ایسے حقایق پر بھی روشنی ڈالتے ہیں جو اس رسالہ میں چھوڑ دئے گئے مثلاً حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے تفقہ کا سرسری بیان کافی نہ تھا جبکہ جن کتابوں سے یہ بیان ماخوذ ہے انھیں میں تفصیل بھی ہے۔

(۴) صحابیات کی زندگی کا خاکہ جس طرح بھرا گیا ہے وہ کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں موجودہ کوشش کہ حدیث کی ابتدائی کتابوں سے چند معمولی باتیں لے لیں، کوہ کندن وکاہ برآوردن سے کچھ کم نہیں۔

بہرحال رسالہ اچھا ہے، اور بہت اچھا۔ ملک کو اس کی قدر اور قوم کو اس سے عبرت پذیر ہونا چاہئے۔

(قیمت کتاب عہ ہے۔ مسلم پرنٹنگ پریس اعظم گڑھ سے طلب کی جائے)

(۳) القول الفرقان فی توضیح حقائق القرآن

یہ رسالہ مولوی محمد علی صاحب ایم اے (کنٹب) نے حقائق القرآن کے جواب میں قوی دلائل اور پرزور طریقہ سے لکھا ہے۔ مولوی صاحب موصوف کیمبرج کے ایم اے اور رنگیلر ہی نہیں بلکہ عربی زبان اور علوم دینی میں بھی پوری دستگاہ رکھتے ہیں۔ اور قرآن کے مطالب و معانی پر بھی پوری طرح حاوی ہیں۔ مصنف نے حقائق القرآن میں قرآن مجید سے حضرت عیسی علیہ السلام کی فضیلت اور ان میں الوہی صفات کے اثبات کی کوشش کی ہے اور چودہ دلائل اپنے دعوی کے ثبوت میں پیش کئے ہیں۔ مولانا نے اس کی بڑی خوبی سے عقلی اور نقلی دلائل سے تردید کی ہے اور آخر میں عیسوی اور قرآنی تعلیم کا مقابلہ کیا ہے جو پڑھنے کے قابل ہے جو صاحب اس قسم کی بحثوں اور فن مناظرہ سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ اس رسالہ کو بہت پسند کریں گے۔

(چھوٹی تقطیع۔ حجم ۱۱۶ قیمت ۸/۔ دفتر جمعیت دعوت و تبلیغ اسلام (۲۴۱۰) ایسٹ اسٹریٹ پونا سے مل سکتا ہے۔

---

(۴) اسلامی مساوات

اس رسالے میں مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب آنریری سکرٹری مسلم ایسوسی ایشن پھلواری شریف نے اسلامی تعلیم اور تاریخ سے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام میں رنگ روپ، ذات پات کی کوئی تمیز نہیں اور سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ افسوس ہے کہ کتاب اچھی نہیں چھپی۔

(چھوٹی تقطیع حجم ۲۶ صفحے قیمت ۸/۔ منیجر مسلم ایسوسی ایشن بک ڈپو پھلواری شریف۔ پٹنہ سے مل سکتی ہے۔

صنعت و حرفت

پارچہ بافی

یہ کتاب ایم ایچ بھٹی بی اے، بی ٹی کی تالیف ہے۔ جس میں دیسی کرگھے اور فلائی شٹل پر کپڑا تیار کرنے کے آسان سے آسان طریقے بتائے گئے ہیں اور تمام ضروری مدارج

یعنی سوت سے لے کر کپڑا بننے تک کے حالات بہت شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ اردو زبان میں اب تک ایسی جامع کتاب اس فن پر شایع نہیں ہوئی۔ جابجا تصویروں کے ذریعے سے ضروری امور کو واضح کیا ہے۔ کتاب بہت صاف اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہے اور قابل مؤلف کی نظر تمام جزئیات پر معلوم ہوتی ہے اور ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی اس خوبی اور تفصیل سے بیان کیا ہے کہ ناواقف شخص بھی سمجھ جائے اور کام کرنے لگے۔ ایسے وقت میں جب کہ تمام اقوام ہند کے بزرگوں نے دیسی کپڑا پہننے اور چرخا کاتنے کو جزو ایمان قرار دیا ہے، یہ کتاب رہنما کا کام کر سکتی ہے۔ نیز تمام مدارس صنعتی میں بطور نصاب کے داخل کی جا سکتی ہے۔ اس کتاب نے ایک بڑی کمی کو پورا کیا ہے اور اس کے قابل مؤلف منشی محمد حسین صاحب بی۔ اے، بی ٹی قابل مبارکباد ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اہل ملک ضرور اس کی قدر کریں گے۔

(کتاب اچھی چھپی ہے۔ حجم ۱۷۲ صفحے قیمت درج نہیں۔ کارخانۂ لباس۔ گوجرانوالہ (پنجاب) سے مل سکتی ہے)

اردو کے جدید رسالے

اردوے معلی اردوے معلیٰ کا نام سنتے ہی اردو کے مشہور شاعر اور ادیب مولانا حسرت موہانی یاد آجاتے ہیں۔ اُن کے رسالے نے اردو زبان کی بہت بڑی خدمت کی ہے جو ہمیشہ شکرگزاری کے ساتھ یاد کی جائے گی۔ اب اسی نام سے ایک بتیس صفحہ کا ماہوار رسالہ دلی سے قربان علی صاحب بسمل کی اڈیٹری میں شایع ہوا ہے۔ اردو معلیٰ کو دلی سے خاص نسبت ہے لیکن اپنے نام اور مقام کے لحاظ سے جیسا یہ رسالہ ہونا چاہیے تھا ویسا نہیں ہے۔ مضمون زیادہ تر دوسرے رسالوں سے ماخوذ ہیں اور باستثناء دو کے سب کے سب خیالی ہیں مثلاً دردِ دل، آخری وقت، عذرا کی سرگزشت، عالم خیال، تصویر جاناں، ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر۔ آخر میں چند صفحے نظم کے ہیں۔ ان میں بھی بعض نظمیں منقول ہیں۔ لیکن قیمت اس قدر کم ہے کہ اس میں اس سے بہتر رسالے کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ یعنی صرف ایک روپیہ سالانہ ہے۔

مرج البحرین

یہ رسالہ بھی دلی سے شایع ہوا ہی۔ رسالے کے مقاصد کے متعلق اڈیٹر صاحب فرماتے ہیں کہ رسالہ کی اجرا کا سبب یہ ہی کہ ہم کسی مخصوص صنف کو تو رسالہ کے لئے موزوں نہ کریں کیونکہ بعض رسالے محض مذہبی شان کے ساتھ مخصوص ہیں، بعض تاریخی حالات کے ساتھ، بعض محض طبی ہیں اور بعض ادبی رنگ میں ہیں اور بعض مختلف صنف میں بھی ہیں۔ لیکن ہم انشاءاللہ مذہب اور طب اور تاریخ و ادب کے ماسوا گزشتہ علوم وفنون اور متقدمین کے پسندیدہ کارآمد مقالات بھی درج رسالہ کریں گے، اس سے رسالہ کے مقاصد اور اس کی شان تحریر دونوں ظاہر ہیں۔ مختلف مضامین ہیں۔ لیکن ان میں یا تو مذہبی رنگ ہی یا بالکل خیالی ہیں۔ اور جن کا تعلق مذہب سی ہے اُن میں بھی تخیل غالب ہی۔ چند نظمیں میں بھی ہیں۔ لکھنے والوں میں علاوہ اور صاحبوں کی خواجہ حسن نظامی صاحب، ملا واحدی صاحب، راشد الخیری صاحب، آغا شاعر صاحب، حکیم محمد نذیر صاحب اور حکیم سید ناصر نذیر صاحب بھی ہیں۔

اڈیٹر حافظ محمد باقر علی صاحب امین چشتی القادری۔ حجم ۵۰ صفحے قیمت سالانہ دو روپیہ۔ قاسمی پریس دہلی سی شایع ہوتا ہے۔

پنجابی خیالات

اس نام کا ماہوار رسالہ بھی دلّی ہی سے شایع ہوا ہی۔ اڈیٹر احمد وجودی۔ سرپرست خواجہ حسن نظامی۔ رسالے کا نام، اڈیٹر اور سرپرست تینوں کے تینوں عجیب وغریب ہیں۔ سرورق پر اس کا مقصد یہ لکھا ہی "ہر قسم کے پنجابی خیالات کی معلومات عامہ کا پورا ذخیرہ' پنجاب کے تمام اخبارات ورسائل ومجالس عامہ کی تحریروں وتقریریں کا خلاصہ" اور اس کے پانچ باب قرار دئے ہیں۔ پہلا باب مذہبی خیالات۔ دوسرا، سیاسی خیالات؛ تیسرا، معاش کے خیالات؛ چوتھا صحت کے خیالات، پانچواں معلومات عامہ غرض سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں۔ یعنی ہر قسم کے مضامین دوسرے اخباروں اور رسالوں سے نقل کرکے رکھ دیتا ہی مخالف وموافق سب موجود ہیں، مگر خود خاموش ہیں۔ دین ودنیا کے مالک حضرت خواجہ حسن نظامی نے اس رسالہ کے مقاصد پر ایک چھوٹا سا مضمون بھی لکھا ہی وہ فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق صرف صوبہ پنجاب سی ہے کہ وہ اس صوبے کے خیالات کے مجموعہ کو اہل پنجاب اور دوسرے صوبوں کے سامنے پیش کرے اور بہت سی رسالے اور اخبار پڑھنے کی ضرورت باقی نہ رہی اس کے بعد فرماتے ہیں" اس رسالہ کا مقصد محض یہ ہی کہ آئینہ کی طرح ہر چیز کی صورت دکھادے،

یہ نہیں کہ کسی کے عیب و ہنر پر رائے زنی کرے یعنی جو خیالات اس رسالہ میں درج کئے جائینگے، ان میں رسالہ کے مولف کی ذاتی رائے کو دخل نہ ہوگا، ہماری رائے میں یہ رسالہ صرف وہی شخص پسند کرسکتا ہی جس کی کوئی ذاتی رائے نہیں ہی۔ ورنہ اس جھولی کے رنگ برنگ ٹکڑے کون ہضم کرسکتا ہی۔ البتہ دلچسپ ضرور ہی۔ ہر فریق اور ہر مذہب والے کی رائے اور خیالات بے کم و کاست درج ہیں۔ موالاتی بھی ہیں اور تارک موالات بھی، عیسائی بھی اور غیر عیسائی بھی، آریائی بھی اور سناتن دھرمی بھی، قادیانی بھی اور ان کے مخالف بھی، غرض ہر قسم کی رائیں اور ہر قسم کے مضامین موجود ہیں۔ پنجاب کے اخباروں اور رسالوں کا خلاصہ ہی۔ جو پڑھے سو پچھتائے اور جو نہ پڑھے سو پچھتائے۔ بڑی تقطیع پر ۳۲ صفحے اور ہر صفحے کے دو کالم۔ قیمت بہت سستی یعنی ایک روپیہ سال، ایسی سستی قیمت میں ایسا مزیدار رسالہ ملنا نا ممکن ہی۔

حسن ادب لکھنؤ یہ بھی ماہانہ رسالہ ہی۔ اڈیٹر ابو الکمال محمد واحد علی لطف لکھنؤ اور سرپرست حضرت آزاد لکھنوی ہیں۔ نثر اور نظم دونوں کا مجموعہ ہی اس نمبر میں جو ہمارے پاس پہنچا ہی۔ پہلا مضمون مرزا سلطان احمد صاحب کا ہی۔ ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا بدنصیب رسالہ ہوگا جو جناب مرزا صاحب کی پُر نویس قلم کا زیر بار احسان نہ ہو۔ بعض اوقات تو ایسا ہوا ہی کہ رسالے کے وجود میں آنے سے پہلے نہیں بلکہ خیال میں آنے سے قبل آپ کا مضمون پہنچ گیا ہی۔ یہ مضمون "مذہبی علمی رنگ میں ہی" اور مرزا صاحب نے اپنے خاص رنگ میں لکھا ہی۔ یعنی الفاظ، جملے، فقرے، سب سمجھ میں آتے ہیں لیکن مضمون بحیثیت مجموعی فہم سے کترا کر نکل جاتا ہی دو تین اور مضمون بھی ہیں ان میں بھی زیادہ تر خیالی تک بندی ہے۔ صرف و نحو کے تحت میں نفی پر ایک مضمون ہی اور اس کے بعد چند نظمیں ہیں۔ بہت معمولی رسالہ ہی افسوس ہے کہ دہلی اور لکھنؤ سے کوئی قابل قدر علمی رسالہ شایع نہیں ہوتا کاغذ لکھائی چھپائی معمولی بلکہ معمولی سے بھی کم۔ قیمت ؏ سالانہ

درویش یہ ایک پندرہ روزہ رسالہ ہی جو حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ سے شایع ہوتا ہی۔ اڈیٹر ملا محمد الواحدی ہیں اس رسالہ کو بھی خواجہ حسن نظامی صاحب کی سرپرستی ادا

ہدایت کا فخر حاصل ہے۔ مقصد نام سے ظاہر ہے لیکن اہم مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وُہ اشاعت اسلام اور تبلیغ مذہب کے مفید ذرائع کی طرف رہ نمائی کرے گا' جس کا سب سے بڑا ذریعہ غالباً مریدی معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ اس مقصد کے وہ "ملک کے دیگر اہم مسائل پر بھی سنجیدگی کے ساتھ رائے ظاہر کرے گا" اور اس میں شبہ نہیں کہ رسالہ کا جو مقصد انھوں نے بیان کیا ہے اُسے پورا کرنے کی بہت کوشش کی گئی ہے مگر اس میں سب سے عجیب اور قابل دید وہ خطوط ہیں جو مریدان با عقیدت نے اپنے پیر طریقت یعنی خواجہ صاحب کے نام لکھے ہیں۔ اور حضرت پیر نے بڑے شوق اور فخر سے ان کو درج کیا ہے۔ یہ خط اشتہار کا بھی کام دیتے ہیں، ترغیب کا بھی، ایک طرف مرید کی حسن عقیدت بتاتے ہیں اور دوسری طرف پیر کی حکمت نفسیاتی۔ پیری کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ پیر دین کو سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو مگر دنیا کو خوب سمجھتا ہو اور انسانی فطرت کی گہرائیوں پر پورا عبور رکھتا ہو۔ ان خطوں کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب اس فن شریف کے امام ہیں اور اس لئے ہم اُن کی دل سے قدر کرتے ہیں اگرچہ اس رسالہ میں ملک کے دوسرے مسائل پر بحث کی جاتی ہے مگر وہ سب اصل مقصد کے ماتحت ہیں۔ گویا دوسرے مضامین اصل مضمون کے لئے چاشنی کا کام دیتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی طبیعت میں جدّت پائی جاتی ہے اور اس سے وہ ہر جگہ کام لیتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے شذرات اور اڈیٹوریل نوٹس کی جگہ رسالے کی خصوصیت کے لحاظ سے تجلیات کا لفظ تجویز فرمایا ہے جس میں وہ مزے مزے کے چٹکلے اور رنگ برنگ کی گل افشانیاں فرماتے ہیں اس کے بعد دوسرے مضامین ہوتے ہیں جن میں سیاسیات' یادِ رفتگاں، منقولات، نقد و نظر، مواعظ حسنہ، کیف سخن سب ہی کچھ آجاتا ہے۔ اچھا خاصا گلدستہ ہے مگر رنگ بو خاص رکھتا ہے۔

چشم بد دور' خواجہ صاحب کا حلقہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے اب اس میں اشاعت و تبلیغ اسلام کا اور اضافہ ہوا ہے جس نے عقیدتمند مریدوں کے دلوں میں نیا ولولہ اور جوش پیدا کر دیا ہے یہ ایک اور ثبوت ہے اس بات کا کہ خواجہ صاحب کی نظر کس قدر غائر ہے اور وہ انسانی فطرت کے اسرار کے سمجھنے میں کس قدر کمال رکھتے ہیں۔ اور اور جب ہم ان کی تازہ تصانیف حلال خور' ہندو مذاہب کی معلومات، سکھ قوم وغیرہ کا اشتہار اس رسالے میں دیکھتے ہیں تو ہم ان کے مشرب کی وسعت اور ہمہ گیری کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتے اور وہ دن دور نہیں کہ یہ جدتیں ضرور کوئی نیا رنگ لائیں گی۔

درویش ایک دلچسپ رسالہ ہی۔ معلومات بھی اس میں مختلف قسم کی ہیں۔ زبان بھی اس کی فصیح اور بے تکلف ہے۔ لیکن ان کے سوا بھی اس میں ایک ایسی چیز ہی جو دوسرے رسالوں میں نہیں پائی جاتی اور اس لئے پڑھنے کے قابل ہی۔ درویش، درویشی سکھائے یا نہ سکھائے لیکن اس میں شک نہیں کہ پیر پرستی ضرور سکھا دیگا۔ اس سی مذہب اسلام کی اشاعت و تبلیغ میں کامیابی ہو یا نہ ہو لیکن اس میں کلام نہیں کہ مریدی کی اشاعت میں اسے ضرور کامیابی ہوگی جو لوگ ملک کے مختلف حالات اور مسائل کے علم کا شوق رکھتے ہیں وہ زندگی کے اس اہم شعبہ کو بھی ضرور مطالعہ فرمائیں۔ کیونکہ پیری مریدی بھی الم (علم) دریاؤ ہے"۔

درویش بڑی تقطیع پر دو کالموں میں چھپتا ہی۔ چھپائی گنجان اور صاف ہوتی ہی۔ کاغذ اچھا حجم ۱۶ صفحے مہینے میں دو بار شایع ہوتا ہی سالانہ چندہ دو روپیے۔

لسان الملک حیدرآباد دکن میں ایک اور ماہانہ رسالے کا اضافہ ہوا ہی اس کے اڈیٹر اردو کے مشہور شاعر سید محمد ضامن صاحب کنتوری ہیں جن کے کلام سے شعروسخن کے شایق خوب واقف ہیں۔ یہ پہلا نمبر ہے جو جولائی میں شایع ہوا تھا اس کے بعد سے کوئی رسالہ وصول نہیں ہوا۔ اس میں ۱۹ مضامین ہیں جن میں سی ۹ نظمیں ہیں اور دس مضمون نثر کے ہیں۔ مضامین ہر قسم کے ہیں۔ مضامین نگاروں میں جناب مرزا سلطان احمد صاحب بھی ہیں۔ مرزا صاحب کی پر نویسی پر رشک آتا ہی یہ مضمون "رنج و خوشی" پر ہی اور ان کی خاص طرز میں ہی ایک مسلسل ناول کی پہلی قسط بھی نظر آتی ہی۔ معلوم نہیں کہ یہ ترجمہ ہے یا تصنیف۔ اس کے لکھنے والے جناب مولوی مرزا مہدی خاں صاحب کوکب ہیں۔ کوئی مضمون خاص طور پر ایسا نہیں ہی جو علمی تحقیق، معلومات یا جدت کے لحاظ سے قابل توجہ ہو۔ حضرت ضامن نے لارڈ ٹنی سن کی اینک آرڈن کا اردو میں ترجمہ کیا ہی۔ اس مثنوی کا کچھ ابتدائی حصہ اس میں شایع ہوا ہی۔ ترجمہ بہت بے تکلف، رواں، فصیح اور شگفتہ ہی۔ ضامن صاحب کے جائنٹ اڈیٹر سید منظر علی صاحب اشہر ہیں۔

(حجم ۴۸ صفحے۔ قیمت پانچ روپیہ سالانہ)

ایک فارسی زبان کا رسالہ

ایران شہر فارسی زبان کا علمی و ادبی باتصویر رسالہ۔ مقام اشاعت : برلین (جرمانیا) سالانہ چندہ ایک انگریزی پاؤنڈ۔ ہندوستان کے لئے مرزا محمد حسن گازرونی، تجارت خانہ دہ دشتی بمبئی گماشتے کے طور پر کام کرتے ہیں۔

یہ ماہانہ رسالہ ذی قعدہ ۱۳۴۱ھ سے آقا حسین کاظم زادہ کی ادارت میں برلین سے نکلتا ہے۔ مدیر کے اعلان سے معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر مہینے میں دو بار نکلا کرے گا۔ حجم پہلے ۱۶ صفحے تھا لیکن اب ۳۲ صفحے ہے۔ چھپائی اور کاغذ نہایت عمدہ ہے۔ عبارت فصیح اور عام فہم۔ مضامین دلچسپ اور مفید۔ سب سے بڑی خوبی اس رسالہ میں یہ ہے کہ جو مضمون اس میں چھپنے کو بھیجا جاتا ہے۔ مدیر کو اُس کی عبارت درست کرنے کا پورا اختیار ہے۔ چنانچہ پہلے ہی شمارے میں کہہ دیا گیا ہے۔

"ادارہ ایران شہر، در اصلاحِ عباراتِ مقالہ ہا، بدون دست زدن بہ اصلِ مطلب، آزاد است"

کاش اردو رسالوں میں بھی یہی انتظام ہو تا کہ غلط سلط عبارت نہ چھپنے پاتی۔ آج کل اُردو رسالے غلط ترکیبوں، نامانوس لفظوں اور اور خرابیوں سے بھرے ہوتے ہیں۔

پہلے چھ پرچوں میں جو مضمون درج ہیں ان میں سے یہ خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں:۔

(۱) تشکیلاتِ داریوش اول در کشور ایران (ہخامنشی خاندان کے نامور بادشاہ داریوش کے نظم و نسق پر)

(۲) شرق شناسی و غرب شناسی۔

(۳) تعلیم و تربیت درمیان ایرانیان قدیم۔

(۴) جنگِ دارا و اِسکندر و انقراض سلطنت ہخامنشیان (باتصویر)

(۵) شورائے جنگیٔ داریوش اوّل (باتصویر)

(۶) ایران شہر (برلین کے مشہور ایران شہر، استاذ مارکوارٹ کے قلم سے)

(۷) خطہاے میخی در کتیبہ ہاے ایران

(۸) نامۂ یزدگرد دوم بہ عیسویان ارمنستان (آج کل کے ایک مشہور وطن پرست ایرانی شاعر پورداود کے قلم سے)

(۹) داستان خُم نشستنِ افلاطون (باتصویر)

(۱۰) علم اساطیر (ڈین مارک کے مشہور ایران شناس، استاذ کریستنسن کے قلم سے)

ان میں اکثر مضمون تاریخی ہیں اور مستند جرمانی یا فرانسیسی کتابوں سے لئے یا ترجمہ کئے گئے ہیں۔ مضمون نشان (۶) کو استاذ مارکوارٹ نے جرمانی زبان میں لکھا تھا جسے رسالے کے کارپردازان نے فارسی میں لکھ کر چھاپا ہی مگر فارسی ترجمے پر بھی مصنف نے نظر ثانی کر کے کہیں کہیں اصلاح دی۔ خود اُن کے نام کے ساتھ "پروفیسر" لکھا گیا تھا۔ مگر اس یورپی لفظ کو فارسی تحریر میں انھوں نے ناپسند کر کے "اندرزبد" بنا دیا کہ درمیانی زمانے کی فارسی میں (جسے بعضے لوگ "پہلوی" کہتے ہیں) مُعلِّم کے لئے "اندرزبد" استعمال ہوتا تھا۔ مضمون نشان (۱۰) اُستاذ کریستنسن کی فارسی انشاپردازی کا نمونہ ہے۔

"ایران شہر" والوں نے یورپی لفظوں یا اصطلاحوں کا ترجمہ فارسی میں خوب کیا ہی۔ ان میں بعضے ایسی لفظوں کا فارسی ترجمہ بھی ہے جن کے عربی مرادف ایران اور ہندوستان میں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن "ایران شہر" نے جو ٹھیٹ فارسی لفظ پیش کئے ہیں ان میں بیشتر موزوں اور عام فہم ہیں۔ من جملہ اُن کے تھوڑے سے یہاں لکھے جاتے ہیں

شرق شناس = (مستشرق)	Orientalist
ایران شناس =	Iranist
مصر شناس =	Aegyptologist
عرب شناس =	Arabist
غرب شناس =	Occidentalist
شاہ کار =	Masterpiece
اندرزبد =	Professor

کے لئے نہایت عمدہ ہندوستان کی تاریخیں لکھی ہیں ۔ یہ کتاب بھی اُسی پایہ کی ہے اور صاف اور سلیس زبان میں لکھی ہے باجازت سرکار یہ کتاب بہت جلد انجمن طبع کرے گی ۔

۵ ۔ تاریخ ادبیات ایران (مصنفہ پروفیسر براؤن) کا ترجمہ ایک مدت سے ہو رہا تھا ۔ اب پہلی جلد بعد نظر ثانی تیار ہو گئی ہے ۔ چونکہ یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہے لہذا فی الحال ناظر مذہبی کتب درسیہ کے زیر تنقید ہے وہاں سے فراغت ہونے کے بعد طبع کے لئے دی جائے گی ۔

۶ ۔ تاریخ ادبیات عرب (مصنفہ پروفیسر نکلسن) کا ترجمہ بھی قریب الاختتام ہے ۔ شروع کے اجزا ناظر مذہبی کتب درسیہ کے زیر تنقید ہیں ۔ اس کی طبع کا انتظام بھی جلد کیا جائے گا ۔

۷ ۔ انجمن نے " Science Stories " کا ترجمہ سائنس کے قصوں کے نام سے کر دیا ہے ۔ اس کا مصنف ایک فرانسیسی عالم فابر ہے جو سائنس کے مسائل کو سلیس اور صاف ستھری زبان میں بیان کرنے میں کمال رکھتا ہے اور خاص کر حشرات الارض اور کیڑے مکوڑوں وغیرہ کے حالات ایسی دلچسپی سے لکھتا ہے جیسے دیو پریوں کے قصّے ، اس لئے اُسے حشرات الارض کا ہومر کہتے ہیں ۔ ترجمہ ہو چکا ہے ۔ نظر ثانی کی جا رہی ہے عام پڑھنے والوں اور لڑکوں لڑکیوں کے لئے بہت ہی اچھی کتاب ہے ۔

زیر ترتیب لغات

انجمن اس وقت لغت پر کئی کتابیں تیّار کر رہی ہے ۔

۱ ۔ سب سے اول اصطلاحات علمیہ کی لغت ہے ۔ اس کی پہلی جلد بالکل تیار ہے ۔ صرف ترتیب دی جا رہی ہے ایک مہینے کے اندر ہی اندر طبع کے لئے بھیج دی جائے گی ۔

۲ ۔ دوسری لغت پیشہ وروں کے اصطلاحات کی ہے ۔ یہ بھی تیار ہو چکی ہے ۔ صرف ترتیب باقی ہے جس کا کام جاری ہے ۔ اس کی تیاری میں بہت محنت صرف ہوئی ہے بعد ترتیب تصویروں اور نقشوں کا انتظام کیا جائے گا ۔ اور جب یہ سب مکمل ہو جائیں گے تو طبع کا انتظام ہوگا ۔ یہ لغت بالکل جدید ہے اور نہایت مفید ثابت ہوگی ۔ اب تک اس قسم کی کتاب ہماری زبان میں نہیں لکھی گئی ۔

۳۔ تیسری لغت انگریزی سے اردو کی ہی۔ ترجمہ کے لئے Concise Oxford dictionary انتخاب کی گئی ہی جو انگریزی کی نہایت مستند لغت ہی۔ ایک ایک حرف ایک ایک صاحب کو ترجمہ کے لئے دیا گیا ہی جو حرف بہت طویل ہیں ان کے دو دو تین تین ٹکڑے کر کے مختلف صاحبوں کو دئے گئے ہیں۔ تقریباً تیس حضرات اس کے ترجمے میں مصروف ہیں۔ یہ پہلا علمی کام ہے جو اردو زبان میں مشترکانہ محنت اور اعانت سے انجام پائے گا۔ اس زمانے میں ایسی لغت کی جیسی کچھ ضرورت ہی وہ محتاج بیان نہیں۔

۴۔ چوتھی لغت اردو زبان کی ہی۔ کئی سال ہوئے میں نے خاکے کے طور پر ایک مضمون لکھا تھا کہ اردو زبان کی لغت کیسی ہونی چاہیئے۔ اور ارادہ تھا کہ اُسی نہج پر ایک محققانہ اعلیٰ درجہ کی لغت لکھی جائے۔ لیکن انجمن اس صرف کثیر کی متحمل نہ ہو سکی۔ اور نہ کوئی بیرونی امداد مل سکی۔ لہذا مجبوراً اس خیال کو ترک کرنا پڑا۔ اب بعد غور کے یہ تدبیر کی کہ پہلے ایک چھوٹی لغت لکھی جائے جس میں زبان کے کل الفاظ اور محاورات، نیز جدید الفاظ جو اس زمانے میں زبان میں داخل ہو گئے ہیں درج ہوں۔ مختصر طور سے الفاظ وغیرہ کی تحقیق بھی کی جائے۔ غرض ایسی کتاب ہو جو عام طور پر اردو پڑھنے والوں اور طالب علموں کے لئے مفید ہو۔ لیکن جو کچھ لکھا جائے وہ مستند ہو علاوہ اس کے اس میں وہ قدیم الفاظ بھی درج کئے جائیں گے جو کسی اردو لغت میں نہیں ملتے مگر مسلم اساتذہ کے کلام میں موجود ہیں تاکہ اردو زبان کے مطالعہ کرنے والوں کو مدد ملے۔ یہ کام شروع ہو گیا ہی اور انشاءاللہ ایک سال میں اختتام کو پہنچ جائے گا۔

انجمن اردو نستعلیق ٹائپ کے تیار کرنے کی بھی فکر کر رہی ہی اس میں ایک حد تک کامیابی ہو چکی ہی اور امید ہے کہ بہت تھوڑے ہی عرصہ میں یہ ٹائپ تیار ہو جائے گا۔ اگر یہ ٹائپ خاطر خواہ تیار ہو گیا اور انشاءاللہ ضرور ہو جائے گا تو میں اسے انجمن کی بڑی کامیابی خیال کروں گا۔

عبدالحق

سکرٹری انجمن ترقی اُردو

فہرستِ مطبوعاتِ جامعۂ عثمانیہ سرکارِ عالی

نشان سلسلہ	نام کتاب		قیمت فی جلد
	فہرست کتب مدخلہ نصاب میٹریکولیشن		
(۱)	تاریخ انگلستان	کاغذ درجہ اوّل	ہلے ۱۰/
	"	کاغذ درجہ دوم	
۲	تاریخ ہند	کاغذ درجہ اول	للعہ ۵/
	"	کاغذ درجہ دوم	سے ۱۴/
۳	طبیعیات حصۂ اول		سے ۱۰/
	" حصۂ دوم		للعہ ۱۵/
۴	کیمیا	کاغذ درجۂ اول	للعہ ۹/
	"	کاغذ درجۂ دوم	للعہ ۳/
۵	ترسیمات ومساوات	کاغذ درجہ اول	سے ۱۲/
	"	کاغذ درجہ دوم	سے ۷/
۶	مرقات		عہ ۱۱/
	" غیر مجلد		۱۲/
۷	جغرافیہ	کاغذ درجہ اول	
	"	کاغذ درجہ دوم	

نشان سلسلہ	نام کتاب			قیمت فی جلد
	فہرست کتب مدخلہ نصاب جماعت ایف اے			
۸	علم مثلث حصۂ اول			صہ ۸/
۹	جبر ومقابلہ "			للعہ ۱۳/
۱۰	سکونیات			صہ ۵/
۱۱	ہندسی مخروطات			للعہ ۶/
۱۲	ہندسہ مجسمات			عہ ۱۴/
۱۳	علم حرکت			صہ ۴/
۱۴	طبیعیات	حصۂ اول		للعہ ۱۳/
	"	حصۂ دوم	حرارت	للعہ ۱۵/
	"	حصہ سوم	نور	سے ۱۴/
	"	حصہ چہارم	آواز	عہ ۱۴/
	"	حصہ پنجم	مقناطیس	عہ ۱۰/
	"	حصہ ششم	برق	للعہ ۱۳/
۱۵	طبیعیات عملی	حصہ اول		عہ ۱۰/
	"	حصہ دوم		سے ۴/
	"	حصہ سوم		عہ ۱۲/

نمبر سلسلہ	نام کتاب	قیمت	نمبر سلسلہ	نام کتاب	قیمت
۱۶	کیمیا حصہ اوّل کاغذ درجہ اوّل	للعہ ۱۱ر		تاریخ انگلستان حصہ چہارم کاغذ درجہ اول	سے ۷ر
	” ” کاغذ درجہ دوم	للعہ ۶ر		” ” کاغذ درجہ دوم	صہ ۱۳ر
	” حصہ دوم کاغذ درجہ اول			” حصہ پنجم کاغذ درجہ اول	
	” ” کاغذ درجہ دوم			” ” کاغذ درجہ دوم	
	” حصہ سوم کاغذ درجہ اول		۲۱	تاریخ روما کاغذ درجہ اول	سے ۱۵ر
	” ” کاغذ درجہ دوم			” کاغذ درجہ دوم	سے ۱۵ر
۱۷	تاریخ ہند حصہ اول	سے ۹ر	۲۲	تاریخ دستور انگلستان	صہ ۹ر
	” حصہ دوم کاغذ درجہ اول	صہ ۴ر	۲۳	تاریخ یورپ حصہ اول کاغذ درجہ اول	
	” ” کاغذ درجہ دوم	للعہ ۱۴ر		” ” کاغذ درجہ دوم	
	” حصہ سوم کاغذ درجہ اول	سے ۱۳ر		” حصہ دوم کاغذ درجہ اول	
	” ” کاغذ درجہ دوم	سے ۹ر		” ” کاغذ درجہ دوم	
	” حصہ چہارم کاغذ درجہ اول	سے ر	۲۴	تاریخ اسلام کاغذ درجہ اول	
	” ” کاغذ درجہ دوم	عہ ۱۳ر		” کاغذ درجہ دوم	
۱۸	برطانوی حکومت ہند	سے ۴ر	۲۵	مقدمۂ معاشیات کاغذ درجہ اول	للعہ ۷ر
۱۹	تاریخ یونان	سے ۵ر	۲۶	” کاغذ درجہ دوم	
۲۰	تاریخ انگلستان حصہ اول	للعہ ۱۵ر	۲۶	معاشیات ہند	للعہ ۱۲ر
	” حصہ دوم	سے ۱ر	۲۷	منطق	للعہ ۱۴ر
	” حصہ سوم کاغذ درجہ اول	للعہ ۱۵ر	۲۸	مبادی علم نفس کاغذ درجہ اول	
	” ” کاغذ درجہ دوم	للعہ ۸ر		” کاغذ درجہ دوم	

نمبر سلسلہ	نام کتاب		قیمت
	فہرست کتب مدخلہ نصاب جماعت بی اے		
۲۹	تاریخ دستور انگلستان	کاغذ درجہ اول	ے ار
	″	کاغذ درجہ دوم	صہ ۸ر
۳۰	پرک لیز	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۳۱	ہندی مملکت برطانیہ	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۳۲	رنجیت سنگھ	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۳۳	تاریخ ہند عہد برطانیہ	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۳۴	قدیم تاریخ ہند	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۳۵	یورپ جدید	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۳۶	ویلزلی	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۳۷	یونانی شہنشاہی	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	

نمبر سلسلہ	نام کتاب		قیمت
۳۸	تاریخ یونان جلد دوم	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۳۹	عروج فرانس	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۴۰	ڈلھاؤزی	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۴۱	مادھوجی سندھیا	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۴۲	تنبیہ والاشراف	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۴۳	تاریخ فرشتہ جلد اول	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۴۴	کامل ابن اثیر جلد اول	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
	″ جلد دوم	کاغذ درجہ اول	
	″ ″	کاغذ درجہ دوم	
	″ جلد سوم	کاغذ درجہ اول	
	″ ″	کاغذ درجہ دوم	
۴۵	طبیعیات نور	کاغذ درجہ اول	

نمبر سلسلہ	نام کتاب		قیمت
۴۵	طبعیات نور	کاغذ درجہ دوم	
	〃 آواز	کاغذ درجہ اول	
	〃 〃	کاغذ درجہ دوم	
۴۶	طبعیات عملی مقناطیس و برق	کاغذ درجہ اول	
	〃 〃	کاغذ درجہ دوم	
۴۷	عملی کیمیا	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۴۸	نظری نامیاتی کیمیا	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۴۹	غیر نامیاتی کیمیا	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۵۰	علم مثلث تحلیلی حصہ دوم	کاغذ درجہ اول	
	〃 〃	کاغذ درجہ دوم	
۵۱	سکون و سیالات	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۵۲	ہندسہ تحلیلی	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۵۳	جبر و مقابلہ حصہ دوم	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۵۴	حکمت الاشراق	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۵۵	مفتاح المنطق	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۵۶	علم الاخلاق	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۵۷	معیشت الہند	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۵۸	اصول معاشیات	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۵۹	دہرم شاستر	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۶۰	قانون ٹارٹ	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۶۱	شرح محمدی	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	

نوٹ

(۱) جن کتابوں پر قیمتوں کا اندراج نہیں ہے وہ زیر طبع ہیں۔
(۲) فرمایش کے ساتھ کتب مطلوبہ کی ربع قیمت پیشگی وصول ہونے پر بعد منہائی رقم وصول شدہ کتابیں ذریعہ وی پی روانہ کی جائیں گی۔
(۳) پیٹہ کے مصارف خریدار کے ذمہ ہونگے۔
(۴) جملہ خط و کتابت ناظم شعبہ تالیف و ترجمہ سے ہونی چاہئے

ناظم
شعبہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

مطبوعات انجمن

تذکرۂ شعرائے اردو - مؤلفہ میر حسن دہلوی۔ میر حسن کے نام سے کون واقف نہیں۔ اُن کی مثنوی بدر منیر کو جو قبول عام نصیب ہوا شاید ہی اُردو کی کسی کتاب کو نصیب ہوا ہو۔ یہ تذکرہ اسی مقبول اور نامور استاد کی تالیف ہے۔ یہ کتاب بالکل نایاب تھی بڑی کوشش سے بہم پہونچا کر طبع کی گئی ہے۔ میر صاحب کا نام اس تذکرہ کی کافی شہادت ہے۔ اس پر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے ایک بسیط نقادانہ اور عالمانہ تبصرہ لکھا ہے جو قابل پڑھنے کے ہے۔ قیمت فی جلد مجلد عہ؍ کلدار غیر مجلد عہ کلدار

تاریخ تمدن - سر ٹامس بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ ہے۔ الف سے یے تک تمدن کے ہر مسئلہ پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ہے اور ہر اصول کی تائید میں تاریخی اسناد سے کام لیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے معلومات میں انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ حصۂ اول عہ؍ کلدار حصۂ دوم عا؍ کلدار

مقدمات الطبیعات - یہ ترجمہ ہے مگر انگلستان کے مشہور سائنس داں حکیم ہکسلے کی کتاب کا جس کا نام کتاب کی کافی ضمانت ہے اس میں مظاہر فطرت کی بحث درج ہے لیکن کتاب علم وفضل کا مرقع ہے۔ عا؍ کلدار

القول الاظہر - امام ابن مسکویہ کی معرکۃ الآرا تصنیف فوز الاصغر کا یہ اُردو ترجمہ ہے یہ کتاب فلسفہ الٰہیین کے اصول پر لکھی گئی ہے۔ اور مذہب اسلام پر انھیں اصول کو منطبق کیا گیا ہے۔ قیمت عہ؍ کلدار

رہنمایانِ ہند - مشہور کتاب پروفٹس اوف انڈیا کا ترجمہ ہے۔ ہندو مذہب کے برگزیدہ عقائد کا بیان فاضلانہ مگر دلکش پیرایہ میں لکھا ہے۔ اس کے بعد سری کرشن جی مہاراج گوتم بدھ وغیرہ کے حالات ہیں عہ؍ کلدار

القمر - قوانین حرکت وسکون اور نظام شمسی کی صراحت کے بعد چاند کے متعلق جو جدید انکشافات ہوئے ہیں اُن سب کو جمع کر دیا ہے طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ہے۔ ۱؍ کلدار

البیرونی - کمالات ذہنی میں ابوریحان بیرونی کا مرتبہ تعریف سے مستغنی ہے۔ دسویں صدی کا فاضل ہے مگر تبحر علمی اور دقیق النظری میں بیسویں صدی کا محقق معلوم ہوتا ہے۔ البیرونی اسکے حالات زندگی اور کمالات علمی پر مشتمل ہے قیمت مجلد عا؍

قاعدہ وکلید قاعدہ - یہ قاعدہ مدت کے غور وخوض کے بعد اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے جن اصول اور طریقہ پر اس کی تعلیم ہونی چاہیے اُن کی تشریح کے لیے ایک کلید بھی طیار کی گئی ہے۔ قاعدہ ۲؍ کلدار کلید قاعدہ ۴؍

فلسفۂ تعلیم۔ ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلہ
تعلیم کی آخری کتاب ہی۔ غور و فکر کا بہترین کارنامہ والدین
و معلم کے لیے چراغ ہدایت ہے۔ تربیت کے ربانی
قوانین کو اسقدر صحت کے ساتھ مرتب کیا ہی کہ کتاب الہامی
معلوم ہوتی ہی اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے۔ قیمت (مے) کلدار

نپولین اعظم۔ ایبٹ کی مستند کتاب کا اُردو ترجمہ کتاب
کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ نپولین کی زندگی بشری
جد و جہد کا آخری باب ہی۔ واقعات کی داد یا تو سکندر
کی زبان ادا کر سکتی ہی یا تیمور کی زبان۔ ترجمہ آسان
اور عام فہم ہے۔ قیمت عہ کلدار

دریائے لطافت۔ ہندوستان کے مشہور سخن سنج
میر انشا اللہ خاں کی تصنیف ہے اُردو صرف نحو اور محاورات
اور الفاظ کی پہلی کتاب ہی۔ اس میں زبان کے متعلق بعض
عجیب و غریب نکات درج ہیں۔ قیمت ۔ عہ کلدار

طبقات الارض۔ اس فن کی پہلی کتاب ہی تین سو
صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قلمبند کیے ہیں۔ کتاب کے
آخر میں انگریزی مصطلحات اور اُن کے مرادفات کی
فہرست بھی منسلک ہے۔ قیمت۔ عکا کلدار

مشاہیر یونان و روما ترجمہ ہے سیرت نگاری اور
انشا پردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے
آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہی۔ دیباچہ عالم ملکہ شکسپیر تک
نے اس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہی۔ وطن پرستی اور بےنفسی
عزم جوان مردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ معمور ہے
جلد اول غیر مجلد (سے) کلدار جلد دوم غیر مجلد عہ کلدار

اسباق النحو۔ ملک کے ادیب کامل مولانا حمید الدین
صاحب بی اے کی تالیف ہی۔ اختصار کے باوجود عربی
صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہی قیمت ۱۲ کلدار

علم المعیشت۔ اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر
محمد الیاس صاحب برنی ایم اے نے ملک پر بہت بڑا احسان
احسان کیا ہے۔ معیشت پر یہ کتاب جامع و مانع ہے۔
مبہم و مشکل مسائل کو پانی کر دیا ہے۔ اس کے اکثر باب
نہایت عجیب و غریب ہیں۔ اشتراکیت کا باب قابل
دید ہے۔ حجم ۸۰۰ قیمت مجلد صہ کلدار

تاریخ اخلاق یورپ۔ اصل مصنف پروفیسر لیکی کا نام
علم و تبحر، تحقیق و صداقت کا مرادف ہی یہ کتاب کئی ہزار
برس کے تمدن معاشرت اصول اخلاق مذاہب و خیالات
مرقع ہی۔ حصہ اول (سے) حصہ دوم مجلد عہ کلدار

تاریخ یونان قدیم۔ یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے
مستند کتابوں کا خلاصہ ہے۔ اور زبان کے لحاظ سے سلاست
و شگفتگی کا نمونہ اس کا نقطۂ خیال خالصاً ہندوستانی ہے
ایف اے کلاس کے طلبا جو یونانی قدیم تاریخ سے گھبراتے
ہیں اس کتاب کو انتہا درجہ مفید پائیں گے مجلد عہ کلدار

انتخابِ کلامِ میر۔ میر تقی میر تاج شعرائے اُردو کے کلام کا انتخاب ہے مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو نے یہ انتخاب ایک مدت کی سعی و محنت کے بعد کیا ہے اور شروع میں میر صاحب کی خصوصیات شاعری پر ۴۸ صفحہ کا ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے۔ قیمت ۵ر کلدار

رسالہ نباتات۔ اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے علمی اصطلاحات سے معرّا، سلاست و روانی سے مملو اور دلچسپ و مفید ہے۔ طلبا نباتات جس مسئلہ کو انگریزی میں نہ سمجھ سکیں وہ اس رسالہ میں مطالعہ کریں قیمت مجلد عہ کلدار

دیباچۂ صحت۔ اس کتاب میں مطالبات صحت مثلاً ہوا، پانی، غذا، لباس، مکان وغیرہ مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ زبان عام فہم اور پیرایہ مؤثر و دل پذیر ہے۔ ملک کی بہترین تصنیف ہے اس کا مطالعہ کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا۔ حجم ایک ہزار صفحے قیمت مجلد للعہ ر

قواعد اُردو۔ ارباب فن کا اتفاق ہے کہ اُردو زبان میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھے گئے۔ بسط و شرح کے علاوہ اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی قواعد کا تتبع نہیں کیا گیا ہے قیمت عہ/ کلدار

نکات الشعراء۔ یہ اُردو کا تذکرہ استاد الشعراء میر تقی مرحوم کی تالیف سے ہے۔ اس میں بعض ایسے شعراء کے حالات بھی ملیں گے جو عام طور پر معروف نہیں نیز میر صاحب کی رائیں اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل ہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی صدر الصدور امور مذہبی سرکار عالی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہے۔ قیمت مجلد عہ کلدار

فلسفۂ جذبات۔ کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور نفسی ہے۔ جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھ بحث کی گئی ہے متعلمان نفسیات اسے نہایت مفید پائیں گے۔ مجلد عہ کلدار غیر مجلد عہ کلدار

وضع اصطلاحات۔ یہ کتاب ملک کے نامور انشاپرداز اور عالم مولوی وحید الدین سلیم (پروفیسر عثمانیہ کالج) نے سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعہ کے بعد تالیف کی ہے بقول فاضل مؤلف "یہ بالکل نیا موضوع ہے۔ میرے علم میں شاید کوئی ایسی کتاب نہ آج تک یورپ کی کسی زبان میں لکھی گئی ہے نہ ایشیا کی کسی زبان میں، اس میں وضع اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اسکے اصول قائم کیے گئے ہیں۔ مخالف موافق رایوں کی تنقید کی گئی ہے اور زبان کی ساخت اور اس کے عناصر ترکیبی مفرد و مرکب اصطلاحات کے طریقے سابقوں اور لاحقوں اُردو مصادر اُنکے مشتقات غرض سینکڑوں دلچسپ اور علمی بحثیں زبان کے متعلق آگئی ہیں"۔ اُردو میں بعض اور بھی ایسی کتابیں ہیں جنکی نسبت یہ

سکتا ہے کہ زبان میں اُن کی نظیر نہیں لیکن اس کتاب نے زبان کی جڑیں مضبوط کر دی ہیں اور ہمارے حوصلہ بلند کر دیئے ہیں۔ اس سے پہلے ہم اُردو کو علمی زبان کہتے ہوئے جھجکتے اور اس کی آیندہ ترقی کے متعلق دعویٰ کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے مگر اس کتاب کے ہوتے یہ اندیشہ نہیں رہا۔ اس نے حقیقت کا ایک باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہے۔ تعداد صفحات ۵۰۴ قیمت مجلد ۱۲؎ کلدار

نفح الطیب۔ یہ کتاب اسلامی عہد کی تاریخ اسپین کے معلومات کا خزانہ ہے۔ خلافت اسپین کے ہر مؤرخ کو اس کی خوشہ چینی کرنی پڑی ہے۔ علامہ مقریزی کی نامور اور مشہور آفاق کتاب ہے جو پہلی دفعہ اُردو میں ترجمہ ہوئی ہے۔ یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں بھی داخل ہے صفحات ۴۰۰ قیمت مجلد (سے) کلدار

محاسن کلام غالب۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کا معرکۃ الآرا مضمون ہے۔ اُردو زبان میں یہ پہلی تحریر ہے جو اس شان کی لکھی گئی ہے یہ مضمون اُردو کے پہلے نمبر میں طبع ہوا تھا صاحب نظر قدر دانوں کے اصرار سے الگ طبع کیا گیا ہے۔ غیر مجلد قیمت ۱۲؎ کلدار

دیوان غالب جدید و قدیم۔ یہ وہ نایاب کلام ہے جس کی اشاعت کا اہل ملک کو بیحد انتظار تھا اس میں مرزا غالب کا قدیم و جدید تمام کلام موجود ہے۔ میرزا صاحب کے قدیم کلام ملنے کی کسے توقع تھی۔ یہ محض حسن اتفاق تھا کہ ہاتھ آگیا اور اب سرکار ریاست بھوپال سرپرستی میں چھپکر شائع ہو ہے۔ مع مقدمہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن غیر مجلد للعہ مجلد عہ کلدار۔

(بلا مقدمہ غیر مجلد عہ کلدار مجلد ہے کلدار)

ملل قدیمہ۔ ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس میں بعض قدیم اقوام سلطنت کلدانی آشوری بابل بنی اسرائیل و فینیقیہ کی معاشرت عقاید صنعت و حرفت وغیرہ کے حالات دلچسپی اور خوبی کے ساتھ دیئے ہیں۔ اُردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے ان قدیم اقوام کے حالات صحیح طور سے معلوم ہو سکیں اس لیے انجمن نے اسے خاص طور پر طبع کرایا ہے۔ حالات کی وضاحت کے جا بجا تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ صفحہ ۲۷۴ قیمت ۱۲؎ کلدار

بجلی کے کرشمے۔ یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خاں صاحب بی اے نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھی ہے۔ برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہے اور سہل زبان میں لکھی ہے۔ ہمارے بہت سے ہموطن یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے کہاں سے آتی ہے کیا کام آسکتی ہے یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے۔ لڑکے لڑکیوں کے لیے بھی مفید ہے۔ مجلد قیمت ۱۲؎ کلدار۔

اُردو

۱۔ انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر کے پہلے ہفتے میں شائع ہوا کریگا۔

۲۔ یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی حجم کم سے کم ۱۵۰ اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰ صفحے ہوگا۔

۳۔ قیمت ؎ سالانہ مع محصول ڈاک اور ارکانِ انجمن ترقی اُردو سے ۱۲/ ملے

۴۔ تمام خط و کتابت :۔ آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو و اڈیٹر اُردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہیئے۔

(باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپا اور دفتر سے شائع ہوا)

رسائل
جلد سوم ۱۴۸۱
۶۹۰

حصہ یازدہم　　بابت جولائی ۱۹۲۳ء

اُردو

انجمن ترقی اُردو

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرست مضامین

۱۸۹۰ ۸۳۰ ۱۲۹
SALAR JUNG ESTATE LIBRARY
(Oriental Section)
URDU PRINTED BOOKS:
Accession No........... Cat. No.
Subject..................... No

تنقید ۱۹۵۰

وضع اِصطلاحاتِ علمیہ

(از ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری مرحوم و مغفور)

چند سال ہوئے جب کہ انجمن ترقی اُردو، سرِ رشتۂ تالیف و ترجمہ (حیدر آباد دکن) کے اتحاد سے وضع اصطلاحاتِ علمیہ کا کام انجام دے رہی تھی، میں نے اپنے چند فاضل احباب سے یہ التجا کی کہ وہ اس اہم مسئلہ کے متعلق اپنی اپنی رائے تحریر فرمادیں تو میں اُن سب کو ایک کتاب کی صورت میں طبع کرکے شایع کردوں، تاکہ عام طور پر دوسرے اصحاب کو اس پر غور کرنے اور رائے قایم کرنے کا موقع ملے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے یہ مضمون میری درخواست پر تحریر فرمایا تھا۔ میں کسی طرح یہ بھول نہیں سکتا کہ ڈاکٹر مرحوم کی بے وقت وفات سے ہمارے ملک اور خاص اُردو زبان کو کس قدر شدید نقصان پہونچا ہے۔ انھوں نے زبان کی موجودہ ضروریات پر خوب غور کیا تھا اور ہر مسئلہ پر قطعی اور صاف رائے رکھتے تھے۔ اُمید ہے کہ یہ عالمانہ مضمون غور سے پڑھا جائے گا اور اگر کوئی صاحب اس مسئلہ پر اُردو میں اپنی رائے کا اظہار فرمائیں گے، تو میں بہت ممنون ہوں گا۔ (اڈیٹر)

(۱)

"اے زبان تو طاقت میں نمونۂ قدرتِ الٰہی ہے۔ دیکھ اس طاقت کو رائگاں نہ کھو اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ ۔ ۔ ۔ ۔" (مولانا حالی)

زبان نے انسان کو اشرف المخلوقات کا لقب دیا ہے۔ عقل کے اظہار کا ذریعہ نطق ہے اور نطق انسانی کا مشرف پیرایہ عقل ہے۔ اتحادِ زبان تنِ قومی کی رُوح رواں اور جسم ملی کی جان ہے۔ زبان ہی وہ بنیاد ہے جس پر سیاست کا اساس قایم ہے زبان ہی وہ معیار ہے جس سے یگانوں اور بیگانوں میں امتیاز ہوتا ہے۔ خود مذہب تک زبان کا

تابع ہے بقول شاعر؎

ذاتِ پاک تو دریں ملکِ عرب کردہ ظہور　　زاں سبب آمدہ قرآں بزبانِ عربی!

غرض جس طرح نطق انسان کا خاصہ ہے ویسے ہی زبان قومیت، حکومت اور مذہب کی رُوح رواں ہے جس طرح ایک جان دوسرا قالب اختیار نہیں کرسکتی اُسی طرح کوئی قوم اپنی زبان نہیں بدل سکتی۔ بہت سی قوموں نے جو بزورِ شمشیر یا بزورِ قلم دوسری قوموں سے مغلوب ہوگئی ہیں اُس تقلید کی بنا پر جو محکوم ملّتوں کی غلامی کا راز ہے یہ کوشش کی ہے کہ غالب قوم کی زبان کم و بیش اختیار کرلیں لیکن ایسی سعی کا انجام ہمیشہ اُن کی تباہی ہوا ہے۔ روما نے باوجود اِس کے کہ تیغِ نصرت اُس کے ہاتھ میں تھی جب مفتوح یونان کی زبان کو اختیار کرنے میں جدّوجہد شروع کی تو روما کی تہذیب میں انحطاط شروع ہوگیا اور علوم و فنون میں بجائے ترقی کے تنزل کے آثار نمایاں ہوگئے یہ روما کی خوش قسمتی تھی کہ اہلِ روما وقت پر اپنی شدید غلطی سے واقف ہوگئے ورنہ ممکن نہ تھا کہ اُن کی ہستی بربادی سے محفوظ رہ سکتی۔ یورپ میں جب تک مادری زبانوں کے مقابلہ میں لاطینی کو فروغ رہا اہلِ یورپ علم اور حقیقی آزادی دونوں سے محروم رہے لیکن روما اور یورپ میں زبان میں کورانہ تقلید کے اثر کو سیاسی آزادی نے ایک حد تک باطل کردیا تھا۔ مگر ہمارے قبضے میں نہ قلمِ تعلیم ہے نہ سیفِ سلطنت اگر ہم اپنی زبان کی طرف سے ایسے ہی غافل رہیں جیسے کہ عام طور پر ہیں تو اس کا انجام ہماری قطعی اور یقینی قومی موت ہے۔

میں پھر کہوں گا کہ زبان فاتح کی تلوار کی آواز کا نام نہیں ہے۔ فاتح اپنا خطبہ اور سکّہ جاری کرسکتا ہے لیکن اپنی زبان جاری نہیں کرسکتا۔ مفتوح فاتح کا مذہب اختیار کرسکتا ہے لیکن اُس کی زبان اختیار نہیں کرسکتا۔ زبان ملک اور ملّت کے قلب کی حرکت کی صدا ہے۔

آج ہم میں چند لوگ ایسے ہیں جنھوں نے ہندوستان اور یورپ میں تعلیم پاکر انگریزی اور دیگر السنۂ مغربیہ میں کتابیں تصنیف کی ہیں لیکن زمانہ اِن تصنیفات کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ ہر تصنیف ہمارے اہلِ ملک کی جو اُردو میں نہ ہو ایک عارضی ہستی رکھتی ہے۔ ہندوستان میں آج انگریزی کا یہ زور شور ہے کہ ہندوستانی شعرا تک انگریزی میں کلام موزوں کرتے ہیں اسی طرح انگلستان میں شکسپیر اور ملٹن کے زمانہ میں لاطینی میں اگر شعر کہا جاتا تھا تو داد ملتی تھی اور مادری زبان میں عمدہ سے عمدہ کلام کا کوئی پُرسان نہ تھا۔ آج کوئی بتا سکتا ہے

کہ وہ لاطینی شاعری کہاں ہے۔ عجائب خانوں کی دائم مقفل الماریوں کے سوا اِن اجزا کا کہیں پتہ نہیں اور لاطینی الاصل اہلِ زبان کی رائے میں وہ کلام طالب علموں کی مشق سے زیادہ مرتبہ نہیں رکھتا لیکن ملٹن کی وہ انگریزی تصنیف جس کا معاوضہ مصنف کو بمشکل تمام بیس روپیہ ملا تھا اور جس کو ہر شخص حقارت سے دیکھتا تھا اب انگریزی علمِ ادب کی جان ہے۔ انگریزی ملّت کی ہستی آج ملٹن اور شکسپیر کے کلام پر قایم ہے۔

ہندوستان میں زبان سے غفلت کا الزام تمام قوم اور ملک کے سر پر ہے کوئی طبقہ ایسا نہیں جس کو اس بارہ میں مستثنیٰ سمجھا جائے۔ اُردو کا سب سے پہلا اور بڑا دشمن ہندو مسلمانوں کا باہمی نفاق ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ ہندوستان کی مادری زبان ہندی ہے۔ مسلمان کہتے ہیں کہ اُردو ہے محض الفاظ نے دونوں کو مغالطہ دیا ہے۔ یہ امر نہایت افسوس ناک ہے کہ مسلمان اُردو میں ہندی الفاظ کی تعداد کو کم اور عربی اور مشکل فارسی الفاظ کی تعداد کو زیادہ کرتے جاتے ہیں اور ہندو ہندی سے سہل اور رائج عربی اور فارسی الفاظ کو خارج، اور غیر مانوس اور ادق سنسکرت الفاظ کو اُن کی جگہ داخل کرتے جاتے ہیں۔ اگر یہ افراط و تفریط یوں ہی جاری رہی تو اُردو اور ہندی سچ مچ دو جُدا اور مختلف زبانیں بن جائیں گی۔ ہندو اور مسلمانوں کو اپنی اس غلطی پر متنبہ ہونا چاہیئے کیوں کہ دونوں کی یہ نادان دوستی زبان اور ملک کے حق میں عین دشمنی ہے۔

اُردو کی ترقی میں دوسرا امر مانع یہ ہے کہ علما اور قدیم تعلیم یافتہ اُردو کو عربی اور فارسی کے مقابلہ میں غیر ضروری اور کم وقعت جان کر اُردو کی جانب توجہ نہیں کرتے اِن بزرگوں نے جہاں اُردو کو اور طریقوں سے نقصان پہونچایا ہے وہیں ایک یہ بھی ہے کہ وہ عربی عبارت ہمیشہ خلاف محاورہ اُردو میں ترجمہ کرتے ہیں۔ قدیم مدرسہ عربیہ دہلی، دیوبند اور تمام عربی، فارسی مدارس اور مدرسین پر کتنا بڑا الزام ہے کہ آج تک کتب تفاسیر، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ اور ادب کی ضروری سے ضروری کتابیں بھی عام فہم محاورہ اُردو میں ترجمہ نہیں ہوئیں۔ طبیب ہندوستان میں آج تک فارسی میں نسخہ لکھتے ہیں۔

لیکن وہ گروہ جو سب سے زیادہ موردِ الزام ہے جس کے افراد آنکھیں رکھتے ہیں مگر اُردو پڑھنے کے لئے اندھے ہیں، کان رکھتے ہیں لیکن اُردو سُننے کے لئے بہرے ہیں، زبان رکھتے ہیں لیکن اُردو بولنے کے لئے گونگے ہیں، جدید تعلیم یافتہ گروہ ہے۔ تمام انگریزی مدارس، کالجوں اور یونیورسیٹوں میں تعلیم غیر زبان میں ہوتی ہے،

اُردو کی تعلیم پانچ سات ابتدائی جماعتوں کے بعد قطعاً بند ہو جاتی ہے علاوہ ازیں مضمون ریاضی، تواریخ، جغرافیہ، منطق جملہ علوم کی تعلیم انگریزی کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ جو قوم یوں اپنی زبان سے غافل ہو وہ دنیا میں کیا فروغ پا سکتی ہے۔ جس ملک کے لوگ اپنی مادری زبان کو پس پشت ڈال دیں اُس کی خاک سے بھلا کب کوئی فرزانہ اُٹھ سکتا ہے۔ جو ملت اپنی زبان کو باعثِ ننگ اور دوسروں کی زبان کو مایۂ ناز خیال کرے اُس میں کیا خودداری آسکتی ہے۔ یہ اپنی زبان میں تعلیم نہ پانے کا اثر ہے کہ ۱۸۵۸ء سے آج تک مغربی تعلیم پانے کے باوجود کوئی قومی اور ملکی نتیجہ مترتب نہیں ہوا۔ جاپانیوں نے صرف ستر سال کی جدید تعلیم سے یورپ کی ہم نشینی کی قابلیت حاصل کر لی ہے۔ مغرب میں عورتوں کی تعلیم کو صرف چالیس برس ہوئے ہیں۔ جو لوگ کہ اب اظہار خیالات کے لئے غیر زبان کے محتاج ہیں اور جو آیندہ اگر یہی روش قایم رہی تو اور زیادہ دست نگر ہوں گے وہ کیا قوم و ملت کی بنیاد ڈال سکتے ہیں اُن کی زندگی ایک تقلید غلامانہ اور ایک انجذاب گدایانہ ہونی ضروری ہے۔ ہندوستان کی مختلف السنہ میں جو تنازع بقا ہو رہا ہے وہ اُردو، ہندی، بنگالی، مرہٹی، گجراتی وغیرہ زبانوں کے درمیان ہے اگر ہماری توجہ صرف انگریزی کو "میاں مٹھو" کی طرح حاصل کرنے میں ہی صرف ہوتی رہی تو اِس جہد للبقا میں اُردو آخر کب تک قایم اور زندہ رہ سکتی ہے۔ ہمارے طالب علم جو ہماری آیندہ نسل ہیں جو ہندوستان اور دُنیائے اسلام کے آیندہ وارث ہیں جن سے ہماری تمام آیندہ توقعات وابستہ ہیں جب اپنی مادری زبان سے غافل ہو کر اور اُردو کی جانب سے پشت پھیر کر رات دن کی شدید محنت اور سخت آگ اور ظالمانہ ضربات کی مدد سے انگریزی تعلیم کی زنجیر تیار کرتے ہیں تو بالآخر اِس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے جس وقت آخری کڑی وصل ہو جاتی ہے اُس وقت معلوم ہوتا ہے کہ وہ زنجیر خود اُنھیں گرفت میں لئے ہوئے ہے۔

ہمارے ملک کے نئی تعلیم پائے ہوئے اہلِ قلم انگریزی زبان میں تصنیف و تالیف کرتے ہیں، اُن کا وقت دن رات انگریزی اور مغربی علم ادب کے مطالعہ میں صرف ہوتا ہے، اُن کے کتب خانوں میں اُردو، فارسی اور عربی کتابوں کا وجود کمیاب بلکہ نایاب ہے اُن میں سے بہت کم ایسے ہیں جو اُردو ادب فارسی شاعری اور عربی علوم سے واقفیت رکھتے ہوں اور جن کو علوم مشرقیہ کی معلومات میں اضافہ کا شوق ہو گفتگو میں وہ علوم و فنون

اور حکمت کی مصطلحات پر تو کیا روزمرہ کے الفاظ تک پر قدرت نہیں رکھتے اُن کی زبان اُردو اور انگریزی الفاظ کا ایک عجیب آمیزہ ہی اُن کی تقریروں میں جس قدر ریطوریقا کا زور بڑھتا جاتا ہی انگریزی الفاظ کی تعداد میں اُس ہی نسبت سے اضافہ ہوتا جاتا ہی۔

وہ اعلیٰ ترقی جس کے ہم آرزومند ہیں اور وہ سچی آزادی جس کی ہم خواہش رکھتے ہیں اُردو کے کفِ پا کے نیچے ہی۔ زبان وطن کا کلام ہی اور وطن کا کام وطن کے کلام سے جدا نہیں جب تک طلبا کو ہندوستان میں مادری زبان میں تعلیم نہ دی جائے گی تعلیم جزوِ حیات بن ہی نہیں سکتی اور تاوقتیکہ اُردو کو ذریعہ تعلیم نہ بنایا جائے گا اگر ہم میں سے ہر ایک کے سر میں ہزار دماغ ہوں تب بھی بیکار رہیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ جدید تعلیم یافتہ طوطے کی طرح آوازنگار اور صورت پرست ہیں اور اُن کا عدم اور وجود برابر ہے بلکہ اُن کا وجود عدم سے بدتر ہے اگر وہ تعلیم یافتہ نہ ہوتے تو شاید قوائے جسمانی سے ہی (جن کو جدید تعلیم نے مضمحل کر دیا ہی) تنازعِ بقا میں اپنی ہستی کے قایم رکھنے کے زیادہ قابل ہوتے۔

(۲)

زبان جسم ہی اور خیالات اُس کی رُوح ہیں کسی ملک کی تہذیب کی ترقی کے لئے صرف یہ ہی کافی نہیں ہی کہ مادری زبان ذریعہ تعلیم ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہی کہ جن مضامین میں تعلیم دی جائے وہ قومی اور ملکی ضروریات کے لحاظ سے مقرر کئے گئے ہوں۔ نصاب تعلیم کوئی ترکہ نہیں ہی جو ایک نسل سے دوسری کو وراثت میں ملتا ہو بلکہ ہر قوم اور ملک کی ہر نسل کو اپنے نصابِ تعلیم کو از سرِ نو ترتیب دینا ضروری ہی۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے اہلِ ملک اور اہلِ قوم اس سے واقف نہیں۔ قدیم درسگاہوں میں اب تک درس نظامیہ کی پابندی ہی اور جدید انگریزی مدارس اور کالجوں میں تمام علومِ مشرقیہ "ٹکسال باہر" خیال کئے جاتے ہیں۔ محض علوم مشرقیہ اور عربی کی قدیم تعلیم اس زمانہ میں کئی وجوہ سے غیر مفید اور نقصان دہ ہی۔ عربی تعلیم علوم جدیدہ کی واقفیت بغیر قوم کے حق میں بجائے آبِ حیات کے زہرِ ہلاہل اور نوشِ قاتل کا اثر رکھتی ہی۔ جب تک علوم مشرقیہ کا مطالعہ تنقید اور نکتہ چینی کی نگاہ سے نہ کیا جائیگا اور کھرے کو کھوٹے سے جُدا نہ کیا جائیگا علوم مشرقیہ میں جدوجہد سے بجائے آزادانہ اجتہاد کے غلامانہ تقلید اور بجائے علمی ہمت کے علمی پست ہمتی پیدا ہوگی

کون نہیں جانتا کہ علوم عربیہ اور مشرقیہ کے بہت سے حصے جدید تحقیقاتوں کی رُو سے غلط ثابت ہو چکے ہیں پس جب تک طالب علم کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ غلطیاں کیا ہیں اور وہ اُن سے اجتناب کرسکے، علوم مشرقیہ کی تعلیم نیم جہالت نہیں تو کیا ہے؟ ہم ایسے سیاسی اور تمدنی حالات میں گرفتار ہیں جہاں زمانے کے ساتھ ساتھ حرکت نہ کرنا موت کا مترادف ہے۔ جسٹس امیر علی اپنی یادگار وقت تصنیف میں فرماتے ہیں:۔

"جو قوم اپنے مردہ زمانۂ ماضی کو فرسودہ عبا میں ڈھانپنے کی کوشش کرتی ہے اُس کے نصیب میں اوّل ہی سے صفحۂ ہستی سے مٹنا لکھا ہے"

چوں کہ زمانہ کو محض قدیم علوم کی ضرورت نہیں یہ علوم وجہ معاش میں بھی بہت کم مدد دیتے ہیں۔ آج کل دُنیا کی نعمتوں اور ملکی اور قومی آسائش کا مدار تعلیم جدید پر ہو گیا ہے۔ جسٹس شاہ دین مرحوم لکھتے ہیں:۔

"وجاہت ظاہری لازمی ہے۔ اسلام کوئی مٹی کی مورت نہیں بلکہ یہ مجموعہ ہے مسلمانوں کی صورتوں کا۔ اگر مسلمانوں کی صورتیں پاکیزہ ہیں، لباس عمدہ اور شاندار ہیں، چہرے اُداس نہیں بلکہ ارغوانی ہیں، بشرہ سے آثار جاہ و جلال پائے جاتے ہیں تو اسلام کی عزت ہے اور اگر وہ پھٹے حالوں میں ہیں، بھوکے پیاسے ہیں، کمزور و ناتوان ہیں اور دُنیا میں اُن کی کوئی توقیر نہیں تو اسلام کی ذلت ہے۔ دین و دُنیا کہنے کو چاہے الگ ہوں مگر دراصل لازم و ملزوم ہیں۔ بلا ترقی دُنیاوی ممکن نہیں کہ دین میں شان و شوکت پیدا ہو سکے"

لیکن جہاں قدیم تعلیم یافتہ گروہ کا قدیم علوم کو تمام جدید تحقیقات علمی سے بالا خیال کرنا بے جا ہے وہیں جدید تعلیم یافتہ گروہ کا جدید علوم کی خواہ مخواہ پرستش کرنا بھی غلط ہے۔ جدید علوم و فنون معاذ اللہ وحی خداوندی نہیں ہیں جنھوں نے قدیم علوم کا دفتر مٹا دیا ہو۔ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ مغربی علوم ہی جو جدید ہیں تحصیل کئے جانے کے مستحق ہیں اور جدید کو چھوڑ کر قدیم میں وقت صرف کرنا تضیع اوقات ہے اُن کو باوجود تعلیم پانے کے جاہل سمجھنا چاہیئے۔ جس مغرب کے آستانہ پر اس خیال کے لوگ شبانہ روز سجدہ گزار ہیں وہ مشرق ہی کا ادنیٰ شاگرد ہے۔ جو بات قدیم مصری کاہن سائس نے یونانی مقنن سولن سے کہی تھی وہ نہایت سبق آموز اور ہمارے حسب حال ہے:۔

"اہلِ یونان تم ہمارے سامنے بچے ہو۔ افلاطون جس پر تم کو ناز ہے ہمارے ہی مکتب کا فرزند ہے یقیس کے دبستان ہی میں تم سب نے تربیت پائی ہے تمہارا فیثاغورثی فلسفہ ہم ہی نے تم کو تعلیم کیا ہے اور تم کو جو عقل و دانش سے عاری تھے ہم ہی نے غور و فکر کے جوہر سے مزین کیا ہے۔ تمہارا فلسفۂ ابتہاج اور تمہارا فلسفۂ غم ہمارا ہی عطا کردہ ہے ہم ہی نے تم کو رونا اور ہنسنا سکھایا ہے۔ الف سے لے کر بے تک جو کچھ تمہارا سرمایۂ ناز ہے ہمارا ہی دیا ہوا ہے"

علم فقہ کو لیجیے روما کی قدیم فقہ پر آج تمام یورپی فقہ کا اساس قایم ہے۔ روما کی مشہور و معروف فقہ کی بنیاد کس چیز پر قایم ہے؟ اُن کے تمام قانونی ادب میں سے ہم تک صرف چند کتابیں باندکٹے، گایوس ناول، یسطنیان وغیرہ پہونچی ہیں اس کے مقابلہ میں اسلامی فقہ گو مذہبی مسائل سے مخلوط ہے ایک بحرِ ذخار ہے۔ آج یورپ اور ایشیا کے کتب خانے ہماری فقہ کی سینکڑوں کتابوں سے بھرے ہوئے ہیں اگر روما والے دو چار مذاہب میں تقسیم ہیں تو ہمارے فقہا میں سو مذاہب ہیں، اگر کوئی خلیفۂ وقت یسطنیان کی طرح اِن تمام مذاہب سے ایک نیا مدرسہ ترتیب دینے کا حکم دے تو موجودہ زمانہ کے جدید ترین قوانین سے بہتر ایک مجموعہ قانون مدون ہو سکتا ہے کیا عقل سلیم یہی مشورہ دیتی ہے کہ روما کی چار گنی چنی کتابوں کا مطالعہ قانونی علم حاصل کرنے کے لئے کافی ہے اور اسلامی فقہ کی سینکڑوں کتابوں میں سے منتخب کتابوں کا مطالعہ ناکافی ہے؟ کیا عقل کا یہی تقاضا ہے کہ مسلمان طلبا اپنے قانونی علم کی بنیاد روما کی درسیات پر رکھیں اور اسلامی کتب کو طاقِ نسیاں پر ہی رہنے دیا جائے؟ روما کے قوانین کی تحقیق اور جستجو سے ہمیں کیا حاصل ہے؟ اسلامی فقہ کی چھان بین تنقید و تحقیق سے ہم اسلامی قوانین میں ایک تازہ رُوح پھونک سکتے ہیں۔

فلسفہ جس کے ساتھ ہمیشہ لفظ جدید نئی زمانہ کا رآمد کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے نہ معلوم کن معنوں میں نیا اور پرانا ہو سکتا ہے اور کس طرح فلسفہ مغرب کے نام سے موسوم ہو سکتا ہے۔ وحدت الوجود اور تصوّف میں آج تک عجمی مسلمانوں سے کوئی سبقت نہیں لے گیا۔ اپنشدوں کی تعلیم لافانی ہے جہاں یورپی فلسفی آکر رک جاتے ہیں اور اپنے عجز کا اقرار کرتے ہیں وہاں ہند و فلسفی بے خوف محیط کی انتہا اور بسیط کی ابتدا تک

چلے جاتے ہیں۔

فنون لطیفہ میں جو قومی خصوصیات پر مبنی ہیں مغربی تقلید اگر اظہار جنون نہیں تو کیا ہے لیکن تمام ہندوستان قدیم سازو غنا کو ترک کر کے مغربی باجوں اور گانوں پر فدا ہے۔ سر بیندر و موہن ٹیگور، کمار سوامی جیسے ماہرین کی رائے سے عام طور پر واقفیت تک نہیں اُن پر عمل کجا۔ افلاطون نے اپنی کتاب جمہوریت میں بیان کیا ہے کہ غیر موسیقی کو اپنے ملک میں دخل نہ پانے دو کیوں کہ یہ رفتہ رفتہ قوانین کو درہم برہم کر دیتی ہے اور تمام نظام قومی حتیٰ کہ آئینِ سلطنت کو تبدیل کر دیتی ہے اور ملّت کے شیرازہ کو پراگندہ کر دیتی ہے۔ کچھ موسیقی پر موقوف نہیں جہاں حقیقی لذتِ گوش نہیں وہاں وقوف بصر بھی مفقود ہے۔ صنم بازی اور مصوّری میں ہمارے نوجوان جدید تعلیم یافتہ اُن مجسّمات اور تصاویر کو دیکھکر جو عکّاسی کے درجہ سے بہت کم بلند ہیں بے خود ہو جاتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ قدیم یونانی اور جدید اطالوی احیاء کے بعد کا فن جس پر وہ جان دیتے ہیں مصر، اسیریا، اور قدیم ہند کے فن کی گرد کو بھی نہیں پہونچتا۔ اجنتا کے غاروں میں جو تصویریں ہیں اور اُن میں جو رنگ ہے تمام یورپ کے نگارخانوں میں پھر جائے وہ رنگ کسی مصوّر کے مو قلم نے نہیں دکھلایا۔ نٹ راجہ یا گیانی بدھا سے مائلوں کی زہرہ کو کچھ نسبت نہیں لیکن ہمارے بہت سے جدید تعلیم یافتہ جو یونانی زندگی میں زہرہ کی حیثیت سے بھی واقف نہیں اور اُس کو محض ایک بازو شکستہ عریاں عورت کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اُس پر غش ہیں حق یہ ہے کہ فدیئس اور پالگ ناطس، ہندوستان، مصر اور ایسریا کے قدیم اہلِ فن کی شاگردی کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتے۔

(۴)

علوم کی حالت جامد اجسام کی سی نہیں جو ایک دوسرے کا جزو بدن نہیں ہو سکتے بلکہ پودوں کی سی ہے جن میں باہم پیوند لگایا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے علمی احیاء کے لئے لازمی ہے کہ علوم مشرقیہ کی شاخ کہنہ میں علوم جدیدہ کی قلم لگائی جائے۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ ایشیائی قدیم نقطہ نظر اور یورپی جدید نقطۂ خیال کا اجتماعِ سعدین ہو تا کہ ہمارے اسلاف کے علوم و فنون جو بقول مولانا نذیر احمد خدانخواستہ بے جان اور مُردہ نہیں ہو گئے بلکہ صرف ٹھٹھر گئے ہیں پھر تندرست اور توانا ہو جائیں یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ علومِ

مشرقی کے سردجسم میں علومِ مغربی کا گرم خون پہونچایا جائے۔ اِس عظیم الشّان مقصد کی تکمیل کا ذریعہ صرف ایک ہی اور وہ یہ ہے کہ علوم مغربیہ اور علوم مشرقیہ کا مطالعہ ہم پہلو اور ساتھ ساتھ کیا جائے تاکہ دونوں کے باہم نقادانہ مطالعہ سے دونوں کے بہترین حصص خود بخود رفتہ رفتہ یکجان ہو جائیں اور ایک نئی ہندوستانی تہذیب کی عبارت اور ترتیب کا ذریعہ ہوں۔

اگر ہم اپنی ہستی برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہی کہ اپنے فلسفہ، اپنی طب، اپنے فنون، اپنی فقہ، اپنے علوم اور اپنی حکمت کو زندہ کریں اگر ہمارا از کار رفتہ مشرقی فلسفہ مغربی فلسفہ کے اختلاط سے اپنے رطب و یابس سے پاک ہو جائے تو وہ یقیناً ہماری تعلیم کا ضروری جزو بننے کی قابلیت رکھتا ہی اگر ہمارے فنون لطیفہ جن کی بنیاد روحانیت پر ہی مغربی فنون لطیفہ کے اصول پر غور کے بعد وسیع تر بنیاد پر قایم کیے جائیں تو کوئی شک نہیں کہ یورپ اور ایشیا دونوں کے موجودہ فنون سے زیادہ عظیم الشان فنون کی بنیاد قایم ہو سکتی ہی۔ اگر ہم مغربی فقہ کے مطالعہ کے بعد کامل غور و خوض کو کام میں لاکر اپنی قدیم فقہ کی تنقیدی نظر سے دوبارہ تدوین کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم بھی مثل اہلِ روما یا جدید اقوام کے ایک یادگار زمانہ جدید قانون اسلامی کے بانی نہ ہوں؟ ہمارے اسلامی اور ایشیائی علوم ہی ہماری ملت اور قومیت کی اصلی بنیاد ہیں اگر ان کا احیاء نہ ہوا تو ہم دُنیا میں فقط یورپ کی ایک پژمردہ نقل بن کر رہ جائیں گے جس کی یورپ کو کوئی ضرورت نہیں اور زمانہ ہمارے نام کو مٹا دے گا لیکن اگر ہم نے علوم شرقیہ اور غربیہ کی تعلیم پہلو بہ پہلو رائج کرنے کے طریقہ کو اختیار کیا تو یقیناً بیس۲۰ برس کے اندر اندر ایسی تصانیف اور تحقیقاتیں ہم سے ممکن ہوں گی جن کی یورپ قدر کرے گا اور جو دُنیا کے علم میں اضافہ کا باعث ہوں گی۔

(۴)

قدیم علوم کی قریب قریب تمام کتابیں عربی میں ہیں جدید علوم کی کتابیں یورپ کی مختلف زبانوں میں ہیں اُردو میں نہ قدیم مشرقی علوم کی کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں نہ جدید مغربی علوم کی ہم بحیثیت ہندوستانی ہونے کے اپنی مادری زبان اُردو میں نہ قدیم یونانی علوم کے (جن کو مسلمانوں نے اختیار کیا اور فروغ دیا تھا) اور نہ موجودہ یورپی علوم کے ہی (جو اِس وقت تمام دُنیا کی زبانوں میں شایع ہیں) مالک ہیں۔

بعض اشخاص ایک نہایت غلط دلیل عربی کو قدیم علوم اور انگریزی کو جدید علوم کے حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دینے کے متعلق یہ دیتے ہیں کہ ہر علم کو اُس کی مخصوص زبان میں حاصل کرنا چاہیئے۔ اُن کی رائے میں جو مضامین عربی کتابوں میں ہیں وہ عربی ہی میں مطالعہ ہوسکتے ہیں اور جو انگریزی کتابوں میں ہیں وہ انگریزی ہی میں پڑھائے جاسکتے ہیں لیکن یہ خیال غلط ہے۔ علم ہرگز جغرافی سرحدوں سے محصور نہیں ہے۔ ہر زبان کی مثال ایک خارجی ظرف کی سی ہے اور علم جو مظروف ہے کسی خاص ظرف کا پابند نہیں جیسے پانی کو جس وقت چاہیں ایک برتن سے دوسرے میں منتقل کرسکتے ہیں بعینہ اسی طرح ہر علم کو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرسکتے ہیں اگر اِس اصول کو تسلیم کرلیا جائے کہ علوم کا مطالعہ اصل زبانوں میں کرنا چاہیئے تو علوم جدیدہ کی ہر شاخ کے جاننے کے لئے ضروری ہوگا کہ یورپ کی کم ازکم سات زبانوں سے واقفیت ہو۔ فی زمانہ کسی جدید معرکتہ الآرا بحث کو لے لیجئے خواہ وہ فلسفہ میں ہو یا حکمت میں کسی جدید مسئلہ پر غور فرمایئے خواہ علوم سے متعلق ہو یا فنون سے کسی جدید اصول یا اکتشاف یا اختراع پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ کوئی مغربی ملک ایسا نہیں ہے جہاں متعدد ماہرین نے اُس کے متعلق نہ لکھا ہو اور اپنی معلومات سے اُس میں اضافہ نہ کیا ہو اس لئے فی زمانہ ہر مضمون سے ایک یا دو چار مغربی زبانیں جاننے پر بھی واقفیت محض ناممکن اور قطعی محال ہے جب تک زیادہ تر تراجم سے کام نہ لیا جائے۔

آج مغرب میں کوئی بھی ملک ایسا نہیں ہے جہاں تعلیم و تربیت کا ذریعہ تراجم اور فقط تراجم نہ ہوں علوم صحیحہ کی تعلیم بغیر تراجم ہو ہی نہیں سکتی علم اور حکمت کی کوئی شاخ ایسی نہیں ہے جس کے مطالعہ کے لئے تراجم کی احتیاج نہ ہو اگر کوئی شخص آج اصل زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دے کر (بطور مثال) صرف جدید فلسفہ سے واقف ہونا چاہے تو اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کم ازکم بیکن، برکلے وغیرہ سے واقف ہو جن کی اصل تصانیف لاطینی میں ہیں، دے کار، کامت، روسو وغیرہ سے واقف ہو جن کی اصل تصانیف فرانسیسی میں ہیں کانٹ، ہیگل، فشتے، شلینگل، لطشے وغیرہ سے واقف ہو جن کی اصل تصانیف جرمن میں ہیں۔ اسپی نوزا سے واقف ہو جس کی اصل تصانیف ڈچ زبان میں ہیں کروچے وغیرہ سے واقف ہو جن کی اصل تصانیف اطالوی زبان میں ہیں وعلی ہذا القیاس۔ تمام جدید فلسفہ سوائے برکلے، مل، اسپنسر وغیرہ کے غیر انگریزی یورپی زبانوں میں ہے اگر صرف

اصل زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی کوشش کی جائے تو علمی دُنیا میں قیامت برپا ہوجائے اور تمام علمی تحقیقاتیں
ایک دن میں بند ہوجائیں۔

علوم وفنون کی اُن کتابوں میں جو ادب اور معانی سے تعلق نہیں رکھتیں قریب قریب جملہ مضامین میں ترجمہ
اور اصل کتاب میں کوئی فرق نہیں ہوتا بلکہ میں یہ کہوں گا کہ چوں کہ مصنفین ماہرین ہوتے ہیں اور تمام عمر ایک
مضمون کی تکمیل میں صرف کردینے کے باعث ادب کی طرف توجّہ کرنے کی فرصت نہیں رکھتے اپنے مطالب کو
فصاحت اور بلاغت سے اکثر بیان نہیں کرسکتے اور مترجم جو عموماً ادیب ہوتے ہیں اپنے ترجمہ کو اصل کے
ان اسقام سے پاک کردیتے ہیں اور ترجمے بعض اوقات اصل سے بہتر ہوتے ہیں۔

ہندوستان کی موجودہ علمی حالت خود اِس امر کی متقاضی ہے کہ اہلِ قلم ترجمہ کے کام کی طرف توجہ
کریں۔ ہر ایک قوم کی زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب تاریخی اور سیاسی اعتبار سے علوم وفنون کی
روشنی کم ہوجاتی ہے اور اِس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنے چراغ کو اور اقوام کے چراغ سے روشن
کرے۔ اِس زمانہ میں آفرینش کی قوت زائل ہوجاتی ہے۔ جو تصنیفات ہوتی ہیں وہ ادنیٰ درجہ سے آگے
نہیں جاتیں اِلّا ماشاءاللہ عوام کا مذاق درست نہیں رہتا ایسے زمانہ میں ضروری ہے کہ کتابوں کے لکھنے والے
بجائے اِس کے کہ خود اپنے خام یا نیم پختہ خیالات کا اظہار کریں دُنیا کے گذشتہ اور موجودہ مصنفین کے
ترجمان ہوجائیں۔ گو ہم میں ہر شخص اِس بات کا مشتاق ہے کہ وہ خود مُصنّف ہو اور مترجم یا مؤلف ہونا اپنی
کسرِ شان تصور کرتا ہے مگر یہ خیال غلطی پر مبنی ہے آج یورپ میں مترجم بھی وہی پایہ اور درجہ رکھتے ہیں جو
خود مصنف رکھتے ہیں انگریزوں میں ولیم آرچر موجودہ مشہور نقّاد اور ادیب کی شہرت اِس بنا پر قائم ہے
اور ہمیشہ رہے گی کہ وہ اِبسن ناروے کے ڈراما نویس کا مترجم ہے۔ رکرٹ جس نے دیوانِ حماسہ کا ترجمہ کیا ہے
شعراءِ جرمنی میں ممتاز پایہ رکھتا ہے۔ اسٹیفان گیارگے المانی شاعر سون برن کا مترجم ہونے کی حیثیت سے
معروف ہے۔ ہمارے ملک میں جو حالت آج ہے وہ اِس امر کو چاہتی ہے کہ ترجمہ اور تالیف کو تصانیف پر
ترجیح دی جائے۔ سوائے معدودے چند لوگوں کے جن کو قدرت نے اعلیٰ ترین دماغوں سے مزین کیا ہے اور اپنے
خاص پیغام پہونچانے کے لئے مقرر فرمایا ہے ہمارے ملک وقوم کے بیشتر لوگوں کو چاہیئے کہ مشرقی اور مغربی

زبانوں سے ترجمہ کی جانب توجہ کریں۔

جن لوگوں نے ترجمہ کے کام کو کیا ہے اُن کو یہ شکایت ہے کہ مصطلحات کی تلاش اور ایجاد میں سخت مشکل پیش آتی ہے۔ میری رائے میں یہ اشکال خود ہی ترجمہ کے کام کو زیادہ قابلِ عزت اور وقعت بنا دیتا ہے کیوں کہ اس قسم کی مشکلات کو حل کر کے مترجم زبان کی عمارت کے اساس کو قایم کرتا ہے اور آیندہ نسلوں کے واسطے زبان کی ترقی کے راستہ کو صاف کرتا ہے۔

مصطلحات علمیہ کے متعلق بعض کا خیال ہے کہ اُن کے انتخاب یا وضع کرنے والے ماہرین ہونے چاہئیں یعنی جس علم و فن کی مصطلحات مطلوب ہوں اُن کو اُس ہی علم یا فن کے ماہرین بنائیں لیکن یہ درست نہیں ہمارے اکثر انگریزی یونیورسٹیوں کے ہندوستانی پروفیسر جو علوم جدیدہ کی تعلیم دیتے ہیں اپنی زبان میں مصطلحات سے بہت کم واقف ہیں بلکہ خود انگریزی زبان میں بھی علم اللسان کے نکتہ نظر سے یونانی اور لاطینی مصطلحات کے معنی نہیں جانتے۔ جدید علوم و فنون کی مصطلحات اور علمی لغات یورپ کی زبانوں میں زیادہ تر لاطینی اور یونانی الفاظ سے مرکب ہیں اور ہماری زبان میں عربی یا فارسی یا ہندی رائج ہوسکتی ہیں حاصل کلام اُردو زبان کی اِس خدمت کے لئے ایک ایسی جماعت کے تیار کرنے کی ضرورت ہے جس میں ماہرین کے علاوہ عربی، فارسی، یونانی، لاطینی، انگریزی، فرینچ اور جرمن کے جاننے والے موجود ہوں بعض مشرقی اقوام نے جن میں میں ترکوں کی مثال پیش کرتا ہوں انگریزوں کی طرح بہت سی جدید مصطلحات علمیہ کو (مثلاً آکسیجن ہائیڈروجن وغیرہ) ویسے کا ویسا ہی اپنی زبان میں لے لیا ہے یہ محض اُن کی پست ہمتی اور نارسی کی دلیل ہے انگریز تو یونانی اور لاطینی مصطلحات کو اختیار کر چکے اور وہ اُن کی زبان کا جزو ہو چکیں لیکن ہمارے لئے ابھی انتخاب کا موقع باقی ہے ایسی صورت میں جب کہ یہ بات یکساں ہمارے بس میں ہے کہ چاہیں تو یونانی اور لاطینی الفاظ اور مصطلحات کو لے لیں اور چاہیں تو خود اپنی زبان میں ترجمہ کرلیں ہمارا انگریزوں کی تقلید کرنا سخت غلطی ہوگا۔ جرمنوں نے جو علمی حیثیت سے ایک نئی قوم ہیں ایسا نہیں کیا بلکہ سب مصطلحات کو اپنی زبان میں ترجمہ کرلیا ہے۔

ہم کو چاہیئے کہ تمام علوم و فنون کی مصطلحات کو اپنی قدیم اُردو فارسی اور عربی زبانوں کی کتابوں سے

تلاش کریں بہت سے علمی لغات موجود ہیں مگر پرانی کتابوں میں دبے پڑے ہیں ان بے بہا موتیوں کو ان تاریک گہرائیوں میں سے نکالنا چاہیئے سائنس کی مصطلحات بھی بہت سی موجود ہیں صرف اُن کو تلاش کرکے رواج دینے کی ضرورت ہے۔ نباتیات کی بہت سی مصطلحات میزان الادویہ میں مل سکتی ہیں۔ کیوں کہ ہماری طب کی تقریباً تمام ادویہ نباتی ہیں اگر الفاظ نہ مل سکیں تو اُن کو خود بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے اس کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ انگریزی یا جس یورپی زبان کا لفظ ہو اُس کے اجزا کی تحلیل کرلینی چاہیئے اور پھر اُس کے لاطینی یا یونانی وغیرہ مادہ کے لحاظ سے اُس کا ترجمہ کرنا چاہیئے۔

مثالیں

Phono-graph	Phono آواز	graph نگار
Tele-phone	Tele دور	phone گو
Fernsprecher (جرمنی میں اسی لحاظ سے)	Fern دور	sprecher گو کہتے ہیں
Auto-mobile	Auto خود	mobile رواں
Telescope (پہلے سے موجود ہے)	Tele دور	scope بین

پس کام اتنا مشکل نہیں جیسا نظر آتا ہے۔

ترجمہ کرنے میں تین مختلف طریقے اختیار کئے جاسکتے ہیں ایک یہ کہ عربی[۱] دوسرے یہ کہ فارسی[۲] تیسرے یہ کہ ہندی[۳] مصطلحات وضع کی جائیں۔ عربی الفاظ کو ترجیح دینے والے یہ وجوہ پیش کرتے ہیں کہ عربی زبان میں تمام علوم وفنون کی مصطلحات موجود ہیں جو صرف مرور زمانہ سے غیر مستعمل ہوگئی ہیں اُن کو تلاش کرکے دوبارہ زندہ کرنا کافی ہے وہ کہتے ہیں کہ اس طریقہ کو اختیار کرنے سے دس بارہ برس میں علوم قدیمہ اور جدیدہ میں اتصال پیدا ہوجائے گا علاوہ ازیں اہل بیروت اور اہل مصر نے جو جدید مصطلحات وضع کرلی ہیں وہ ہمارے کام آسکتی ہیں اور بہت سی محنت بچ سکتی ہے لیکن میری ناچیز رائے میں اردو کے لئے جس طرح انگریزی لاطینی یا یونانی مصطلحات

کا اختیار کرنا غلط ہے عربی مصطلحات کا اختیار کرنا بھی درست نہیں۔ عربی مصطلحات کے اختیار کرنے سے وہی قباحت جو انگریزوں کو لاطینی مصطلحات کی وجہ سے عارض ہے باقی رہتی ہے اور وہ آسانی جو جرمنوں کو خاص جرمن مصطلحات سے حاصل ہے پیدا نہیں ہوتی لغات علمیہ کی خوبی یہ ہے کہ ہر شخص اُن کو بآسانی سمجھ لے اگر اُردو میں ایسی مصطلحات کو رواج دیا جائے جن کا مفہوم پانے کے لئے اوّل عربی زبان کا سیکھنا لازم ہو تو یہ لغات کسی طرح ہماری زبان اور ہمارے ملک کے لئے موزوں نہیں ہو سکتے۔ عربی لغات اختیار کرنے میں یہ مشکل ہے کہ وہ عام فہم نہیں ہیں دریافت کرتا ہوں کہ کون شخص ایسا ہے جو عربی زبان جانے بغیر ذیل کے الفاظ کے معنی سمجھ سکتا ہے۔

کثیرۃ الرجل ۔ اخطبوطیہ ۔ شوکیۃ الجلد ۔ مستعلج الجلد ۔ سلحفیہ ۔ مستقیم الاجنحہ ۔ اِس سے تو کہیں بہتر ہے کہ انگریزی مصطلحات ہی بجنسہٖ اختیار کر لی جائیں کیوں کہ گو ایسا کرنا کوئی فخر کا باعث نہیں لیکن ہمارے ملک کے لوگ انگریزی مصطلحات سے کم از کم ان عربی مصطلحات کی نسبت زیادہ واقف ہیں۔ ہندی الفاظ اور مصطلحات اختیار کرنے میں یہ دقت ہے کہ لطافت زبان بالکل جاتی رہتی ہے۔

مثال

ہندی لفظ

روکڑ سرمایہ Capital

ایک منطق کے رسالہ میں Contrary نقض اجمالی Contradictory نقض تفصیلی کا ترجمہ آدھا توڑ اور پورا توڑ کیا گیا ہے۔

میری رائے میں فارسی زبان کو اِس بارہ میں عربی اور ہندی زبانوں پر ترجیح ہے۔ میرا ناچیز خیال یہ ہے کہ ہم کو افراط اور تفریط سے بچنا چاہیئے اور سب سے اوّل جہاں فارسی مصطلحات موزوں بن سکیں اُن کو سب پر ترجیح دینی چاہیئے اِس کے بعد عربی قدیم مصطلحات کو جو مفرد یا مانوس الاستعمال الفاظ کی صورت میں ہوں اختیار کرنا چاہیئے ایسے الفاظ سے جو ہماری زبان کے لحاظ سے سخت یا وزنی ہوں اجتناب کرنا چاہیئے۔ فارسی زبان کو

مصطلحات وضع کرنے کے لحاظ سے جو خاص موزونیت حاصل ہے اُس کو نہایت آسانی سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔
اوپر جو عربی مصطلحات کی مثالیں بیان ہوئی ہیں اگر اُن کی بجائے فارسی مصطلحات وضع کی جائیں تو فارسی کی فوقیت عربی پر خود بخود عیاں ہو جائے گی کون ایسا شخص ہے جو مفصلۂ ذیل مصطلحات کے معنی نہیں سمجھ سکتا؟
کثیر پا۔ خار پشت۔ گداز جلد۔ غلاف پوش۔ راست پر۔ فارسی زبان میں جرمن کی طرح یہ خوبی ہے کہ جن دو لفظوں کو چاہیئے فوراً ملا کر مرکب لفظ بنا لیجئے مصطلحات کے لئے ایسی زبان سب سے زیادہ موزوں ہے عربی میں یہ بات نہیں ہماری زبان میں عربی مصطلحات ذرا ثقیل بھی معلوم ہوتی ہیں۔
ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ آیا مصطلحات کی لغت پہلے تیار ہونی چاہیئے یا پہلے مختلف مضامین کی کتابیں لکھی جائیں اور اُن میں حسب ضرورت مصطلحات وضع کر کے داخل کی جائیں اور پھر جب رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہو تو تمام مصطلحات کو یکجا جمع کر کے لغت تیار کی جائے لغت کی تقدیم کے مخالفین کہتے ہیں کہ اگر لغت پہلے سے تیار ہوئی تو وہ ناقص ہو گی اور اس طرح ناقص مصطلحات رواج پا جائیں گی بدیں وجہ لغت میں صرف اُنھیں الفاظ کو جگہ دینی چاہیئے جو وقت کی کسوٹی پر کسے جانے کے بعد مقبول عام ہو جائیں ہم اس تقدیم اور تاخیر کا قائل نہیں لغت کوئی زبان کی ٹکسال نہ ہو گی کہ اس کی تدوین کے بعد مصنفوں مؤلفوں اور مترجموں کو کوئی مصطلحات جو ٹکسال باہر ہوں لکھنے کی اجازت نہ ہو گی اور جو لفظ لغت میں جن معنی میں استعمال ہو گا اس کو سب کو قبول کرنا پڑے گا۔ ایسا خیال درست نہیں جو اشخاص اس وقت ایسی لغت ترتیب دے رہے ہیں اُن کا منشا صرف اتنا ہے کہ وہ مصنفوں، مؤلفوں یا مترجموں کی امداد کی غرض سے اپنی لغت میں امتحان اور آزمائش کے لئے الفاظ پیش کریں اور مصنف مؤلف اور مترجم اُن کی محنت سے مستفید ہوں اُن مصطلحات کی پابندی کسی پر لازمی نہ ہو گی بلکہ مصنفین مؤلفین اور مترجمین کا فرض ہو گا کہ وہ مصطلحات مندرجہ لغت میں اصلاح ترمیم اور قطع و برید کرتے رہیں یوں یہ کتاب لغت حقیقت میں ایک ابتدائی خاکہ ہو گی اور مذاق سلیم رکھنے والے اہل قلم اس کے مندرجہ الفاظ میں برابر ردّ و بدل کرتے رہیں گے اگر اسی طرح دونوں فریق ایک دوسرے کے مشیر اور معاون رہے تو دس بارہ برس میں ایک مستند لغت بھی تیار ہو جائے گی اور وہ وقت آجائے گا کہ الفاظ کے معنی کو مقرر کر دیا جائے۔

اکثر یہ دریافت کیا جاتا ہے کہ جدید مصطلحات کی لغت کی کتابیں ترکی عربی فارسی میں موجود ہیں یا نہیں؟ میں نے اس کے متعلق جہاں تک واقفیت بہم پہونچائی ہے وہ یہ ہے کہ ۱۹۲۷ء میں طہران میں ایک کتاب فرانسیسی زبان میں شائع کی گئی ہے جس میں علم الانسان اور طبِ مغربی کی مصطلحات فرانسیسی۔ انگریزی المانی اور فارسی میں درج ہیں اس کے علاوہ فارسی زبان میں جدید مصطلحات کی کوئی لغت نہیں۔ عربی میں بیروت میں چند کتابیں طبع ہوئی ہیں لوئس معلوف نے ایک لغت عربی الموسوم بہ المنجد ۱۹۰۸ء میں شائع کی ہے اس میں الفاظ کے معنی عربی سے عربی میں درج ہیں اور سائنٹفک اور ٹیکنکل مصطلحات بھی شامل ہیں۔ ایک اور مفید لغت جس میں بعض انگریزی مصطلحات کے عربی مرادف الفاظ موجود ہیں ابکاریوز ۱۸۹۳ء کی ہے۔

مصر میں ایک لغت اسپیرو کی ہے جو قاہرہ سے ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی ہے پروٹسٹنٹ کالج بیروت نے جدید علوم کی مختلف شاخوں پر تیس چالیس برس کا عرصہ ہوا ابتدائی کتب لکھوائی ہیں ان سے بھی مدد مل سکتی ہے لیکن بہت کم۔

دائرۃ المعارف البستانی بھی اس نکتۂ نظر سے قابل توجہ ہے۔ پرانی کتابوں میں الخوارزمی کی مفاتیح العلوم اور ایسی ہی بیسیوں کتابیں لائق غور ہیں ان میں سے بہت سے مصطلحات تلاش ہو سکتی ہیں جن کو رواج دینا ممکن ہے۔ ایک اور کتاب جس کی تعریف میں نے سنی ہے اور جو غالباً ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں موجود ہے۔

A[۱] dictionary of the Technical terms used in the Sciences of the Mohammedans.

ناگری پرچارنی سبھا اور گروکل ہردوار کی کتابیں اور درسیات بھی توجہ کے لائق ہیں۔

---

[۱] غالباً ڈاکٹر صاحب مرحوم کی مراد فاضل تھانوی کی کتاب سے ہے۔ (اڈیٹر)

بنگالی زبان پر مسلمانوں کے احسانات

(از جناب حامد جمال صاحب سابق مدیر مساوات مرحوم)

جناب حامد جمال صاحب نے ہندوستان کے نامور نغمہ سنج ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی تصانیف سے ایک اچھا انتخاب کر کے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس پر انھوں نے ایک مقدمہ لکھا ہے اور شاعر کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ اسی دیباچہ کا ایک حصّہ یہ مضمون ہے۔ یہ کتاب ابھی تک طبع نہیں ہوئی۔ چوں کہ اس مضمون میں فاضل مضمون نگار نے بڑی تحقیق سے کام لیا ہے اور بنگالی زبان سے مسلمانوں کا جو تعلق ہے اُسے ایسی خوبی اور وضاحت سے بیان کیا ہے جو اب تک کسی نے بیان نہیں کیا تھا، اس لئے میں نے اُردو میں اس کا شائع کرنا مناسب سمجھا۔ مضمون درحقیقت پڑھنے اور داد دینے کے قابل ہے۔ ادیٹر

بنگالی زبان قدیم پراکرت کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ پراکرت کے قواعد اب بھی اس زبان میں مروج ہیں۔ بدھ مذہب کے پیروؤں نے دسویں صدی کے آخر میں اس زبان کو جو اُس وقت گوڈا[1] پراکرت کہلاتی تھی ادبی شان دینی چاہی اور اس زبان میں کتابیں تصنیف کرنی شروع کیں مگر ہندوؤں کے دَور دَورے میں یہ پس کر رہ گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوؤں کا فلسفۂ نفرت ہی ان کی بقا کا اہم راز ہے۔

منوجس کے جغرافیہ کے مطابق بنگال آریہ ورت کا ایک حصّہ تھا اپنے ہم مذہبوں کو اس صوبے سے الگ رہنے کی ہدایت کرتا ہے اور یہاں کے لوگوں سے تعلقات قایم رکھنے کی ممانعت۔ اننت ترتھا نے اس ملک کو راکشسوں کا دیس کہا ہے اور یہ صرف اس لئے کہ یہاں کے باشندے مگدھ کی نسل سے تھے اور برہمنوں کا زور بہت دنوں اس ملک پر چل نہ سکا اور نہ ان کی سنسکرت کو کوئی عُروج حاصل ہوا۔ کرشن پنڈت نے جو بارھویں صدی میں گذرا ہے

[1] گوڈا بنگال کو کہتے ہیں

گوداپراکرت کو بھوتوں کی زبان قرار دیا ہے۔ ہندوؤں نے اِس زبان کی مکمل بربادی کا تہیّہ کر لیا تھا اور اِس کو ملیامیٹ کر چکے تھے جس کے ثبوت میں سنسکرت کا یہ مشہور قطعہ کافی ہے۔

"جو شخص اٹھارہ پرانوں یا رامائن کی داستانوں کو بنگالی زبان میں بیان ہوتے سُنتا ہے

وہ بدترین دوزخ میں جھونکا جائے گا۔"

اِس صورت میں کس کو اُمید موہوم بھی ہو سکتی تھی کہ یہ زبان زندہ بچیگی اور سرسبز ہوگی؟ اِس لئے کہ علاوہ برہمنوں کی دشمنی کے یہ راجاؤں مہاراجاؤں کی سرپرستی سے بھی محروم تھی اور تمام درباروں میں وکرماجیت کے وقت سے یہ قاعدہ چلا آرہا تھا کہ سنسکرت کے ناظم و ناثر زینت دربار ہوتے تھے۔ مگر انسانی قوت قدرت کی مشیّت میں رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتی۔ وہ زبان جو گلی کوچہ کی عامیانہ زبان ہو کر رہ گئی تھی اِس کی اعانت مسلمانوں کے سپرد کی گئی اور انھیں کے ہاتھوں یہ اس قدر عروج کو پہونچی کہ دورحاضرہ میں اہلِ علم جرمنی سے اس کے مشتاق ہو کر آئے۔ مسلمان چوں کہ دلوں پر حکومت کرنا چاہتے تھے اِس لئے جب تک وہ فاتحانہ مغائرت کو دُور نہ کرتے یہ مقصد نہیں حاصل ہو سکتا تھا اِس کے لئے لازم تھا کہ وہ یہاں کے باشندوں کی زبان سیکھیں، اُس کی قدرافزائی کریں تاکہ رعایا کے رسم و رواج اور جذبات کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ مسلمانوں نے سب سے پہلے ہندو مذہب کی دونوں مشہور اور متبرک کتابوں کا ترجمہ بنگالی زبان میں کرایا۔ اور اِس کا سہرا ناصر شاہ کے سر ہے جس کی شان میں شاعر ودیاپتی نے جس نے سلطان غیاث الدین کی بھی بہت تعریف کی ہے۔ متعدد قصیدے کہے ہیں اور اِس کی عدل گستری اور رعایا پروری کی تعریف کرتے ہوئے اِس کو محبت کا دیوتا قرار دیا ہے۔ یہ نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہوا ہے مگر اِس کا حوالہ دوسرے ترجمہ میں جو حسین شاہ کے عہد میں ہوا متعدد جگہ آیا ہے۔ حسین شاہ بنگالی زبان کا بڑا دلدادہ تھا اس نے اپنے معزز درباری مُلّا دھروا سو کو بھاگوت کا بنگالی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا جس کے دو باب تیار ہو جانے پر سلطان نے اِس کو گن راج خان کا خطاب عطا فرمایا۔ حسین شاہ نے اپنے جنرل پیر گل خاں گورنر چٹیاگانگ کے تحت میں مہابھارت کا ترجمہ کرایا۔ کوندر پرمیشور جس سے پیر گل خاں نے مہابھارت کا ترجمہ کرایا حسین شاہ کی تعریف میں یوں گویا ہوتا ہے۔

"بادشاہ ایک روشن دماغ اور اولوالعزم آدمی تھا۔ پانچوں گوڑھ[1] کے لوگ اِس کی تعریف میں

---

[1] سوارستوا یعنی پنجاب۔ کنیا کوجا یعنی قنوج۔ گوڑ یعنی بنگال۔ متھیلا یعنی دربھنگا۔ اور اتکالا یعنی اوڑیسہ۔ یہ سب مل کر پانچ گوڑ کہلاتے ہیں

رطب اللسان تھے۔ وہ فن سپہگری کا ماہر اور کلجگ میں مثل دوسرے کرشن کے تھا۔"

سری کرن نندی جس نے پیرگل خاں کے وفات کے بعد بقیہ حصّہ مہابھارت کا ترجمہ کیا حسین شاہ کے بارے میں یوں کہتا ہے:۔

"حُسین شاہ ایک زبردست بادشاہ تھا اور مثل دوسرے رام کے سلطنت کرتا تھا۔ وہ دنیا پر صلح دآشتی، سلوک اور سزا اور اپنے دشمنوں میں تفرقہ اندازی سے حکومت کرتا تھا۔"

سری کرن نندی نے ایک دوسرے مقام پر چھوٹے خاں ولد پیرگل خاں کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے:

"وُہ جنگ کے وقت بپھرا ہوا شیر ہے۔ وہ مثل ہاتھی کے نہایت وقار سے چلتا ہے۔ اس میں ستّوخ اوصاف ہیں اور خدا نے اس کو عالمگیر شہرت دی ہے۔ بلند خیالی اور سخاوت میں وہ ولی اور کرن کا مقابلہ کرتا ہے۔ فن سپہگری اور قوت بازی میں اس کا کوئی مثل نہیں ہے۔"

رامائن کا سب سے عمدہ ترجمہ کرتیواس نے کیا ہے اور اس کی مقبولیت کی کھلی ہوئی دلیل یہ ہے کہ پانچسو برس کے بعد بھی آج ہر سال اس کی لاکھوں کاپیاں بنگال میں فروخت ہوتی ہیں۔ کرتیواس نے اپنی زندگی کے نہایت مختصر حالات چھوڑے ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اس نے کہیں اپنے اس مربی بادشاہ کا نام نہیں لکھا ہے جس کے حکم سے اس نے رامائن کا ترجمہ کیا اور جس کی قدر افزائی سے اس کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔ وہ اپنے تذکرہ میں لکھتا ہے:۔

"اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد میں گوڈ کے بادشاہ کے دربار میں حاضری کا طالب ہوا اور پانچ اشعار اس کی خدمت میں لکھ بھیجے۔ میری درخواست منظور ہوئی اور بادشاہ نے مجھکو باریاب کیا۔ بادشاہ کا دربار مثل دیوتاؤں کے سبھا کے منوّر تھا اور میں اس منظر کو دیکھکر ششدر رہ گیا بادشاہ خوش و خرّم تھا اور سربرآوردہ لوگ اس کے گرد کھڑے تھے۔ محل کے مختلف حصّوں میں ناچ گانا ہو رہا تھا اور لوگ تیزی سے اِدھر اُدھر آجا رہے تھے۔ صحن میں سُرخ قالین بچھا تھا اور اس پہ ایک غالیچہ پڑا تھا۔ خوبصورت ریشمی شامیانے کے نیچے بادشاہ ماگھ کے مہینے کی ہلکی دُھوپ کا لُطف اُٹھا رہا تھا۔ میں بادشاہ سے فاصلہ پر جاکھڑا ہوا لیکن بادشاہ نے مجھے

قریب آنے کا حکم دیا۔ میں نے سات اشعار سنسکرت میں سنائے۔ بادشاہ نے غور سے سنا اور بہت محظوظ ہوا۔ کِدار خاں نے میرے اوپر گلاب چھڑکا اور بادشاہ نے مجھے خلعت سے سرفراز کیا۔ اس نے اپنے درباریوں سے پوچھا کہ اس شاعر کو کون سا انعام دینا زیادہ مناسب ہوگا؟ انھوں نے عرض کیا کہ جو حضور کی مرضی ہو۔ حضور کی اس قدر عزت افزائی ہی سب سے بڑا انعام ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں کسی انعام کا طالب نہیں ہوں بلکہ اپنے کلام کی سچی داد کا۔ بادشاہ نے میرے اس جواب کو بہت پسند کیا اور مجھکو رامائن کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ جب میں دربار سے باہر نکلا تو لوگ اضطرابِ شوق سے میری طرف بڑھے اور مجھے اپنے وقت کا والمیکی کہنے لگے"

یہ باتیں صاف ظاہر کر رہی ہیں کہ یہ دربار کوئی مسلم دربار تھا۔ کِدار خاں کی موجودگی اور بادشاہ کا خلعت عطا فرمانا اور اس کے بعد تمام درباریوں سے استفسار کرنا کہ کون سا انعام اس کے حسبِ حال ہوگا کافی ثبوت اس بات کے ہیں کہ بادشاہ کوئی مسلمان بادشاہ تھا اس لئے کہ کوئی ہندو راجہ کسی ودیارتھی کے انعام دینے میں کبھی نہ ہچکچاتا اور نہ اپنے وزیروں سے ایسا سوال کرتا اس لئے کہ وہ ہندو رسم و رواج سے واقف ہوتا۔ غرض مسلمانوں کی قدردانی اور حوصلہ افزائی سے تاریخ بھری پڑی ہے اور پرانی بنگالی کتابیں ایسے اذکار سے پُر ہیں۔ ہم یہاں صرف ایک حوالہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

"جب شفق کی سرخی سونا مُڑا کی بلند چوٹیوں کے سرسبز گھنے درختوں میں روپوش ہوجاتی تھی پیر گل خاں اپنے درباریوں کو محل میں طلب کرتا تھا۔ اس وقت مہابھارت کا مترجم معزز درباریوں کے سامنے اپنا ترجمہ سناتا تھا اور دلچسپ اور پُرلطف قطعات کی گورنر خود داد دیتا تھا۔ شاعر اپنے مُربی کو کلجگ میں ہری کا اوتار کہتا تھا اور انتہائے لطف و کرم یہ تھا کہ صاحبِ تخت باوجود مسلمان ہونے کے جس کے لئے ایسے الفاظ سخت توہین آمیز تھے کشادہ پیشانی سے ایسے خطابات کو قبول فرماتا تھا اور شاعر کی حوصلہ افزائی کرتا تھا"

مسلمانوں کی اس زبان پروری کا یہ اثر ہوا کہ ہندو راجاؤں نے بھی اب مسلم تقلید میں بنگالی شعرا کو اپنے دربار میں جگہ دینی شروع کی برہمنوں کے بنائے کچھ نہ بنی اور یہ زبان یوماً فیوماً ترقی کرنے لگی۔ مگر فارسی کے

فاتحانہ اثر سے یہ بری نہ رہ سکی اور یہ لازمی نتیجہ تھا۔ بنگالی زبان میں فارسی الفاظ تو اُسی وقت شامل ہو گئے تھے جب مسلمانوں کا حملہ شروع ہوا تھا۔ ۱۲۰۳ء سے ۱۸۰۰ء تک بہت سے الفاظ بنگالی زبان کے مُردہ ہو گئے تھے اور ان کے بجائے فارسی الفاظ مستعمل ہونے لگے تھے۔ مثلاً بجائے دھرما دھیکر کے لوگ قاضی کہتے تھے بجائے تھانیدار کے کوتوال، بجائے پترا کے وزیر اور بجائے شپنا کے پیک۔ نگر کو شہر۔ ٹکا کو خزانہ۔ بھومی کو زمین بھومیا کو زمیندار۔ اتھالیکا کو عمارت وغیرہ وغیرہ لوگ بولنے لگے تھے۔ مگر بنگالی شاعری کو اس وقت تک عروج حاصل نہ ہو سکا جب تک کہ مسلمانوں کے تمدن کا کافی اثر نہ پڑ لیا۔ اِن کے قبل کی شاعری صرف مذہبی شاعری تھی جس کو عام طور پر گنوار گایا کرتے تھے اور جو تخیل سے مُعرّا، مناظر فطرت اور جذبۂ انسانی سے بالکل بے بہرہ تھی۔

چودھویں صدی میں مسلمانوں کا پورا اثر پڑ چکا تھا اور اس صدی میں یہاں کے لوگوں نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی جس نے یہاں کی شاعری کو بہت زیادہ وسعت دی اور اس میں ایک نئی روح پھونکی اس جماعت نے عورت کی پرستش کو تکمیل رُوح کا سب سے اوّل اور اتم زینہ قرار دیا۔ اس کو پراکیا رس یا مدھور آرس کہتے ہیں۔ یہ طریقہ بدھ مذہب کے سہاجیہ طرز تعلیم سے ملتا جلتا ہے۔ یہاں کے لوگوں پر بُدھ مذہب کا جس قدر اثر تھا ظاہر ہے۔ اب فلسفۂ عشق مجازی اور مُسلم عشاق کی داستانوں نے اِن جذبات کو بھڑکانے میں دامن کا کام کیا۔ بنگال میں ایسے عقیدہ کا زور پکڑنا بہت ہی تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ یہاں کے تمدن کا فوٹو ایک شاعر یوں کھینچتا ہے۔

"آفتاب کی کرنیں ہماری پردہ نشینوں کو نہیں چھو سکتیں اور ماہتاب اِن غیرتِ ماہ کے روبرو نہیں آسکتا"۔

جس ملک کا یہ تمدن ہو اور جہاں کے دروازے اس سختی سے غیروں کے لئے بند ہوں وہاں اس عقیدہ کا پھیلنا اور ترقی کرنا محال معلوم ہوتا ہے۔ مگر جس طرح دیگر مقامات پر بھی سوسائٹی کے قوانین جذبہ کے بہاؤ کو نہیں روک سکے یہاں بھی اس تعشق کی نہر نے مذہبی اور اخلاقی دیواروں کو منہدم کر کے ایک سیلاب عظیم برپا کر دیا۔ چاندی داس اس دور کا قیس گذرا ہے اور اپنے گرم جذبات سے اس نے اس تحریک میں ایک

نئی رُوح پھونکی ہی۔ مشرقی بنگال میں اب تک وارفتگوں کو مجنون چانڈی کہتے ہیں۔ چانڈی داس ایک دھوبن رامی نامی پر عاشق ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کُذات کردیا گیا۔ اِس کے بھائی نکولا نے جو ایک ذی اثر برہمن تھا اپنے ذات والوں کی بڑی خوشامد کرکے اُن کو اس بات پر راضی کیا کہ اگر چانڈی داس اپنی اس رزالت کی حرکت سے باز آئے اور رامی کے عشق سے دست بردار ہو تو پھر ذات میں لے لیا جائے۔ اِس تقریب کے لئے نکولا نے ایک دعوت کا سامان کیا۔ اِس کی خبر رامی کو پہونچی اور برق بن کر اِس کے کلیجے کے پار ہوگئی۔ جب ذرا سنبھلی اور ہوش میں آئی تو آنسوؤں کے سوتے بہ نکلے اور آتشِ عشق نے اِس کو اِس درجہ مضطر کیا کہ گھر سے چل نکلی اور اُس مقام پر پہونچی جہاں اُن برہمنوں کا اجتماع تھا مجمع میں چانڈی داس کو دیکھکر وہ اپنے حواس میں نہ رہی اور زار وقطار رونے لگی۔ چانڈی کی جب اِس پر نظر پڑی تو اپنے سارے وعدے بھول گیا اور پروانہ وار اِس کے قدموں پر جاگرا اور معافی کی التجا کرنے لگا۔ اِس واقعہ کے بعد وہ زندگی بھر برہمن دیوتاؤں کو چھوڑکر اِس حُسن کی دیوی کو پوجتا رہا۔ اِس نے اپنے کلام میں بار بار رامی کو ویدوں کی ماں گیاتری کہکر پکارا ہی ایک مقام پر چانڈی داس کہتا ہی۔

"او دھوبن میری ملکہ تو میرے لئے وہ سب کچھ ہی جو ایک بچے کے لئے ماں باپ ہوتے ہیں۔ وہ نماز ثلاثہ جو ایک برہمن روزانہ اپنے خدا کے لئے پڑھتا ہی میں تیری پرستش میں ادا کرتا ہوں۔ تو میرے لئے اتنی ہی پاک ہی جتنی گیاتری جس سے ویدوں نے جنم لیا ہی۔ میں تجھکو سراوتی دیوی جانتا ہوں جو مجھ میں نغمہ پھونکتی ہے۔ میں تجھکو پربتی جانتا ہوں۔ تو میری گردن کی مالا ہی۔ تو میرا آسمان ہی اور میری زمین اور میری آنکھوں کا اُجالا ہی جس دن میں تیرے چاند سے مکھڑے کو نہیں دیکھتا ہوں اُس روز نیم مُردہ سے رہتا ہوں۔ تیری دلبری پر میرا عشق کوئی نفسانی خواہش نہیں رکھتا ہی۔"

چانڈی داس کی بلند خیالی ونغمہ نوازی اور جذبۂ فطرت کی حقیقی مصوری کا حسب ذیل نظم سے پتہ چلتا ہی۔

"ایسا افسانہ کسی نے کبھی نہ سُنا ہوگا۔ اُن کے دل روزِ اول سے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں (ھدانتن بود کہ پیماں محبت بستند) وہ ایک دوسرے کے سامنے ہیں مگر فرقت کے اندیشہ

سے رو رہے ہیں اگر ایک دوسرے کی نظر سے ایک لمحہ کے لئے بھی ہٹ جاتے ہیں تو اُن پر موت سے زیادہ سخت گھڑیاں گذر جاتی ہیں اور ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتے ہیں۔ تم کہتے ہو کہ آفتاب کنول کو پیار کرتا ہے لیکن کنول کہرمیں مُرجھا جاتا ہے اور آفتاب خوش وخرّم رہتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ بادل اور چتّا کا ایک دوسرے کو محبوب ہیں لیکن ابر اپنے وقت معیّنہ کے قبل ایک قطرہ پانی بھی اس چڑیا کو نہیں دیتا۔ پھول اور شہد کی مکھی طالب و مطلوب کہے جاتے ہیں لیکن شہد کی مکھی اگر پھول کے پاس نہیں آتی پھول اُس کے پاس کبھی نہیں جاتا۔ چکور کو چاند کا عاشق کہنا حماقت ہے۔ چانڈی داس کے عشق کا کسی سے مقابلہ کرنا ہی عبث ہے۔"

ایک مقام پر مفارقت کا منظر کھینچتے ہوئے چانڈی داس کہتا ہے:۔

"وہ اپنے دامن سے اپنے محبوب کو پنکھا جھلتا ہے اور اگر وہ اپنا سر ذرا بھی پھیر لیتا ہے تو یہ جُدائی کے خوف سے لرز اُٹھتا ہے۔ جب ملاقات ختم ہونے پر آتی ہے تو میری رُوح میرے جسم سے پرواز کر جاتی ہے۔ آہ اس کو بیان کرتے ہوئے میرا کلیجہ پھٹتا ہے!!!

کیا میں اب جاؤں؟ وہ تین بار یہ سوال کرتا ہے۔ آہ اِن لفظوں کے ساتھ کتنی ہم آغوشیاں اور کتنے گرم بوسے ہوتے ہیں وہ آدھا قدم چلتا ہے اور پھر پلٹ کر میری طرف تاکتا ہے۔ وہ میرے چہرے پر ایسی مضطربانہ نظر ڈالتا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیتا ہے اور مجھے اپنی قسم کھانے کے لئے کہتا ہے۔ آہ وہ دوسری ملاقات کے لئے کس طرح میری خوشامد کرتا ہے اُس کا عشق اِس قدر گہرا ہے اور اِس کی التجائیں اِس قدر صادق ہیں کہ انھیں ہمیشہ میرے دل میں رہنے دو۔"

چانڈی داس ایک دوسری جگہ اپنے عشق کا ان الفاظ میں اعادہ کرتا ہے۔

"اے میرے محبوب تو میری زندگی ہے۔ میرا جسم اور میری رُوح سب تیری خدمت کے لئے ہیں میرا خاندانی اعزاز میری شہرت میرا ایمان، میرا شرف اور وہ سب کچھ جو میرا ہے تیرا ہے۔"

سچ تو یوں ہے کہ چانڈی داس اور ودیا پتی جو اس کا ہمعصر تھا اور پندرھویں صدی کے آخر تک زندہ رہا ہے، اِن دو زبردست شاعروں کے ہوتے مُردہ سے مُردہ زبان بھی جی اُٹھتی۔ بنگالی شاعری پر انہیں کے زمانہ سے حقیقی معنوں میں "شاعری" کا اطلاق ہوتا ہے۔ فارسی زبان کا بھی تسلط پورے طور پر اب اس زبان پر ہوگیا تھا اور حافظ، سعدی، مولانا روم اور فریدالدین عطار لوگوں کے زبان زد تھے کہ پندرھویں اور سولھویں صدی میں صوفیائے کرام کے مسلک نے تمام ہندوستان میں ایک نئی رُوح پھونکدی اور ایک انقلاب عظیم برپا کردیا۔ اِس دور میں چار زبردست مصلح قوم پیدا ہوئے جنہوں نے ہندوستان کے چار کونے سنبھالے چتنیا بنگال میں، دنیان دیو مہاراشٹر میں، کبیر وسط ہند میں اور نانک پنجاب میں۔ اِن چاروں کا ایک ہی مسلک تھا صرف جزویات میں معمولی طور پر ایک دوسرے سے اختلاف تھا چتنیا کہتا ہے کہ ہر شخص سری کرشن کی پرستش ذات پات سے علیحدہ ہو کر کرسکتا ہے اور ہر شخص اپنے خدا کی محبت میں فنا ہو کر اس کا ہم ذات ہو سکتا ہے۔ ایک مقام پر یہ کہتا ہے "اگر ایک چنڈال متقی ہے اور خدا سے محبّت رکھتا ہے تو وہ سب برہمنوں سے افضل ہے۔ اگر کوئی کہے کہ اے کرشن تو میری زندگی ہے تو وہ یعنی کرشن فوراً اسے سینہ سے لگا لیگا۔ خواہ وہ کسی مذہب وملت کا ہو"

چتنیا کی نظروں میں چھوت چھات کوئی چیز نہیں ہے اس کا قول ہے کہ اگر کوئی ایک ڈوم کے برتن میں کھائے تو وہ اپنی اس خاکساری کے صلہ میں رحمتِ الٰہی کا مستحق ہوگا۔ اگر ایک موچی سچے دل سے خدا کی یاد کرتا ہے تو میں اس کے سو بار قدم چومنے کے لئے تیار رہوں۔ بھٹاچاریوں نے اس کی مذمت و تذلیل میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا اور آخر کار لاچار ہو کر قاضی سے فریاد کی کہ اس کا جلوس سنکرتنا جس میں یہ لوگ ہری کا بھجن گاتے ہوئے چلتے تھے شہر میں نکلنے سے بند کردیا جائے۔ قاضی نے فتنہ وفساد کے خوف سے ایسا ہی کیا لیکن چتنیا نے اُسی روز شام کو نہایت شان وشوکت کے ساتھ جلوس نکالا اور ٹھیک قاضی کے دروازہ پر لے گیا۔ قاضی پہلے تو اپنے حکم کی نافرمانی پر بہت برافروختہ ہوا مگر جب اُس نے چتنیا کی شراب محبت سے مخمور آنکھیں جو مثل آفتاب کے روشن تھیں دیکھیں تو اس کی سچّائی کا قایل ہوگیا، اپنا حکم واپس لے لیا اور بڑے شوق سے جلوس دیکھتا رہا۔ چتنیا کو فنا فی الکرشن کہئے تو بجا ہے۔ یہ شخص اب بھی بنگال اور اوڑیسہ میں اوتار مان کر پوجا جاتا ہے یہ ۱۴۸۶ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۳۳ء میں مرگیا۔ سولھویں صدی میں یہ زبان اپنے پورے شباب پر تھی اور جیسا کہ ہم اوپر بیان

کرآئے ہیں، مدھورارس کی حُسن پرستی اور چیتنیا کے دَورِ تصوف نے اِس کو بہت بلند کر دیا تھا اور اب یہ تمام انسانی جذبات کی اہم درجہ پر ترجمانی کرنے پر قادر تھی۔ لیکن سترھویں صدی میں آکر شاہجہاں کے آخری دَور کے ساتھ جب مُسلمانوں کے زوال کی بُنیاد پڑی اِس کو بھی انحطاط ہوا۔ یہاں کی شاعری میں وہ فطری جذبات وہ بلند خیالات اور پاکیزہ تخیلات اب باقی نہ رہے تھے۔ شعرا نے خدائی چوکھٹ چھوڑ کر اب راجاؤں کے در کی جبہہ سائی شروع کر دی تھی اور ان کی خوشنودی کے لئے اُن کی طبعی پرواز معشوقوں کی زلفوں میں پھنس کر رہ گئی تھی اور موئے کمر میں بندھ کر خود بھی معدوم ہو گئی تھی جس کی ایک مثال حسب ذیل ہے:

"اے راجہ میں اِس کی زلف کی کس طرح تعریف کروں لوگ اِس کو نافۂ ختن سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن دمایِنتی کی زلف کو اِس چیز سے مشابہ کرنا جس کو جانور شرم سے اپنے شکم میں چھپائے رہتا ہی محض حماقت ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اِس کی آنکھ مثل غزال (نظم میں خود غزال کا لفظ موجود ہی) کے ہی لیکن غزال اِس رشک میں اپنے پیر زمین پر پٹکتا ہی۔ خداوند تعالیٰ نے چاند کے جوہر سے دمایَنتی کا چہرہ بنایا ہی اِسی لئے چاند میں سُوراخ ہو گیا ہی جسے لوگ غار کہتے ہیں۔ کنول دمایَنتی کے حسُن سے شرما کر آبی قلعوں میں رُوپوش ہوئے ہیں۔ خداوند تعالےٰ نے دمایَنتی کی تخلیق سے پہلے اور عورتوں کو پیدا کر کے نسوانی حسن کے صناعی میں مہارت حاصل کی تاکہ وہ دمایَنتی کے جسم کو مکمل بنا سکے"؛

ایک تو مذاق اِس قدر گر گیا تھا دوسرے ملک میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا اور بغاوت اور سازش کے ہر جگہ مدرسے کھُل گئے تھے۔ قاعدہ ہی کہ دَورِ انقلاب میں قلم کا دور ختم ہو جاتا ہی اور اِس کا میدان بالکل مسدود۔ اِس صورت میں ضرورت تھی کہ کوئی اس زبان کا ناخدا پیدا ہو جو اِس کو اس طوفان سے بچائے اور مستقبل کے مہیب دَور کے لئے اِس کی مستحکم بنیاد قایم کر جائے۔ جن جن زبانوں کی حیات خدا کو منظور ہوئی ہی اِن کے لئے ایسے پر خطر دَور میں ہمیشہ ایک مردِ غیب کا ظہور ہوا ہی جس نے کارنمایاں کئے ہیں چنانچہ بنگالی زبان کو بھی سنبھالنے اور عروج دینے کے لئے ایک شخص اِس دَور میں پیدا ہوا۔ یہ کوئی برہمن یا گوتمی (بدھ مذہب رکھنے والا) نہ تھا بلکہ ایک مسلمان تھا جس نے زبان کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچا لیا اور موخرین کا کیا ذکر ہے

اپنے متقدمین پر بھی سبقت حاصل کی۔ اگر اس کو بنگالی زبان کا پیغمبر سخن کہا جائے تو بجا ہے اور اگر مسلمان اس کی نسبت سے اپنے کو بنگالی زبان کا جان بخش کہیں تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔

علاؤل نواب جلال پور کے ایک وزیر کا لڑکا تھا جب یہ کمسن تھا اس نے اپنے باپ کے ساتھ ایک ایک بحری سفر کیا۔ اس کے بیڑے پر پرتگالی بحری قزاقوں کا حملہ ہوا اور اس کا باپ ان سے دست بدست جنگ میں مارا گیا علاؤل کی قسمت میں ابھی اور بھی مصائب جھیلنے تھے جو ہر ادیب کا خاص حصہ ہوا کرتا ہے۔ وہ کسی طرح بچکر اراکان پہونچا۔ یہاں کے صاحب حکومت مسلم وزیر مگن ٹھاکر کی فرمایش سے اس نے پدماوت کا ترجمہ بنگالی میں کیا۔ مگن ٹھاکر ہی کے کہنے سے اس نے سیف الملوک اور بدیع الجمال کا بنگالی میں ترجمہ شروع کیا لیکن اپنے مربی کی اچانک موت سے برداشتہ خاطر ہوکر اس نے اس ترجمہ کو ادھورا چھوڑکر گوشۂ عافیت کی زندگی اختیار کی۔ مگر ابھی دنیا کے مصائب اس پر ختم نہ ہوئے تھے اور ابھی اس کو چند اور مصیبتوں کا سامنا کرنا تھا اسی زمانہ میں شجاع اورنگ زیب کا بھائی اراکان بھاگ کر آیا اور اس آفت کے مارے سے اور سردار اراکان سے سخت جنگ ہوئی جس کا انجام شجاع کی فاش شکست تھا۔ ایک دراندازمرزا نامی نے جو علاؤل سے ملّی بغض رکھتا تھا سردار اراکان سے یہ لگا دی کہ شجاع کی آمد میں علاؤل کی سازش شریک تھی۔ علاؤل قید خانہ میں ڈال دیا گیا اور کئی سال بعد وہاں کے مظالم سے اس کو نجات ملی۔ سید موسیٰ نے جو اراکان کا ذی اقتدار شخص تھا علاؤل کی ان برے دنوں میں خبر لی اور اسی کی فرمایش سے علاؤل نے سیف الملوک اور بدیع الجمال کا باقی ماندہ ترجمہ پورا کیا۔ دربار کے ایک ذی اثر شخص سید محمد خاں کے اصرار سے اس نے فارسی نظم ہفت پیکر کا بنگالی میں ترجمہ کیا اس کے علاوہ اس کی بہت سی نظمیں رادھا اور کرشن کی تعریف میں ہیں۔ علاؤل ۱۶۱۸ء میں پیدا ہوا ۱۶۵۸ء میں قید کیا گیا اور اپنے رہائی کے بعد سترھویں صدی کے آخر تک زندہ رہا۔

علاؤل نے بنگالی زبان میں کثرت سے سنسکرت کے الفاظ شامل کرکے اس کو بہت بلند کر دیا اور بنگالی زبان کے نئے محاورات کا بانی ہوا ہے اس کی بلند خیالی اور نکتہ سنجی کا حسب ذیل نظم سے پتہ چلتا ہے۔

"پدماوتی کے چہرے سے جو شعاع نکلتی ہے وہ اس کرن کو جو ایک طلائی آئینہ سے نکلتی ہے شرماتی ہے اس کے چہرے کے متعلق ایک امر نہایت تعجب خیز ہے وہ یہ کہ دو کنول ماہتاب کے طباق میں

مقید ہیں۔ آفتاب جو اپنے دوستوں کو دشمن کے ہاتھوں اس طرح محبوس دیکھتا ہے تو ان کی رہائی کے لیے پیشانی کے شہابی رنگ میں اُٹھ آتا ہے۔ عشق کا دیوتا آفتاب کی مدد میں بھووں کی کمان کھینچتا ہے اور اس کی آنکھوں کا نشانہ تاکتا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ دوست اتنے قریب رہکر ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکے ''۔

یہ استعارہ تلمیح طلب ہے کنول اس کی آنکھیں ہیں۔ آفتاب سنسکرت روایت کے مطابق کنول کا عاشق ہوتا ہے اور ماہتاب اس کا دشمن کنول دن میں کھلتا ہے اور شام کو مرجھا جاتا ہے۔ بدیع الجمال کے شروع میں علاؤل کہتا ہے:۔

''روشنی کی عزت کہاں رہ جاتی اگر یہ تاریکی کے پہلو بہ پہلو نہ رکھی جاتی۔ اگر دنیا میں بدکار نہ ہوتے تو تقدس کی زندگی کی کون قیمت جانتا۔ سمندر کے نمکین پانی سے ہم کو شیریں پانی کا زیادہ مزا ملتا ہے۔ اگر کنجوس نہ ہوتے تو ہم فیاض لوگوں کی تعریف نہ کرسکتے۔ سچ اور جھوٹ محض ایک تصویر کے دو رخ ہیں۔ اے علاؤل تو دنیا کی تعریف اور مذمت کو مت سن۔ جو تھوڑا ذخیرہ تو اپنے دل میں رکھتا ہے اسے بغیر کسی شرم وحجاب کے تو آزادی سے دنیا والوں کو تقسیم کر دے ''۔

علاؤل نے ہندو رسم و رواج اور مذہبی ارکان کی ادائیگی کا اتنا اچھا مرقع کھینچا ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کیوں کر اس کام کو انجام دے سکا جس کو مذہبی شعرا تکمیل دینے سے قاصر رہے۔

اس نے عاشق و معشوق کی جدائی کے دس مختلف پہلو اور صورتیں دکھلائی ہیں۔

اس نے ادویات پر اتنی زبردست بحث کی ہے اور فنِ حکمت پر اتنی مبصرانہ کتاب لکھی ہے کہ اس کو پڑھ کر ایک شخص پورا حکیم بن سکتا ہے۔

اس نے سیاروں کی گردش اور انسانی قسمت پر ان کے اثر کو اتنے مدلل اور مکمل پیرائے میں دکھلایا ہے کہ ایک نجومی اس سے سبق حاصل کرسکتا ہے۔

اس نے شاعری کے نئے اصول ایجاد کئے اور نئے اوزان مقرر کئے ہیں۔

غرض علاؤں نے اس زبان کو اتنی ترقی دی اور اس قدر مستحکم کردیا کہ یہ سخت سے سخت حوادث کا مقابلہ کرکے اب ہندوستان کی ایک مستند زبان ہوگئی۔

اِس زبان نے پراکرت سے جنم لیا۔ فارسی تربیت پائی اور سنسکرت کا جامہ پہنا۔ اِس وجہ سے اس میں پراکرت کی پاکیزگی فارسی کی نازک خیالی اور شیرینی اور سنسکرت کی جامعیت سب موجود ہے چوں کہ اس میں تین زبانوں نے اکٹھا ہوکر ایک نیا جنم لیا ہے یہی وجہ ہے کہ آج یہ ہر جذبہ کی ترجمانی پر اِس قدر قادر ہے اور تخیل کی ہر پرواز اِس میں اپنا نشیمن پاتی ہے لیکن سب سے زیادہ حصّہ اِس میں فارسی کا ہے اور اِس کے ثبوت کی زیادہ ضرورت نہیں اِس لئے کہ مسلمانوں کے زمانے کی کل تصانیف "مسلم بنگالہ" کہلاتی ہیں۔

آثار الکرام

تاریخ

ترقی علوم وفنون

بعہد

سلطنت مسلمانان ہندوستان

نوشتہ

حکیم سید شمس اللہ قادری - ایم - آر - اے - ایس
کارسپانڈنگ ممبر آف دی نیومسماٹک سوسائٹی آف انڈیا و ممبر
آف دی ہسٹاریکل سوسائٹی آف پنجاب وغیرہ وغیرہ

باب اول

مقدمہ

فتوحاتِ اسلام - وسط ایشیا میں خودمختار سلطنتوں کی ابتدا - آل طاہر - آل صفار - آل سامان - آل زیار - الپتگین - آل سبکتگین - سلاطین آل سبکتگین - آل سبکتگین کے عہد میں وسطِ ایشیا کی علمی حالت - آل سبکتگین کا مذاق علمی - سلطنت آلِ سبکتگین کے علمی مرکز - فارسی شاعری

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (۱۱ھ ۶۳۲ء) تک اسلامی حکومت عربستان کے کل جزیرہ نما

میں پھیل گئی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق (۱۱ھ/۶۳۲ء تا ۱۳ھ/۶۳۴ء) کے عہد خلافت میں پیروانِ اسلام نے عرب سے باہر قدم رکھا۔ چالیس سال کے اندر اندر ایران و خراسان کو فتح کر کے دریائے نیلاب تک پہونچ گئے۔ مغرب میں مسلمانوں نے پہلے پہل مصر میں قدم رکھا۔ پھر بحر ابیض کے کنارے کنارے بربر و کارتیج کو فتح کرتے ہوئے ۹۱ھ/۷۰۹ء تک ہسپانیہ میں پہونچ گئے۔ قرن اولیٰ کے ختم ہونے سے پہلے بحر اوقیانوس سے دیوار چین تک دنیا کا دو ثلث رقبہ مسلمانوں کے حیطۂ اقتدار میں آگیا۔

خلفائے عباسیہ (۱۳۶ھ/۷۵۴ء تا ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء) کے اوائل عہد میں اس عظیم الشان سلطنت کو انحطاط شروع ہوا دور و دراز کے علاقے خلفاء کے اثر و اقتدار سے آزاد ہونے لگے۔ مغرب سے اس کی ابتدا ہوئی۔ عبدالرحمن اموی (۱۳۸ھ/۷۵۶ء تا ۱۷۲ھ/۷۸۸ء) نے ۱۳۸ھ/۷۵۶ء میں ہسپانیہ میں علم استقلال بلند کیا۔ اس کے بعد مصر اور شمالی افریقہ میں بنی اغلب (۱۸۴ھ/۸۰۰ء تا ۲۹۶ھ/۹۰۹ء) اور بنی طولون (۲۵۴ھ/۸۶۸ء تا ۲۹۲ھ/۹۰۵ء) کے خود مختار خاندان قائم ہوئے۔ خلیفہ مامون (۱۹۸ھ/۸۱۳ء تا ۲۱۸ھ/۸۳۴ء) کے زمانہ سے مشرق میں خود مختار حکومتوں کا آغاز ہوا۔ مامون نے اپنے صاحب الجیش طاہر ذوالیمین کو خراسان کا والی مقرر کیا تو اس نے اپنی قوت و اقتدار کو بڑھا کر طوقِ اطاعت سے آزاد ہونے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلفائے بغداد نے خراسان کی حکومت کو اس کے خاندان میں موروثی تسلیم کر لیا۔ اسی زمانہ میں خلفا کی کمزوری سے دیگر والیان ملک نے بھی فائدہ اٹھایا۔ بحر اخضر کے نیچے دیلم و گیلان میں سادات علوی آزاد ہو گئے۔ سجستان و نیمروز میں یعقوب بن لیث بن صفار کا ظہور ہوا۔ اور تھوڑی ہی مدت میں اس نے آل طاہر کو خراسان سے بیدخل کر کے ہرات سے شیراز تک تمام ایران پر قبضہ کر لیا اور ایسی قوت پیدا کی کہ خلفائے بغداد بھی اس سے ہراساں ہونے لگے۔

تیسری صدی کے اخیر ایام میں آل سامان نے میدان ترقی میں قدم رکھا۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ اسد بن سامان کے چار لڑکے مامون کے زمانہ میں ماوراء النہر کے مختلف علاقوں پر گورنر مقرر ہو گئے تھے ان میں نوح بن اسد جو سمرقند کا والی تھا بہت ہوشیار اور اولوالعزم آدمی تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے علاقہ کا انتظام کیا بلکہ دوسرے بھائی احمد بن اسد سے فرغانہ کو لے کر ترکستان میں کاشغر تک اپنی حکومت کو وسیع کر دیا۔ نوح کے ان ابتدائی فتوحات سے ماوراء النہر میں ایک چھوٹی سی حکومت قائم ہو گئی جسے اس کے جانشین

اسمٰعیل بن احمد (۲۷۹ھ ۸۹۲ء تا ۲۹۵ھ ۹۰۷ء) نے اپنے زمانہ میں خوب ترقی دی۔ خلیفہ بغداد کی تحریک سے اس نے ۲۸۷ھ ۹۰۰ء میں صفاریوں (۲۵۴ھ ۸۶۷ء تا ۲۹۰ھ ۹۰۳ء) پر لشکر کشی کی۔ عمر بن لیث کے گرفتار ہو جانے سے خراسان پر اس کا قبضہ ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے طبرستان کے حاکم محمد بن زید علوی کو شکست دے کر اپنا مطیع بنا لیا۔ اسمٰعیل کے یہ فتوحات بڑھتے ہوئے دجلہ تک پہونچ گئے اور ایران و خراسان کا تمام ملک اس کے تصرف میں آگیا۔ لیکن اس وسیع مملکت پر سامانیوں کا قبضہ تھوڑے ہی زمانہ تک قائم رہا۔ آل بویہ (۳۲۰ھ ۹۳۲ء تا ۴۴۷ھ ۱۰۵۵ء) کے ظہور سے عراق اور جنوبی ایران میں ان کی حکومت ختم ہوگئی۔ قریب قریب اسی زمانہ میں البتگین نے جیحوں کے نیچے سلطنت غزنویہ کا سنگ بنیاد رکھا۔ ترکستان میں ترکان افراسیابیہ نے عروج پکڑنا شروع کیا۔ ان جدید حکومتوں کی بڑھتی ہوئی قوت نے سامانیوں کی طاقت مسدود کردی۔ اخیر کے دونوں خاندان اگرچہ سامانیوں کے مطیع اور زیر فرمان تھے، لیکن ان کے ضعف و انحطاط سے برابر فائدہ حاصل کرتے رہے یہاں تک کہ ایلک خاں (۳۸۳ھ ۹۹۳ء تا ۴۰۳ھ ۱۰۱۲ء) نے ۳۸۹ھ ۹۹۹ء میں بخارا پر قبضہ کرلیا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد سلطنت سامانیہ کا خاتمہ ہوگیا۔

آل سامان کے دربار میں کثرت سے ترکی غلام تھے اور ان بادشاہوں نے انھیں سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر مامور کیا تھا۔ ان غلاموں میں ایک کا نام البتگین تھا۔ عبدالملک بن نوح (۳۴۳ھ ۹۵۴ء تا ۳۵۰ھ ۹۶۱ء) نے اسے ۳۴۶ھ ۹۵۷ء میں ہرات کا گورنر مقرر کیا۔ لیکن کسی وجہ سے ۳۵۰ھ ۹۶۱ء میں معزول کرکے یہ خدمت ابوالحسن بن علی سیمجور کو تفویض کردی۔ البتگین اپنی معزولی سے ناراض ہوکر افغانستان میں چلا آیا اور غزنین کو صدر مقام قرار دے کر چھوٹی سی حکومت قائم کرلی۔ ۳۵۲ھ ۹۶۳ء یا ۳۵۴ھ ۹۶۴ء میں البتگین کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا ابواسحٰق اور اس کے بعد دو ترکی غلام بلکتگین اور پیری یکے بعد دیگرے چودہ سال تک غزنین میں حکومت کرتے رہے۔ ۲۷ شعبان ۳۶۶ھ ۹۷۶ء کو نوح بن منصور (۳۶۶ھ ۹۷۶ء تا ۳۸۷ھ ۹۹۷ء) کے ایما سے پیری نے حکومت غزنین سبکتگین کے حوالے کردی۔ اس تاریخ سے سلطنت آل سبکتگین کی بنیاد پڑی ہے۔

امیر ناصرالدین سبکتگین جب برسرِ حکومت ہوا تو اس کے قبضہ میں بہت تھوڑا ملک آیا۔ لیکن

اس نے اپنی قوت کو بڑھا کر مقبوضات میں وسعت دینا شروع کیا۔ پنجاب کے ہندوؤں کو شکست دے کر پشاور پر قبضہ کرلیا۔ شمال میں بڑھتا ہوا خراسان تک چلا گیا۔ ۳۸۳ھ/۹۹۴ء میں ابو علی سیمجور نے ماوراء النہر میں بغاوت کی اور امیر نوح بن منصور سے اس کی مدافعت نہ ہو سکی تو نوح بن منصور نے سبکتگین سے مدد چاہی۔ سبکتگین کی حسن لیاقت سے جب بغاوت فرو ہوگئی تو نوح بن منصور نے خوش ہو کر افغانستان کی حکومت کے ساتھ خراسان کی حکومت بھی اس کو تفویض کردی اور اس کے لڑکے امیر محمود کو سیف الدولہ کا خطاب دے کر یہاں کا سپہ سالار مقرر کیا۔ سبکتگین اس مہم سے واپس آرہا تھا کہ راستہ میں بمقام ترمذ ۳۸۷ھ/۹۹۷ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔

سبکتگین کے بعد اس کا لڑکا اسمٰعیل برسر حکومت ہوا لیکن محمود نے اُسے معزول کرکے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس وقت سلطنت سامانیہ تباہی کے قریب ہوگئی تھی۔ نوح بن منصور (۳۶۶ھ/۹۷۶ء تا ۳۸۷ھ/۹۹۷ء) کے مرنے سے ماتحت حکام کو خوب اقتدار حاصل ہوگیا تھا۔ جنوب میں محمود کی اور شمال میں ایلک خاں کی قوت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ عبدالملک بن نوح (۳۸۹ھ/۹۹۹ء) ایلک خاں کے مقابلہ میں کئی بار ہزیمت اُٹھا کر ۱۰ ذوالقعدہ ۳۸۹ھ/۹۹۹ء کو گرفتار ہوگیا تو اس پر وسط ایشیا کی اس عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ مملکت سامانیہ کو محمود اور ایلک خاں نے باہم تقسیم کرلیا۔ دریائے جیحون دونوں کا حد فاصل قرار پایا۔ شمالی ملک جس سے ماوراء النہر مراد ہے ایلک خاں نے لے لیا اور جنوبی علاقہ جس میں خراسان و افغانستان شامل ہیں سلطان محمود کی سلطنت میں داخل ہوگیا۔

سلطان محمود نے ۳۹۳ھ/۱۰۱۲ء سے ۴۱۵ھ/۱۰۲۴ء تک قریباً بائیس سال کے عرصہ میں ہندوستان پر بارہ حملے کئے جن کے حالات مورخ محمد قاسم فرشتہ نے تفصیل وار تحریر کئے ہیں۔ ان حملوں کی وجہ سے اس کی حکومت جنوب میں بتدریج وسیع ہوتی گئی۔ کشمیر و پنجاب کی فتح کے بعد ۴۰۹ھ/۱۰۱۸ء میں قنوج و متھرا اس کے قبضہ میں آ گئے۔ ۴۱۳ھ/۱۰۲۲ء میں کالنجر کے راجہ کو مطیع بنایا۔ ۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء میں گجرات پر لشکر کشی کرکے سومنات کو تاخت و تاراج کیا۔ ہندوستان کے علاوہ محمود نے شمال میں جو فتوحات حاصل کئے ہیں اُن کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔

اس نے ایلک خاں کو شکست دی بعد ازاں غور کو ۴۰۸ھ/۱۰۱۷ء میں خوارزم کو ۴۱۷ھ/۱۰۲۶ء میں مرغاب

کو فتح کیا۔ اسی سال ماوراء النہر کا ایک وسیع علاقہ جس میں سمرقند و بخارا واقع ہیں سلطنت غزنویہ میں شامل ہو گیا ۴۱۸ھ / ۱۰۲۷ء میں آل سلجوق نے اطاعت قبول کی۔ ۴۲۰ھ / ۱۰۲۹ء میں آل بویہ نے ہزیمت اُٹھا کر اصفہان کا تخلیہ کر دیا محمود نے ۳۱ سال حکومت کی اس مدت میں اس کی سلطنت سیحون سے خلیج فارس اور بحر اخضر سے دریائے گنجس تک پھیل گئی تھی لیکن اس کو جس قدر جلد ترقی ہوئی تھی اُسی قدر جلد تنزل و انحطاط ہو گیا۔ محمود کے بعد سلجوقیوں نے خوب زور پکڑا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ایران و ماوراء النہر کے کئی صوبے بلخ۔ خوارزم، اصفہان رے وغیرہ مسعود سے چھین لئے۔ علاء الدین غوری نے بہرام شاہ کے زمانہ میں جب غزنین کو فتح کر لیا تو سلاطین غزنویہ نے لاہور میں اپنا دار السلطنت منتقل کر دیا اور اُن کی حکومت صرف شمالی ہندوستان میں باقی رہ گئی۔ لیکن شاہانِ غور کی دست برد سے پنجاب بھی باقی نہیں رہا۔ ۵۷۱ھ / ۱۱۷۵ء میں یہ لوگ دریائے چناب تک چلے آئے اس کے بعد ۵۸۲ھ / ۱۱۸۶ء میں لاہور پر یورش کر کے خسرو ملک کو گرفتار کر لیا اور اس پر سلطنت آل سبکتگین کا خاتمہ ہو گیا۔

سلاطین آل سبکتگین

۳۶۶ھ ۹۷۶ء — ۵۸۲ھ ۱۱۸۶ء

نمبر	نام	ہجری	عیسوی
۱	امیر ناصر الدین سبکتگین	۳۶۶ھ	۹۷۶ء
۲	امیر اسمٰعیل بن سبکتگین	۳۸۷ھ	۹۹۷ء
۳	یمین الدولہ محمود بن سبکتگین	۳۸۸ھ	۹۹۸ء
۴	عماد الدولہ محمد بن محمود	۴۲۱ھ	۱۰۳۰ء
۵	نصیر الدولہ مسعود بن محمود	۴۲۱ھ	۱۰۳۰ء
	محمد بن محمود (مکرر)	۴۳۲ھ	۱۰۴۰ء
۶	شہاب الدولہ مودود بن مسعود	۴۳۲ھ	۱۰۴۰ء
۷	مسعود بن مودود (شیرخوار)	۴۴۰ھ	۱۰۴۸ء

۸	بہاء الدولہ علی بن مسعود	سنہ ۴۴۰ھ	سنہ ۱۰۴۸ء
۹	عزالدولہ عبدالرشید بن مسعود	سنہ ۴۴۰ھ	سنہ ۱۰۴۸ء
	طغرل غاصب	سنہ ۴۴۴ھ	سنہ ۱۰۵۲ء
۱۰	جمال الدولہ فرخ زاد بن مسعود	سنہ ۴۴۴ھ	سنہ ۱۰۵۲ء
۱۱	رضی الدولہ ابراہیم بن مسعود	سنہ ۴۵۱ھ	سنہ ۱۰۵۹ء
۱۲	علاء الدولہ مسعود ثانی بن ابراہیم	سنہ ۴۹۲ھ	سنہ ۱۰۹۸ء
۱۳	عضد الدولہ شیرزاد بن مسعود	سنہ ۵۰۸ھ	سنہ ۱۱۱۴ء
۱۴	سلطان الدولہ ارسلان بن مسعود	سنہ ۵۰۹ھ	سنہ ۱۱۱۵ء
۱۵	معز الدولہ بہرام بن مسعود	سنہ ۵۱۲ھ	سنہ ۱۱۱۸ء
۱۶	سراج الدولہ خسرو بن بہرام	سنہ ۵۴۷ھ	سنہ ۱۱۵۲ء
۱۷	تاج الدولہ خسرو ملک بن خسرو سنہ ۵۵۵	سنہ ۵۸۲ھ	سنہ ۱۱۸۶ء

شجرۂ نسب

جس زمانہ میں آل سبکتگین کا ظہور ہوا ہے، وسط ایشیا میں آفتاب علم و فن اوج کمال پر پہونچا ہوا تھا۔ قریب قریب اسی زمانہ میں امام بخاری، امام مسلم، ابو نصر فارابی، بوعلی سینا، امام رازی، ابوالفضل جوہری وغیرہ اسی سرزمین کی مردم خیز بستیوں میں پیدا ہوئے تھے۔ وسط ایشیا میں اس وقت جو حکومتیں قائم تھیں ان سب کے حکمران عموماً صاحبِ علم و فن اور علوم و فنون کے مربی و سرپرست تھے۔ ان حکومتوں میں ماوراءالنہر کے سامانی حکمران سب سے زیادہ طاقت ور اور ذی اثر تھے۔ علمی سرپرستی کے لحاظ سے بھی ان کا پایہ بڑھا ہوا تھا۔ اس خاندان کا تیسرا فرمانروا نصر بن احمد (۳۰۱ھ/۹۱۳ء — ۳۲۱ھ/۹۴۲ء) بڑا فیاض اور ہنرپرور بادشاہ ہوا ہے۔ استاد ابوالحسن رودکی جس کو فارسی شاعری کا ابوالآبا کہتے ہیں اس کے دربار میں ملک الشعرا کے عہدے پر مامور تھا۔ بادشاہ کی فرمائش سے اس نے کلیلہ دمنہ کے حکایات فارسی میں نظم کئے تھے[۱] اور اس کے صلہ میں چالیس ہزار درہم کا عطیہ ملا تھا۔ عنصری اپنے ایک قصیدہ میں لکھتا ہے ؎

---

[۱] شاہنامہ جلد چہارم صفحہ ۲۵۔ دولت شاہ سمرقندی صفحہ ۱۰

چہل ہزار درم رودکی زمہتر خویش　　عطا گرفت بہ نظم کلیلۂ در کشور

نوح بن نصر (۳۳۱ھ ۹۴۳ء – ۳۴۳ھ ۹۵۴ء) نے دار السلطنت بخارا میں ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا تھا جس میں نادر و نایاب کتابیں جمع تھیں بو علی سینا نے اس کتاب خانہ کو دیکھا تھا اُس کا بیان ہے کہ :

"اس میں قدما کی اکثر تصنیفات ایسی موجود ہیں کہ جن کے نام بھی کسی کو معلوم نہیں تھے اور خود میں نے بھی اُنھیں آج تک نہیں دیکھا تھا[1]"

نوح بن نصر کو علوم فلسفہ سے خاص دلچسپی تھی۔ خلفاے بغداد کے زمانہ میں فلسفۂ یونان کی جو کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئی تھیں اُن میں کثرت سے غلطیاں موجود تھیں۔ بادشاہ کی فرمائش سے ابو نصر فارابی نے ان تمام ترجموں کو صحیح و درست کیا اور ان کی مدد سے ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں فلسفہ یونان کے تمام مسائل جمع کئے اور اُس کا نام تعلیم ثانی رکھا۔ اسی کتاب کی بدولت اُس کا لقب معلم ثانی مشہور ہوا ہے[2]

نوح بن نصر کے دو جانشین منصور بن نوح (۳۵۰ھ ۹۶۱ء – ۳۶۶ھ ۹۷۶ء) اور نوح بن منصور (۳۶۶ھ ۹۷۶ء – ۳۸۷ھ ۹۹۷ء) بھی علمی دنیا میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ منصور بن نوح نے عربی سے فارسی میں کئی کتابیں ترجمہ کرائی ہیں۔ ایران کے جو مسلمان عربی سے نابلد تھے اُن کے لئے قرآن مجید کے سمجھنے کا کوئی ذریعہ موجود نہیں تھا۔ اس ضرورت کو محسوس کر کے منصور نے سمرقند، اسبیجاب، فرغانہ سے علماے وقت کو طلب کیا اور اُن سے امام ابو جعفر محمد بن جریر الطبری کی تفسیر کبیر کا ترجمہ کرایا[3]۔ اسی زمانہ میں اس کے وزیر ابو علی محمد بن محمد بلعمی نے امام طبری کی دوسری تصنیف تاریخ کبیر کا ترجمہ کیا[4]۔ اسی منصور بن نوح کے زمانہ میں امیر ابو المنصور بن عبد الرزاق طوس کا گورنر تھا۔ اس کو تاریخ عجم سے خاص دلچسپی تھی۔ ہرات، سیستان، شاپور، اور طوس

---

[1] ابن خلکان۔ ترجمہ بو علی سینا [2] طاشکبری زادہ نے مفتاح السعادہ (جلد ۱ صفحہ ۲۴۲) میں اور اُس کی پیروی میں حاجی خلیفہ نے کشف الظنون (باب الحکمہ) میں اس واقعہ کو منصور بن نوح کے عہد سے منسوب کیا ہے لیکن یہ صریح غلطی ہے۔ اس لئے کہ فارابی نے ۳۳۹ھ ۹۵۰ء میں انتقال کیا (مفتاح السعادۃ جلد ۱ صفحہ ۲۶۰) اور منصور اس کی وفات کے گیارہ سال بعد ماہ شوال ۳۵۰ھ ۹۶۱ء میں برسر حکومت ہوا ہے (عتبی ترجمہ اردو صفحہ ۸۶) [3] اس کا ایک نہایت نفیس قلمی نسخہ فرانس کے کتب خانہ ملی میں موجود ہے (دیباچہ مرزبان نامہ صفحہ ۹) [4] یہ ترجمہ نول کشور پریس لکھنؤ میں سنہ ۱۲۹۱ھ میں طبع ہوا ہے اور اس کا فرانسیسی ترجمہ چار جلدوں میں ۱۸۶۷ء میں بمقام پیرس چھپا ہے

کے چار موبدان مجوس کو جمع کر کے اُن سے خدائی نامہ کا پہلوی سے فارسی میں ترجمہ کرایا اور اُس کا نام شاہنامہ رکھا[1]۔

مشہور شاعر منصور بن احمد دقیقی نوح بن منصور کا درباری شاعر تھا اور بادشاہ کی فرمایش سے اس نے تاریخ عجم کو نظم میں لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن اُس کی بے وقت وفات سے یہ کام ادھورا رہ گیا جس کو فردوسی نے اختتام کو پہونچایا۔

آل وشمگیر کو بھی علمی دنیا میں غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ یہ خاندان طبرستان میں حکمراں تھا شمس المعالی امیر قابوس بن وشمگیر (۳۶۶ھ تا ۴۰۳ھ / ۹۷۶ تا ۱۰۱۲) جو سلطان محمود کا معاصر ہے بلند پایہ عالم گزرا ہے۔ عربی فارسی میں شعر خوب کہا کرتا تھا۔ خطاطی میں بھی اسے کمال حاصل تھا۔ وزیر صاحب عباد نے جب اس کے نوشتہ کو دیکھا تو ان الفاظ میں اُس کی تعریف کی "ھذا خط القابوس ام جناح الطاوس"[2]۔ امام ابوسہیل صعلوکی نے جو خراسان کے قاضی القضات تھے اس کی مدح میں متعدد تصنیفات لکھی ہیں[3]۔ ابوریحان البیرونی سلطان محمود کے دربار میں آنے سے پہلے عرصہ تک امیر قابوس کے دربار میں رہا ہے اور اسی زمانہ میں اس نے اپنی تاریخ امم قدیمہ لکھی ہے جس کا نام آثار الباقیہ فی قرون الخالیہ ہے[4]۔ فلک المعالی امیر منوچہر بن قابوس (۴۰۳ھ تا ۴۲۰ھ / ۱۰۱۲ تا ۱۰۲۹) کو شعر و سخن سے خاص شغف تھا اور منوچہری دامغانی نے اسی کے دربار میں تربیت حاصل کی تھی[5]۔

آل مامون کے محاسن و مآثر سے ادب و تاریخ کی کتابیں مالامال ہیں۔ یہ خاندان خوارزم میں حکمراں تھا اکثر مورخین نے اس کا نام خوارزم شاہیان قدیم لکھا ہے۔ علی بن مامون بن محمد خوارزم شاہ کے زمانہ میں بوعلی سینا خوارزم میں آیا تھا۔ اور بادشاہ نے اس کی نہایت قدردانی کی تھی۔ ابوالحسین السہیلی جو مشہور فقیہ و ادیب ہے، اس کا اور اس کے بھائی ابوالعباس مامون بن خوارزم شاہ کا وزیر تھا۔ ابوالعباس اس خاندان میں سب سے زیادہ علم دوست اور سخن پرور بادشاہ ہوا ہے۔ ابوالخیر خمار۔ ابوریحان البیرونی۔ بوعلی سینا وغیرہ (جن کا شمار اسلام کے حکمائے اولین میں ہوتا ہے، یہ سب اس کے دربار میں جمع تھے[6]) اس کے نام پر بہت سی

---

[1] آثار الباقیہ [2] عتبی ترجمہ اردو [3] دولت شاہ صفحہ ۱۰ [4] براؤن جلد ۱ [5] دولت شاہ صفحہ [6] چہار مقالہ

کتابیں لکھی گئی ہیں۔ امام ابو المنصور ثعلبی نے بھی ایک کتاب الظرائف واللطائف کو اس کے نام سے نامزد کیا ہے۔[1]

سجستان و نیمروز میں سلطان محمود کے وقت خلف بانو بن احمد کی حکومت تھی اس کا سلسلہ سلاطین آل صفار سے ملتا ہے۔ خلف بانو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا علم دوست بادشاہ ہوا ہے۔ اُس کی قدر دانی سے اطراف واکناف کے اہل کمال دربار سجستان میں جمع ہو گئے تھے۔ شعرائے عرب کی کثیر جماعت اس کے دربار میں موجود تھی۔ مشہور ادیب بدیع الزماں ہمدانی اس کا ندیم خاص تھا۔ ابو الفتح بستی نے اس کی مدح میں تین شعر موزوں کئے تو صلہ میں تین سو دینار سُرخ عطا کئے تھے۔ اس عہد کے بڑے بڑے علماء کو جمع کر کے اُس نے قرآن مجید کی ایک ایسی تفسیر لکھوائی تھی کہ اُس میں صرف و نحو حدیث فقہ کلام کے جمیع مسائل درج تھے۔ اس کی تالیف میں بیس ہزار دینار سرخ کا صرفہ ہوا تھا۔ مورخ عتبی نے نیشاپور کے کتب خانہ صابونی میں اس تفسیر کا ایک نسخہ بچشم خود دیکھا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ یہ کتاب اس قدر کبیر الحجم ہے کہ ایک کاتب تمام عمر اگر اس کو لکھتا رہے تب بھی تمام کتاب کا نقل ہونا محال ہے۔[2] ابو الشرف ناصح نے یمینی کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ یہ تفسیر ۵۴۶ھ تک نیشاپور میں تھی۔ اس کے بعد اصفہان میں منتقل ہو گئی اور وہاں آل خجند کے کتب خانہ میں محفوظ تھی۔ اور بڑی تقطیع کی ایک سو جلدیں تھیں۔[3]

اسلام کا نامور حکیم شیخ الرئیس بوعلی سینا (ولادت ۳۷۳ھ/۹۸۳ وفات ۴۲۸ھ/۱۰۳۶) اسی زمانہ میں پیدا ہوا اور اسی سرزمین میں عمر بسر کی۔ تحصیل علم سے فراغت پانے کے بعد بخارا میں آیا۔ اور ایک مدت تک نوح بن منصور کے دربار میں رہا۔ اسی زمانہ میں امیر ابو الحسن العروضی کی فرمایش سے کتاب المجموع تصنیف کی جس میں ریاضیات کے سوا فلسفہ کے جملہ علوم مذکور ہیں۔ اس کے بعد نوح بن منصور کے ایما سے پانچ جلدوں میں طبی اصطلاحات کو جمع کیا اور اس کا نام لغات سدیدیہ رکھا۔ منصور کی وفات کے بعد بخارا سے نکل کر خوارزم میں آیا اور کچھ عرصہ تک وزیر ابو الحسن السہیلی کے یہاں مقیم رہا۔ اس زمانہ میں علم منطق اور علم کیمیا میں دو کتابیں لکھیں اور اُن کو وزیر ابو الحسن کے نام سے موسوم کیا۔ امیر قابوس کے زمانہ میں خوارزم سے طبرستان میں آیا۔ قابوس نے اس کی خوب قدر و منزلت کی۔ اسی زمانہ میں اُس نے اپنی مشہور تصنیف کتاب الشفاء کو

---

[1] بروکلمن جلد ا صفحہ ۲۸۶ ۔ [2] عتبی ترجمہ اردو صفحہ ۹۲ ۔ [3] روضۃ الصفا جلد ۴ صفحہ ۱۰

اٹھارہ مہینہ میں تصنیف کیا - علاءالدولہ قابوس کا بھائی تھا - اس کی فرمایش سے فارسی میں ایک کتاب لکھی جو حکمت علائیہ کے نام سے مشہور ہے - اس میں فلسفہ کے جملہ علوم درج ہیں - قابوس کی وفات کے بعد شیخ ہمدان میں چلا آیا اور آل بویہ کی سرپرستی میں زندگی کا بقیہ حصّہ گذار دیا -

حاصل کلام یہ ہے کہ اُس زمانہ میں بادشاہ بادشاہزادے ، وزیر امیر سب صاحبِ فضل وکمال تھے اور وسطِ ایشیا کے ہر گوشہ میں علمی مذاق پھیلا ہوا تھا - حکومت آل سامان کے ختم ہو جانے سے سلطان محمود کی حکومت خراسان میں پھیل گئی سنہ ۴۰۲ھ/۱۰۱۲ء میں سجستان و نیمروز سنہ ۴۰۵ھ/۱۰۱۴ء میں جوزجان سنہ ۴۰۷ھ/۱۰۱۶ء میں خوارزم فتح ہوئے اور یہاں کی حکومتیں تباہ ہوگئیں - آل وشمگیر آل سلجوق و آل بویہ نے اطاعت قبول کرلی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان محمود کی سلطنت مشرق میں سب سے بڑی تسلیم کرلی گئی - اور ان برباد شدہ حکومتوں میں جو ارباب کمال جمع تھے وہ سب آل سبکتگین کے سایۂ عاطفت میں چلے آئے -

موّرخین نے آل سبکتگین کو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا علم دوست اور مربی علم وفن تسلیم کیا ہے - اس خاندان کو نشرِ علوم کا خاص خیال تھا - اُس کے عہد کے تمام مشاہیرِ فضل وکمال اس خاندان کے فیض کرم سے بہرہ ور ہو رہے تھے - اشاعت تعلیم کے لئے اس خاندان نے اپنے قلمرو میں سینکڑوں مدارس قایم کئے تھے - اور اس بارے میں ایک قابل امتیاز خصوصیت یہ ہے کہ امیر نصر بن سبکتگین نے دنیائے اسلام میں سب سے پہلے مدرسہ تعمیر کرایا تھا - اس کے بعد مصر اور بغداد میں مدارس کی بنیاد پڑی ہے -

آل سبکتگین کی سلطنت میں تین شہر صدر مقام تھے - غزنیں دارالحکومت تھا - نیشاپور میں خراسان کا سپہ سالار اور لاہور میں ہندوستان کے گورنر رہا کرتے تھے - یہ تینوں مقام اپنے زمانہ عُروج میں علم وفن کے مرکز تھے - نیشاپور کی علمی حالت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ دنیائے اسلام میں سب سے پہلے نیشاپور میں مدرسہ قایم ہوا ہے - غزنویوں کے زمانہ میں نیشاپور میں کئی مدرسے جاری تھے - نصر بن سبکتگین کا مدرسہ سعیدیہ ، امام ابن فورک کا مدرسہ نصریہ ، امام ابوالقاسم کا مدرسہ بیہقیہ وغیرہ - یہ مدرسے اس قدر وسیع پیمانہ پر قایم تھے کہ مورخین نے ان کو " امہات المدارس " کا لقب دیا ہے[1] - طغرل بیگ سلجوقی نے جب نیشاپور فتح کیا تو اُس نے بھی

---

[1] الخطط والآثار جلد ۲ صفحہ ۲۶۳

یہاں ایک مدرسہ تعمیر کرایا۔ حکیم ناصر خسرو نے اپنے سفرنامہ میں اس کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

"روز شنبہ یازدہم شوال سنہ سبع وثلثین واربعمائۃ وارد نیشاپور شدم۔ چہار شنبہ آخر ایں ماہ کسوف بود۔ وحاکم زمان طغرل بک محمد بود برادر چغری بک۔ بنائے مدرسہ فرمودہ بود بنزدیک بازار سراجان۔ وآں را عمارت می کردند۔"[۱]

آل سبکتگین کے عہد میں بڑے بڑے ارباب فضل وکمال لاہور میں آکر سکونت پذیر ہوگئے تھے۔ ابوالحسن علی بن عثمان الہجویری اور شیخ فرید الدین زنجانی جو مشاہیر مشایخ صوفیہ سے ہیں اسی زمانہ میں یہاں آئے اور اسی جگہ انتقال فرمایا۔ ان کے مزارات آج تک زیارت گاہ خاص وعام ہیں[۲]۔ مسعود سعد سلمان اور ابوالفرج رونی کے خاندان عرصہ سے لاہور میں آباد تھے۔ اور اسی شہر کے اطراف میں ان کی پیدایش واقع ہوئی تھی۔ ابوعبداللہ النکتی اور حمید الدین مسعود بن سعد شالی کوب لاہور کے باشندے اور فارسی زبان کے بلند پایہ شاعر تھے۔ پہلا سلطان مسعود کے زمانہ میں اور دوسرا سلطان شہاب الدین غوری کے عہد میں گزرا ہے[۳]۔ مشہور ادیب ابونصر فارسی لاہور میں مدتوں مقیم رہا ہے۔ زمانہ قیام میں اس نے ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ جو صدیوں قایم رہا اور اس میں تعلیم جاری تھی[۴]۔

آل سبکتگین سے پہلے غزنین کی معمولی حالت تھی۔ سلطان محمود کے زمانہ میں اس کو وسعت ورونق حاصل ہوئی ہے۔ سلطان جب قنوج ومتھرا کی مہم سے واپس آیا تو یہاں ایک عالی شان مسجد تعمیر کرائی اور اس میں ایک مدرسہ بھی قایم کیا۔ اعیان وامرا نے بھی سلطان کی پیروی کی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں غزنین عالیشان عمارتوں اور علمی یادگاروں سے معمور ہوگیا۔ اور ایشیا کے عظیم الشان شہروں میں اس کا شمار ہونے لگا[۵]۔ ابن رازی کا بیان ہے کہ سلطان محمود کے زمانہ میں غزنین کی آبادی کئی فرسخ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس میں بارہ ہزار صرف مساجد ومدارس واقع تھے۔ رفاہ عام کی دیگر عمارات رباطات وخانقاہات وغیرہ کی تعداد ان کے علاوہ تھی[۶]۔ غزنین کی یہ رونق بہت کم مدت قایم رہی۔ بہرام شاہ کے زمانہ میں علاء الدین غوری نے

---

[۱] سفرنامہ حکیم ناصر خسرو صفحہ ۳ [۲] مآثر الکرام صفحہ ۶ [۳] عوفی جلد ۲ صفحہ ۷، ۵ و ۱۱۴

[۴] عوفی جلد ۱ [۵] تاریخ فرشتہ جلد ۱ [۶] ہفت اقلیم

جب اُسے فتح کیا تو جلا کر خاک کر دیا اور اسی وجہ سے اس کا لقب "جہاں سوز" مشہور ہو گیا[1]۔ اس کے بعد غزنین کو پھر کبھی عروج حاصل نہیں ہوا۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے اسے ساتویں صدی میں دیکھا تھا۔ اُس کا بیان ہے کہ صرف ایک گوشہ میں آبادی ہی باقی ویرانہ ہے[2]۔ اِس شہر کی گزشتہ شان و شوکت کو یاد دلانے کے لئے آل سبکتگین کے آثار عتیقہ سے اس وقت صرف دو مینار باقی رہ گئے ہیں جن کو سلطان محمود اور اس کے بیٹے مسعود نے اپنی فتوحات کی یادگار میں تعمیر کرایا تھا[3]۔

آل سبکتگین کے زمانہ میں دیگر علوم و فنون کی بہ نسبت فارسی شاعری کو خوب ترقی ہوئی ہے۔ اُس کی تفصیل کو بیان کرنے سے پیشتر فارسی شاعری کا مختصر حال تحریر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اِس سے یہ فائدہ ہوگا کہ آئندہ اوراق میں فارسی شاعری اور شعرا کے جو حالات مذکور ہوں گے اُن پر اُس تمہید سے نہ صرف روشنی پڑے گی بلکہ فارسی شاعری کا تاریخی سلسلہ مربوط ہو جائے گا۔

عربوں نے جب ایران فتح کیا تو فاتحین کا اثر مفتوح اقوام میں مقناطیسی قوت کی طرح سرایت کر گیا۔ عربی مذہب اور تمدن تمام ملک میں برق و باد کی مانند پھیل گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی زبان اور اُس کے علوم و فنون ماند پڑ گئے۔ اور اُس کی عوض عربی زبان اور اسلامی علوم کی تمام ملک میں اشاعت ہو گئی۔ قریباً دو سال تک یہی کیفیت رہی۔ خلفائے بنی عباس کو جب زوال شروع ہوا اور ایرانی حکام کی بہت سی چھوٹی چھوٹی حکومتیں قایم ہو گئیں۔ تو اُن کی توجہ سے فارسی زبان میں از سر نو حس و حرکت پیدا ہوئی اور ان خاندانوں کے سایۂ عاطفت میں اُس کو نشو و نما ہونے لگا۔

فارسی شاعری جو اسلام سے پہلے ایران میں رائج تھی عربی فتوحات کے زمانہ میں اس طرح مٹ گئی کہ اُس وقت نہ تو اِس عہد کے کسی شاعر کا نام ملتا ہے اور نہ دو چار بیت دستیاب ہوتے ہیں۔ موجودہ شاعری کی ابتدا تیسری صدی میں ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کہ مامون الرشید جب خراسان میں مقیم تھا تو عباس مروزی نے اُس کی مدح میں ایک فارسی قصیدہ لکھا جس کے صلہ میں مامون نے اُسے ہزار دینار سرخ عطا کئے۔ اور ہزار درہم سالانہ اُس کی تنخواہ مقرر کر دی۔ محمد عوفی کا بیان ہے کہ عہد اسلام میں یہ سب سے پہلا کلام ہے جو فارسی میں موزوں ہوا۔

---

[1] چہار مقالہ [2] ابن بطوطہ [3] رسالہ ایشاٹک سوسائٹی بنگال جلد ۱۲ حصۂ اوّل صفحہ ۷۰ و ۷۷

اُس کے بعد تھوڑی مدت تک کسی نے بھی فارسی شاعری کی طرف توجہ نہیں کی یہاں تک کہ طاہر ذو الیمین نے اپنی خود مختار حکومت خراسان میں قایم کرلی۔ یہ خاندان اور اُس کے جانشین آل صفار ایسی سرزمین میں حکمراں تھے جہاں کی زبان فارسی تھی۔ اور اسی بنیاد پر ان کے درباروں میں بہت سے فارسی شعراء پیدا ہو گئے۔ اُن میں حنظلہ، فیروز مشرقی، محمود وراق اور بنجیک چنگزن بہت مشہور ہیں۔

حنظلہ بادغیس کا باشندہ تھا ۲۱۹ھ میں فوت ہوا ہی[۱]۔ فیروز کے آباؤ اجداد دیلم کے رہنے والے تھے[۲]۔ محمود وراق محمد بن طاہر کے زمانہ میں گزرا ہی[۳]۔ بنجیک چنگزن جس کا نام ابوالحسن علی بن محمد ترمذی ہی ملوک صفاریہ کا درباری شاعر تھا۔ احمد صفاری کی مدح میں اُس نے جو قصائد لکھے ہیں وہ مجمع الفصحا میں درج ہیں۔ صفاریوں کی تباہی کے بعد اُمرائے چغانیاں کے دربار میں توسل پیدا کیا اور مدت تک طاہر بن حسین چغانی کا ندیم خاص رہا ہی[۴]۔

اِس وقت تک شاعری کی حالت طفل شیرخوار کے مانند تھی۔ جب سامانیوں کا زمانہ آیا تو اُس نے عہد شباب میں قدم رکھا۔ ملوک سامانیہ نسلاً ایرانی تھے بہرام چوبین سے اُن کا سلسلہ ملتا تھا۔ فارسی اُن کی مادری زبان تھی حکومت جب اُن کے ہاتھ میں آئی تو اُنھوں نے فارسی کو ترقی دینے میں شاہانہ فیاضی سے کام لیا۔ بڑے بڑے شعرا دربار میں جمع کئے اور اُن کی بیش قرار تنخواہیں مقرر کیں۔ ہزارہا روپیہ صرف کرکے فارسی میں کتابیں لکھوائیں جس کا مختصر تذکرہ اوپر گزر چکا ہی۔ سامانیوں کے دربار میں اگرچہ سینکڑوں شعرا موجود تھے۔ لیکن ان میں جن کو خصوصیت حاصل تھی اُ ن کے نام نظامی عروضی سمرقندی نے حسب ذیل لکھے ہیں[۵]:

ابو العباس۔ ابوالمثل۔ ابوالاسحاق۔ ابوشکور بلخی۔ جوئباری۔ ابوالحسن۔ خبازی نیشاپوری۔ شہید بلخی۔ ابوالمؤید۔ ابوعبداللہ فرالادی۔ رودکی۔ دقیقی۔ رابعہ فرداری۔ ابو ذر۔ معمر جرجانی۔ ابوالمظفر نصر بن محمد نیشاپوری۔ عمارہ مروزی۔ طخاری۔ مرادی۔

اِن میں سے اکثر شعرا کے حالات اور کلام دونوں مفقود ہوگئے ہیں۔ اس سلسلہ میں شہید اور مرادی قدیم شاعر ہیں۔ رودکی نے اِن کا مرثیہ بھی لکھا ہی جو مجمع الفصحا میں منقول ہی۔ ابوشکور بلخی اور خبازی نیشاپوری

---

[۱] مجمع الفصحا ج ۱ [۲] مجمع الفصحا [۳] مجمع الفصحا [۴] مجمع الفصحا [۵] چہار مقالہ

دونوں معاصر ہیں۔ نوح بن نصر بن احمد سامانی (۳۳۱ھ ۹۴۲ء – ۳۴۳ھ ۹۵۴ء) کے زمانہ میں گزرے ہیں پہلے کا ۳۳۶ھ ۹۴۶ء میں اور دوسرے کا ۳۴۲ھ ۹۵۳ء میں انتقال ہوا ہی[1]۔ ابوالمؤید بلخ کا باشندہ تھا۔ اِس نے حکایات یوسف زلیخا کو سب سے پہلے نظم کیا ہی[2]۔ سوائے اِس کے اُس نے ملوک عجم کی ایک تاریخ بھی لکھی ہے جس کا نام شاہنامہ ہی اور اُس میں ایران قدیم کے حالات کمال تفصیل کے ساتھ تحریر کئے ہیں۔ عنصر المعالی کیکاؤس بن اسکندر بن وشمگیر نے قابوس نامہ میں اِس کا ذکر کیا ہی[3]۔

سامانی شعراء میں رودکی اور دقیقی کو نہایت شہرت ہی۔ اور حقیقت یہ ہی کہ انھیں کی وجہ سے سامانیوں کا نام زندہ جاوید ہو گیا ہے۔ ابوعبداللہ محمد رودکی نخشب کے قریہ رودرک کا باشندہ اور نصر بن احمد سامانی کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ تمام تذکرہ نویس اُس کو فارسی شاعری کا بانی اوّل اور شعراء کا ابو الآباء کہتے ہیں سب سے پہلے اُس نے اپنے دیوان کو مرتب و مدون کیا ہی اُس کا دیوان ایران میں چھپ گیا ہی اور اُس میں تمام اصناف سخن مثلاً قصیدہ غزل قطعہ رُباعی مرثیہ وغیرہ موجود ہیں۔ نصر بن احمد کے فرمایش سے اُس نے کلیلہ دمنہ کی حکایات بھی نظم کی تھیں۔ لیکن مدت ہوئی کہ یہ کتاب زمانہ کے ناقدر ہاتھوں سے برباد ہو گئی ہے۔ اور اُس وقت اِس کے صرف دس بارہ شعر ملتے ہیں جن کو حکیم اسدی طوسی نے اپنی لغات میں بطور شواہد کے نقل کیا ہی۔ ۳۰۶ھ ۹۱۸ء میں اُس نے وفات پائی[4]۔

ابو منصور محمد بن احمد الدقیقی سمرقند کا باشندہ ہے۔ مدت تک اُمرائے چغانیاں کے دربار میں رہا۔ امیر نوح بن منصور سامانی (۳۶۶ھ ۹۷۶ء – ۳۸۷ھ ۹۹۷ء) جب تخت نشین ہوا تو دقیقی چغانیاں سے بخارا میں آیا۔ بادشاہ نے جب اُس کے کمالات کو دیکھا تو دربار کا ملک الشعراء مقرر کیا اور تاریخ ملوک عجم کو نظم کرنے کی خدمت اُس کے سُپرد کی اِس واقعہ کے بعد دقیقی بہت کم مدت زندہ رہا۔ ۳۹۱ھ میں اُس کے ایک غلام نے اُس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا[5]۔

سامانیوں کے بعد غزنویوں کا دور آتا ہی۔ اِن کے عہد میں فارسی شاعری انتہائے شباب پر پہونچ گئی

---

[1] مجمع الفصحا جلد ا　[2] مثنوی یوسف زلیخا فردوسی طبع یورپ　[3] قابوس نامہ طبع طہران

[4] تذکرہ دولت شاہ　[5] تذکرۂ دولت شاہ

تھی۔ سینکڑوں شاعران کے فیضان کرم سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ اور سرپرستی اور فیاضی کے بدولت شاعری کو بے انتہا وسعت حاصل ہو گئی۔ اور اس قدر ادبی ذخیرہ فراہم ہوا کہ اس کی تفصیل بیان کی جائے تو اس کے لئے ایک طومار کی ضرورت ہے مجمع الفصحا میں لکھا ہے[۵]

"چوں نوبت دولت ملوک آل ناصر غزنویہ بلند آوازہ آمد سلطان محمد بن ناصر الدین سبکتگین در تربیت شعرا کوشیدہ و بہ تکمیل مستعدان جدجہد کرد۔ چناں کہ ثروت حکیم ابوالقاسم عنصری از دولت عبداللہ الرودکی در گزشت و چہار صد تن شاعر ماہر قادر در آں والا دولت تربیت یافتند۔ و وے ملک الشعرا بالاستقلال و استحقاق ہمہ بود۔ و پس از سلطان محمود نیز فرزندان وے جمعی را مربی و مشوق بودند"

نظامی عروضی سمرقندی نے شعراء آل سبکتگین کی یہ تفصیل بیان کی ہے۔ عنصری، عسجدی۔ فرخی۔ بہرامی زینتی۔ بزرجمہر قائنی۔ مظفری۔ منشوری۔ منوچہری۔ مسعودی۔ قصارامی۔ ابوحنیفہ اسکاف۔ راشدی۔ ابوالفرج رونی۔ محمد ناصر۔ مسعود سعد سلمان۔ شاہ ابو رجا۔ احمد خلف۔ عثمان مختاری۔ مجدود السنائی۔ ان کے حالات ہم آیندہ اوراق میں موقع بموقع بیان کریں گے۔ اس مقام پر مختصر الفاظ میں اُن قابل لحاظ ممیزات کو بیان کرتے ہیں جو آل سبکتگین کے عہد میں فارسی شاعری میں پیدا ہوئے تھے۔

(۱) اِس وقت تک فارسی شاعری کو صرف مضمون اور فن کی حیثیت سے ترقی ہوئی تھی۔ لیکن زبان شائی نہ تھی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ سامانی اور غزنوی خاندانوں کے مرکز حکومت ایران سے باہر تھے۔ اور اُن کے دربار میں جو شعراء تھے۔ وہ بھی عموماً انھیں صوبجات کے رہنے والے تھے۔ مثلاً رودکی نخشب کا اور بہرامی سرخس کا باشندہ تھا۔ دقیقی اور عسجدی مرو کے رہنے والے تھے۔ عنصری اور فرخی کے وطن بلخ و سجستان تھے ابوالفرج اور مسعود سعد سلمان کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی تھی۔ مختاری اور سنائی کو غزنین میں نشوونما حاصل ہوا تھا۔ آل سلجوق نے جب اِس ملک پر قبضہ کیا اور اُن کی سرپرستی میں ایران میں شاعری پھیلی تو اُس عہد سے زبان میں لطافت و شیرینی پیدا ہوئی اور محاورات و مصطلحات جو خاص اہل زبان کا خاصہ ہیں شاعری میں

---

[۵] مجمع الفصحا جلد ا

داخل ہوئے۔

(۲) اِس وقت تک شاعری کے صرف دو صنف قصیدہ و مثنوی کو رواج عام حاصل ہوا تھا۔ قصاید مداحی سے مخصوص تھے۔ مثنوی کو شعراء نے قصص و حکایات تک محدود کر دیا تھا۔ رودکی۔ ابوالموید بلخی۔ اور عمعق بخاری سے مثنوی گوئی کی ابتداء ہوئی ہے۔ رودکی نے کلیلہ دمنہ ابوالموئید اور عمعق نے حکایات یوسف زلیخا کو نظم کیا ہے۔[۱]

شعراء آل ناصر کی جدت پسند طبائع نے ان دونوں اصناف میں بہت سے جدید مضامین ادا کئے ہیں جس کی وجہ سے شاعری میں بے حد وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً شاعری کی سب سے بڑی قسم رزمیہ ہے۔ فردوسی نے شاہنامہ لکھکر رزمیہ نظم کو اس قدر مکمل کر دیا کہ اُس پر آج تک ایک حرف کا اضافہ نہ ہوسکا۔ اسی عہد میں حکیم سنائی نے حدیقہ اور اُسی قبیل کی دوسری مثنویوں کو لکھکر اخلاقی اور صوفیانہ شاعری کا سنگ بنیاد رکھا ہے جس کی تکمیل زمانہ مابعد میں شیخ عطار اور عارف روم نے کی ہے اکثر شعراء نے قصاید میں اخلاقی اور تاریخی مضامین ادا کئے ہیں۔ حکیم عنصری نے ایک طولانی قصیدہ میں سلطان محمود کے تمام فتوحات کو نظم کیا اور اُس کا نام تاج الفتوح رکھا ہے۔[۲] حکیم سنائی کا قصیدہ رموز الانبیا اور کنوز الاولیا طبقہ صوفیہ میں نہایت مشہور ہے اس میں سلوک کے معارف و حقایق اور لطائف و دقایق مذکور ہیں مولانا جامی نے اُس کے ابیات کی تعداد ایک سو اسّی بیان کی ہے۔[۳]

(۳) اِس وقت تک فارسی شاعری کے قواعد و ضوابط کی تدوین نہیں ہوئی تھی۔ سب سے پہلے غزنویوں کے عہد میں اُستادانِ فن نے اُن کو مرتب و مدوّن کیا ہے حکیم ہرامی سرخسی نے فن شعر کے متعلق کئی کتابیں لکھی ہیں[۴] غایۃ العروضین اور کنز القافیہ میں علم عروض و قافیہ کے اصول و فروع جمع کئے ہیں۔[۵] خجستہ نامہ میں نقد شعر اور اُس کے اصناف و انواع کو بیان کیا ہے[۶]۔ حکیم فرخی نے علم بیان و معانی میں ایک ضخیم کتاب لکھی ہے جس کا نام

---

[۱] فردوسی نے اپنی مثنوی یوسف زلیخا میں اُن دونوں مثنویوں کا ذکر کیا ہے مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب ہفت آسمان جس میں مثنوی گو شعراء کے تاریخی حالات مذکور ہیں [۲] دولت شاہ [۳] نفحات الانس صفحہ ۲۹۰ [۴] ہرامی کی تصنیفات اِس وقت ناپید ہیں ساتویں صدی تک موجود تھیں شمس الدین قیسی نے اِن کو دیکھا ہے۔ اور اپنی کتاب المعجم فی معائر اشعار العجم میں ان سے مضامین اقتباس کئے ہیں [۵] چہار مقالہ [۶] عوفی جلد ۱

ترجمان البلاغت ہے۔ یہ کتابیں اُسی زمانہ میں شاعری کا نصاب مقرر ہو گئی تھیں۔ جو شخص شاعر ہونا چاہتا تھا اُسے اِن کتابوں کے ذریعہ شاعری کی تعلیم حاصل کرنا لازمی امر تھا۔ نظامی عروضی سمرقندی لکھتا ہے:

"اما شاعر بدیں درجہ نرسد الا کہ در عنفوان شباب در روزگار جوانی بست ہزار اشعار متقدمین یاد گیرد وہزار کلمہ از آثار متاخرین در پیش چشم کند و پیوستہ دواوین استادان خواندہ۔ وعروضی بخواند و گرد تصانیف اُستاد ابوالحسن بہرامی سرخسی گردد۔ و مانند غایۃ العروضیین وکنز القافیہ ونقد معانی ونقد الفاظ وسرقات وتراجم وانواع ایں علوم بخواند۔"

بابِ دوم

امیر ناصر الدین سبکتگین اور اُس کے فرزند

امیر سبکتگین کا مذاقِ علمی اور اس کے عہد کے اربابِ کمال ابوالفتح بستی، حکیم کسائی مروزی، امیر سبکتگین کے لڑکے، امیر اسمٰعیل، امیر یوسف، امیر نصر، مدرسہ سعیدیہ، دنیائے اسلام کا پہلا مدرسہ، امام ابوالنصور ثعلبی، کتاب الغرر فی سیر الملوک۔

امیر سبکتگین شجاع عادل عابد و زاہد اور ذی علم بادشاہ ہوا ہے۔ اشاعت علم سے اِس کو خاص رغبت تھی۔ اپنے لڑکوں کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلوائی تھی۔ اور انھیں ترویج علم اور اربابِ فضل وکمال کی قدر دانی پر ہمیشہ آمادہ کیا کرتا تھا۔ مؤرخ فرشتہ نے[1] غیاث خوند میر کی کتاب مآثر الملوک سے حسب ذیل واقعہ نقل کیا ہے جس سے اُس کا مذاق علمی ظاہر ہوتا ہے۔

"سلطان محمود نے اپنے ایام جوانی میں کہ جس وقت اپنے پدر والا گوہر کے ظلِ عنایت میں تھا ایک باغ جنت نشان نہایت زیب وزینت کے ساتھ تیار کرایا۔ جب وہ ہر طرح سے آراستہ ہو گیا تو اپنے پدر بزرگوار اور ارکان دولت کو اُس کے اندر بلوایا۔ اُس وقت امیر ناصر الدین سبکتگین

---

[1] دولت شاہ   [2] چہار مقالہ

نے فرمایا کہ اے فرزند یہ باغ و مکان تو حقیقت میں بہت مطبوع و مقبول ہیں لیکن ہماری ملازمین
سے اکثر ایسے بنا سکتے ہیں سلاطین کو شایان ہے کہ ایسی عمارت اور ایسا باغ بنائیں کہ اور لوگ
مثل اُس کے بنانے سے عاجز آئیں سلطان محمود نے آداب بجا لا کر عرض کیا کہ وہ کیسا باغ اور
کیسی عمارت ہے۔ فرمایا کہ اہلِ علم و فضل کے دلوں کی تعمیر اور اُن کے دلوں کی زمین میں نہال
احسان لگانا اور ثمرۂ سعادت حاصل کرنا اور تا قیامت ذکر جمیل صفحہ روزگار پر چھوڑ جانا۔"[1]

امیر سبکتگین کے دربار میں اکثر ارباب علم[2] جمع تھے۔ اور اُس نے سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر اُنہیں
مامور کیا تھا۔ الشیخ الجلیل مجدالدین ابوالفتح بستی[3] دربار کا میر منشی تھا۔ سبکتگین کی وفات کے بعد سلطان محمود کے
زمانہ میں بھی اِس نے دو سال تک بعض مہام سلطنت انجام دیئے۔ یہ شخص علوم معقول کا زبردست عالم ہُوا
ہے۔ عربی فارسی میں اُس کے دو دیوان ہیں جو حقایق اور معارف سے مالا مال ہیں۔ ایک مطول قصیدہ میں
زہد و تقویٰ اور ترک دُنیا کے مضامین کو بیان کیا ہے۔ یہ قصیدہ عرب و عجم میں نہایت مقبول ہُوا ہے۔ اور
ملک الشعرا بدرالدین جاجرمی نے اِس کا نظم فارسی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ مطلع یہ ہے ؎

زیادۃ المرء فی دنیاہ نقصان درحجہ غیر محض الخیر خسران

ابوالفتح بستی نے سنہ ۴۳۰ھ / ۱۰۳۸ء میں انتقال کیا۔ ملک عماد مروزی نے اُس کی تاریخ وفات حسب ذیل
لکھی ہے ؎

شیخ عالی قدر مجدالدین ابوالفتح آنکہ بوُد مقتدائے اہلِ فضل و سرورِ اہلِ کلام
چارصد با سی چو از تاریخِ ہجرت درگذشت در مہِ شوال رحلت کرد از دار السّلام

حکیم ابوالحسن الکسائی[4] مرو کا باشندہ تھا۔ آلِ سامان کے چوتھے بادشاہ امیر نوح بن نصر کے زمانہ میں
سنہ ۳۴۱ھ / ۹۵۲ء میں پیدا ہوا۔ عوفی نے لکھا ہے کہ پچپن سال کی عمر میں اِس نے وفات پائی اِس اعتبار سے سنہ ۳۹۶ھ / ۱۰۰۵ء میں

---

[1] ترجمہ اُردو تاریخ فرشتہ مسمی تحفۃ الملوک طبع بجنور صفحہ ۱۱ فارسی ایڈیشن لکھنؤ جلد ۱ صفحہ ۲۱ [2] یتیمۃ الدہر صفحہ ۲۰۴ و ۲۳۱ عوفی
جلد ۱ صفحہ ۶۴ دولت شاہ صفحہ ۲۶ و ۲۷ و ۹۱ ۲ مجمع الفصحا جلد ۱ صفحہ ۷۰ برون جلد ۲ صفحہ ۹۹ [3] عوفی جلد ۲ صفحہ ۲۳ و ۳۹
چہار مقالہ صفحہ ۲۰ لغات اسدی صفحہ ۲۷ مجمع الفصحا جلد ۱ صفحہ ۴۸۲

اُس کا انتقال ہوا ہی۔ عوفی نے اِس کا ایک مطول قصیدہ نقل کیا ہی جس کے اشعار سے ثابت ہوتا ہی کہ یہ قصیدہ ۳۹۰ھ میں تصنیف ہوا ہی۔ پس یہ بات یقینی ہی کہ ۳۹۱ھ میں کسائی بقید حیات موجود تھا کسائی کا زمانہ شباب سبکتگین کے عہد میں گذرا ہے۔ اور سلطان محمود کا ابتدائی زمانہ بھی اپنی اخیر عمر میں دیکھا ہے۔ امیر سبکتگین کی مدح میں متعدد قصائد لکھے ہیں حکیم ناصر خسرو اس کا معاصر تھا۔ دونوں میں شاعرانہ نوک جھوک ہوا کرتی تھی۔ اس بنا پر ناصر خسرو نے اُس کے کئی قصائد کا جواب بھی لکھا ہی۔

امیر سبکتگین کے چار لڑکے تھے۔ اسمٰعیل، یوسف، نصر، محمود اور یہ سب عالم فاضل اور ہنر پرور تھے۔ مؤرخ ابن اثیر نے اسمٰعیل کی نسبت لکھا ہی کہ نیک اور فیاض آدمی تھا نظم و نثر میں اُس کو اعلیٰ درجہ کی لیاقت حاصل تھی۔ جمعہ کی نماز کے لئے جب جامع مسجد میں آتا تو اکثر اوقات اپنے تصنیف کئے ہوئے خطبے پڑھا کرتا تھا[1]۔ ابو المظفر یوسف بن سبکتگین کو فارسی شعر و سخن سے غایت دلچسپی تھی۔ لبیبی اولیبی اس کا ندیم خاص تھا[2]۔ فرخی عنصری اور دیگر شعرا دربار جب اِس کی مدح میں قصائد لکھتے تو اُنھیں صلہ بیکراں دیا کرتا تھا[3]۔

ابو المظفر نصر۔ امیر سبکتگین کا منجھلا لڑکا تھا۔ سلطان محمود نے ۳۸۹ھ میں جب فایق کو شکست دے کر خراسان پر قبضہ کیا تو نصر کو وہاں کا سپہ سالار مقرر کیا[4]۔ اس تقریب سے نصر قریباً چھ سال تک نیشاپور میں مقیم رہا ۳۹۵ھ میں جب ابراہیم منتصر بن نوح سامانی کا خراسان میں استیصال ہوگیا اور ملک کے تمام فتنہ و فساد تمام ہوگئے۔ تو محمود نے نصر کو غزنین میں بلا لیا[5]۔ نصر اِس واقع کے بعد قریباً پندرہ سال تک زندہ رہا۔ ۴۱۰ھ یا ۴۱۱ھ بمقام غزنین اس کا انتقال ہوا[6]۔ نصر کو علوم عربیہ میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اور اُن کے احیا اور نشہ و ترویج میں بدرجۂ غایت حصہ لیا کرتا تھا۔ سپہ سالار کے زمانہ میں نیشاپور میں اس نے ایک عالیشان مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ جس کا نام مدرسہ سعیدیہ تھا۔ اِس میں بڑے بڑے محدثین و فقہا درس و تدریس کے لئے مقرر

---

۱ ابن اثیر جلد ۹ صفحہ ۹۲ ۲ عوفی جلد ۱ صفحہ ۴۰ ۳ مجمع الفصحا جلد ۱ صفحہ ۴۳۹ ۴ عتبی صفحہ ۷۰ و ۹۸

۵ نصر کی تاریخ وفات کسی مؤرخ نے بیان نہیں کی ہی۔ ۶ عتبی نے اپنی کتاب کے خاتمہ میں بلا قید تاریخ اِس کے انتقال کا تذکرہ کیا ہی یہ کتاب ۴۱۱ھ کے اوائل میں اختتام کو پہونچی ہی اس لئے قوی گمان یہ ہوتا ہی کہ ۴۱۰ھ کے اخیر میں یا ۴۱۱ھ کے اوائل میں اس نے وفات پائی ہی

کئے تھے تعلیم مفت دی جاتی تھی۔ طلبا کی رہایش اور خور و نوش کا بھی انتظام تھا۔ اخراجات کے لئے متعدد دیہات و قصبات وقف کر رکھے تھے۔ مؤرخین نے اِس کو اسلام کے امہات المدارس میں شمار کیا ہے[۵]۔ اور اسلامی دُنیا میں یہ پہلا مدرسہ ہی اس کے بعد بغداد مصر اور دیگر بلادِ اسلام میں مدارس تعمیر ہوئے ہیں[۶]۔

امام ابو المنصور ثعلبی کی سکونت نیشاپور میں تھی۔ نصر اپنے زمانہ حکومت میں اُن کے ساتھ بے حد مراعات سے پیش آیا کرتا تھا۔ امام صاحب نے اُس کی فرمایش سے علم تاریخ میں ایک کتاب لکھی ہی جس کا نام کتاب الغرر فی سیر الملوک ہی۔ اِس میں ابتدائی تخلیق عالم و آدم سے لے کر سلطان محمود کے جلوس تک جمیع اقوام عالم کے حالات کمال شرح و بسط سے لکھے ہیں۔ یہ کتاب مضامین کے اعتبار سے حسب ذیل ابواب پر منقسم ہی۔

(۱) تاریخ انبیاء علیہ السلام	(۵) تاریخ ملوک الحمیر
(۲) تاریخ ملوک الفرس	(۶) تاریخ ملوک عرب الشام
(۳) تاریخ ملوک الفراعنہ	(۷) تاریخ ملوک عرب العراق
(۴) تاریخ ملوک بنی اسرائیل	(۸) تاریخ ملوک الروم والافرنج

---

[۵] تاریخ سلاطین غزنویہ و روضۃ الصفا صفحہ ۹۸ مقریزی جلد ۲ صفحہ ۳۶۳ سیوطی جلد ۲ صفحہ ۱۸۵ [۶] دنیائے اسلام میں سب سے پہلے کون سا مدرسہ قایم ہوا۔ اس عنوان پر اسلام کے ہر ادبی مؤرخ نے بحث کی ہی۔ عام خیال یہ ہی کہ اسلام میں سب سے پہلے خواجہ نظام الملک طوسی نے مدرسوں کی بنیاد ڈالی ہی مستشرقین یورپ بیان کرتے ہیں کہ اسلام کا پہلا مدرسہ ماموں نے اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں خراسان میں قایم کیا تھا۔ لیکن اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا ہے جرجی زیدان اور علامہ شبلی نے اس موضوع پر کس قدر تفصیل سے بحث کی ہی جو اُن کی تصنیفات میں مرقوم ہی تاریخ تمدن الاسلامی جلد ۳ صفحہ ۲۳۰) اور اسلامی مدارس مندرجۂ رسائل شبلی صفحہ ۳۶۵) حال میں مولوی عبد الرزاق کانپوری نے بھی نظام الملک طوسی کی سوانح عمری صفحہ (۶۴۰) میں مدرسہ نظامیہ کے حالات کو بیان کرتے ہوئے اس مسئلہ پر قلم اُٹھایا ہی۔ ان تینوں مُصنفین کا ماخذ ایک ہی اور یہ تمام مضامین ابن خلکان مقریزی اور سیوطی کی تصنیفات سے نقل کئے ہیں (وفیات الاعیان جلد ا صفحہ ۴۸۲۔ الخطط والآثار جلد ۲ صفحہ (۳۶۳) حسن المحاضرہ جلد ۲ صفحہ (۱۶۸) و صفحہ (۱۸۵) مولوی عبد الرزاق کا مضمون چوں کہ سب کے بعد لکھا گیا ہی۔ اِس لئے اِس میں زیادہ جامعیت ہی۔ اور اس میں قدامت و تاریخ تعمیر کے لحاظ سے مدارس کا سلسلہ قایم کیا ہی جس کا خلاصہ یہ ہی۔

(بقیہ برصفحہ آئندہ)

(۹) تاریخ ملوک الہند
(۱۰) تاریخ ملوک الترک
(۱۱) تاریخ ملوک الصین
(۱۲) سیرت جناب رسول اللہ صلعم
(۱۳) تاریخ خلفائے راشدین
(۱۴) تاریخ ملوک بنی امیہ
(۱۵) تاریخ خلفائے بنی عباس
(۱۶) اخبار امرائے برامکہ
(۱۷) تاریخ ملوک طاہریہ
(۱۸) تاریخ ملوک سنجریہ (آل صفار)
(۱۹) تاریخ ملوک سامانیہ
(۲۰) اخبار ملوک حمدانیہ
(۲۱) اخبار ملوک بویہ
(۲۲) اخبار امیر ناصر الدین سبکتگین

موسیو روئبنرگ (M. Roibeng) نے اس کتاب کے باب دوم کو جس میں قدیم شاہان ایران کے حالات ہیں ۱۹۴۱ء میں بمقام پیرس چھپوایا ہے اس کے ساتھ فرانسیسی ترجمہ بھی ہے جس کا عنوان یہ ہے:
"کامل کتاب نایاب ہے ہاں اس کا ایک نفیس نسخہ فرانس کے کتب خانہ ملّی میں محفوظ ہے"

(بقیہ صفحہ سابق) الحاکم بامر اللہ نے ۴۰۰ھ میں ایک مدرسہ مصر میں تعمیر کرایا یہ سب سے پہلا مدرسہ ہے جو سلطنت کی طرف سے رعایا کے لئے قایم ہوا ہے۔ اس کے بعد نیشاپور کے باشندوں نے ایک مدرسہ قومی چندہ سے امام ابوبکر فورک المتوفی ۴۰۶ھ کے لئے قایم کیا۔ اُس کے بعد نیشاپور میں ایک اور مدرسہ بیہقیہ قایم ہُوا۔ اِس کے مدرس اعظم امام ابوالقاسم اسکاف تھے۔ بعض مؤرخوں نے اس کو اسلامی دُنیا کا پہلا مدرسہ لکھا ہے۔ ۴۱۰ھ میں سلطان محمود نے غزنین میں ایک مدرسہ جاری کیا۔ محمود کی تقلید میں نصر بن سبکتگین نے بھی نیشاپور میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا اور مدرسہ سعیدیہ اس کا نام رکھا۔ اُن کے بعد نیشاپور میں ایک اور مدرسہ امام ابواسحٰق اسفرائینی المتوفی ۴۱۸ھ کے لئے قایم ہوا۔ جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ مدرسہ نظامیہ میں طلبا کو مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ اِس نوعیت کے لحاظ سے یہ پہلا مدرسہ ہے۔

مذکورۂ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ نصر کا مدرسہ ۴۱۰ھ کے بعد تعمیر ہوا ہے۔ اگرچہ کسی مؤرخ نے اس کی تاریخ تعمیر صراحت کے ساتھ بیان نہیں کی ہے۔ تاہم اس پر سب متفق ہیں کہ نصر نے اُس کو اپنی سپہ سالاری کے زمانہ میں جب کہ وہ نیشاپور میں رہا کرتا تھا تعمیر کرایا ہے۔ مؤرخ عتبی نصر کا ہمعصر ہے اُس کی تصریحات سے ظاہر ہے کہ ۳۸۹ھ سے ۳۹۵ھ تک تقریباً چھ سال نیشاپور میں اس کا قیام رہا ہے۔ اس بنیاد پر اس کی تاریخ تعمیر یقیناً ۳۹۵ھ سے پیشتر ثابت ہوتی ہے۔ اور یہ مدرسہ نہ

(باقی صفحہ آیندہ)

باب سوم

سلطان محمود بن سبکتگین

محمود کی علمی قابلیت، غزنین کی جامع مسجد مدرسہ اور کتب خانہ محمود کے دربار میں ارباب کمال کی قدر و منزلت، خوارزم کا خاندان مامونیہ۔ محمود کی علمی فیاضیاں۔

سلاطین آل سبکتگین میں سلطان محمود سب سے زیادہ عالم و فاضل بادشاہ تھا۔ علامہ ابی الوفا قریشی المتوفی ۷۷۵ھ نے اسے ائمہ فقہا میں شمار کیا ہے۔ اس نے اس زمانہ کے بڑے بڑے اعیان علما، وائمہ فن سے علوم شرعیہ کو تحصیل کیا تھا۔ حدیث فقہ میں اس نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں منجملہ ان کے ایک کتاب التفرید نہایت مشہور ہے اور فقہ احناف کی کتب مستندہ میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں ساٹھ ہزار مسائل مذکور ہیں[1]۔ محمود کو شعر و سخن سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ عربی فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتا تھا[2]۔

سلطان محمود ۴۱۰ھ میں جب متھرا کی فتح سے واپس آیا تو غزنین میں ایک جامع مسجد سنگ مرمر و خام سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) نہ صرف نیشاپور و غزنین کے مدرسوں سے قدیم ہے بلکہ مصر کے مدرسہ سے بھی پانچ سال پہلے تعمیر ہوا ہے۔ مدرسہ مصر اور نظامیہ کی، جو خصوصیات مؤرخین نے بیان کی ہیں۔ وہ بھی اِس میں جمع تھیں۔ یعنی یہ کہ حکومت کی طرف سے اس کا افتتاح ہوا ہے۔ طلبا کو مفت تعلیم دی جاتی۔ اور اُن کے رہنے کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ ان تمام وجوہات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ دعویٰ درجۂ ثبوت کو پہونچ جاتا ہے کہ "نصر کا مدرسہ سعیدیہ ہر اعتبار سے اسلامی دنیا کا پہلا مدرسہ ہے"۔

[1] جواہر المضیہ جلد ۲ کشف الظنون ۔ [2] موسیو شیفر (M. Sheifer) نے اپنی کتاب منتخبات فارسی کی جلد دوم صفحہ ۲۰۵ میں جس کا نام کرسیتمائی دی پرسان ہے محمود نامہ کو سلطان محمود سے منسوب کیا ہے۔ لیکن یہ صریح غلطی ہے محمود نامہ محمود کی تصنیف نہیں ہے۔ بلکہ اُس کو کسی نامعلوم الاسم شاعر نے ساتویں صدی میں یا اُس کے بعد تصنیف کیا ہے اِس میں سات غزلیں ہیں اور اس میں محمود کا عشق ایاز کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی مناسبت سے اِس کو محمود نامہ کہتے ہیں ایتھی، صفحہ ۹۶۷ نمبر ۱۷۶۸/۲

بنوائی اور اُسے انواع واقسام کے ساز وسامان سے مزین کیا۔ کہ سیاح اُسے دیکھتے تو عروس فلک کہا کرتے تھے۔ مسجد کے پاس ایک عظیم الشان مدرسہ بنوایا۔ اُس میں کتب خانہ بھی قایم کیا جس میں نفیس و نادر کتابیں جمع کیں مدرسے کے اخراجات کے لئے بہت سے دیہات وقف کئے۔ بادشاہ کی تقلید تمام امرا نے کی اور اُن لوگوں نے بھی اس قدر مساجد مدارس اور رباطات بنوائے کہ تھوڑی ہی مدت میں غزنین عالیشان عمارات اور علمی درس گاہوں سے معمور ہو گیا[1]۔

سلطان محمود چوں کہ خود ذی علم اور زبردست عالم تھا اس لئے ارباب فضل وکمال کی خوب قدر و منزلت کرتا تھا۔ قابل آدمیوں کو اطراف عالم سے بلا کر اپنے دربار میں جمع کیا تھا۔ اور سلطنت کے عہدہای جلیلہ اُن کے تفویض کئے تھے۔ بقول مؤرخ فرشتہ کے اس کے دربار میں ارباب کمال کا اس قدر مجمع تھا کہ ہندوستان میں کسی بادشاہ کے زمانہ میں نہیں ہوا[2]۔ حمد اللہ مستوفی اپنی تاریخ میں لکھتا ہے۔

"مآثر او از آفتاب روشن تر ست و مساعی او در رونق کار دین از شرح و وصف مستغنی۔ کتاب یمینی مقامات ابو نصر مشکان و مجلدات ابوالفضل شیبانی شاہد حال اوست علما و شعرا را دوست داشتی و در حق ایشاں عطائے جزیل فرمودی۔ ہر سال زیادت از چہار صد ہزار دینار او را بدیں جماعت صرف شدی[3]"

سلطنت ہائے اسلامیہ میں وزارت کتابت قضارت سفارت بڑے اور جلیل القدر عہدے ہوا کرتے تھے۔ سلطان محمود نے ان خدمتوں پر بڑے بڑے عالم آدمیوں کا معمور کر رکھا تھا۔ احمد حسین میمندی وزارت پر مامور تھا۔ ابو نصر مشکان کاتب تھا۔ امام ابو محمد عبداللہ بن حسین الناصحی قاضی القضات تھے۔ امام ابو طیب سہیل بن سلیمان صعلوکی اور امام ابو منصور ثعلبی کو بھی دربار سلطنت سے گہرا تعلق تھا اور دیگر سلاطین کے درباروں میں سفیر مقرر ہو کر جایا کرتے تھے۔

خوارزم کے شاہان مامونیہ[4] بڑے علم دوست اور ہنر پرور بادشاہ گزرے ہیں ان کے دربار میں حکیم

---

[1] فرشتہ جلد ۱ صفحہ ۳۰ [2] فرشتہ جلد ۱ صفحہ ۲۲ [3] تاریخ گزیدہ صفحہ ۳۹۵ [4] خوارزم کا خاندان مامونیہ جس کو خوارزم شاہیان قدیم بھی کہتے ہیں، ابتدا میں سلاطین سامانیہ کا باج گذار تھا جب سلطنت سامانیہ تباہی کے قریب ہو گئی اور سلاطین آل سبکتگین (باقی حاشیہ)

طبیب منجم محدث فقیہ شاعر غرض کہ ہر علم و فن کے صاحب کمال جمع تھے سلطان محمود خوارزم کو فتح کر کے ۴۰۸ھ کے موسم بہار میں واپس آیا تو وہاں کے تمام ارباب فضل و کمال کو بھی اپنے ساتھ غزنین میں لایا۔ ان میں مشہور طبیب اور فیلسوف ابوالخیر خمار ابوریحان البیرونی تھے۔ غزنین میں آنے کے بعد سلطان نے ان لوگوں کی خوب قدردانی کی خصوصاً ابوالخیر خمار کے ساتھ مراعات بیغایات سے پیش آیا۔ بیہقی نے ابوالخیر کے حالات میں لکھا ہے "سلطان محمود با او در نہایت اکرام و غایت تجلیل اختیار نمود بحدیکہ گویند زمین را در مقابل او بوسید"

محمود کو غایت شاعری سے خاص دلچسپی تھی۔ اس کے دربار میں چار سو شاعر تھے۔ عنصری کو ملک الشعرا کا خطاب دے کر ان کا افسر مقرر کیا تھا۔ اور حکم دے رکھا تھا کہ تمام شعراء دربار میں اپنا کلام سنانے سے پہلے عنصری سے اصلاح لے لیا کریں[۱]۔ ان شعراء میں عنصری۔ عضائری۔ عسجدی۔ ارشدی۔ فرخی۔ فردوسی وغیرہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) کو نشو و نما ہونے لگا۔ یعنی ۳۸۴ھ اور ۳۹۰ھ کے مابین کچھ عرصہ کے لئے یہ بادشاہ خود مختار ہو گئے۔ لیکن اُن کی یہ خود مختاری زیادہ مدت تک قایم نہیں رہی ۳۹۰ھ میں سلاطین آل سبکتگین نے ان کو اپنے زیر اثر کر لیا۔ یہ امر ابھی تک تحقیق نہیں ہوا کہ اس خاندان کی بنیاد کس زمانہ میں پڑی ہے تاہم ۳۰۵ھ سے ان کا نام تاریخ میں آیا ہے۔ مامون بن محمد خوارزم شاہ ابتدا میں جرجانیہ کا والی تھا ۳۸۵ھ میں ابوعبداللہ والی کاث کو شکست دے کر اس کے علاقہ پر متصرف ہو گیا۔ اس فتح سے خوارزم کا تمام علاقہ مامون خوارزم شاہ کے قبضہ میں آگیا (ابن اثیر حوادث ۳۸۵ھ)

۳۸۷ھ میں مامون نے وفات پائی اور اس کی جگہ علی بن مامون بن محمد خوارزم شاہ تخت نشین ہوا۔ اور سلطان محمود کی بہن سے عقد کیا جس کی وجہ سے دونوں بادشاہوں کے درمیان رشتہ اتحاد قایم ہو گیا (ابن اثیر حوادث ۳۸۷ھ) اسی کے زمانہ میں شیخ الرئیس بوعلی سینا خوارزم میں آیا تھا۔ اس نے اس کی بدرجہ غایت قدردانی کی تھی۔ (قفطی صفحہ ۴۱۷۔ ابن ابی اصیبعہ جلد ۲ صفحہ ۵۴)۔

علی بن مامون کے بعد اُس کا چھوٹا بھائی ابوالعباس مامون بن مامون بن محمد خوارزم شاہ برسر حکومت ہوا۔ اور اپنے بھائی کی بیوہ سے جو سلطان محمود کی بہن تھی نکاح کر لیا۔ بڑا علم دوست اور ہنر پرور بادشاہ ہوا ہے۔ ابوالحسین احمد بن محمد سہیلی جو مشہور فقیہی ہے اس کا وزیر اعظم تھا۔ امراء خوارزم نے ۴۰۷ھ میں اسے قتل کر دیا۔ اس وقت اس کی عمر ۳۲ سال کی تھی (ابن اثیر حوادث ۴۰۷ھ) تاریخ بیہقی (۴۰۰)

ابوالعباس مامون بن مامون کے بعد علی بن مامون کا لڑکا ابوالحارث محمد بن علی بن مامون خوارزم شاہ حکمراں ہوا۔ سلطان محمود نے مامون بن مامون کی خوں خواہی کے بہانے سے خوارزم پر یورش کی اور جب یہ ملک فتح ہو گیا تو حاجب کبیر التون تاش کو وہاں کا گورنر مقرر کر کے ۴۰۸ھ کے موسم بہار میں غزنین کو واپس آیا۔ خوارزم میں جس قدر ارباب کمال جمع تھے۔ ان سب کو اپنے ہمراہ غزنین میں لایا (ابن اثیر حوادث ۴۰۸ھ)

خاص امتیاز رکھتے تھے۔ اور دربار کے سبعۂ سیارہ کہلاتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ امیر مسعود بن محمود مہم خراسان سے فارغ ہو کر غزنیں میں آیا تو اُس کی تہنیت میں شعراء نے قصائد لکھے۔ محمود نے ہر ایک شاعر کو بیس بیس ہزار درہم اور عنصری و زینبی کو پچاس ہزار دینار عنایت کئے۔ محمود کی فرمایش سے عضائری نے ایاز کی تعریف میں ایک رباعی لکھی جس کے صلہ میں سلطان نے دو ہزار دینار عطا کئے۔ اُس کے بعد غضائری نے ایاز کی تعریف میں ایک غزل پڑھی جو سلطان کو پسند آئی۔ اور صلہ کو المضاعف کر دیا۔ اِس عنایت کے شکریہ میں غضائری نے ایک مطول قصیدہ لکھا جس کے بعض ابیات یہ ہیں ؎

اگر کمال بجاہ اندر ست و جاہ بہ مال | مرا ببیں کہ ببینی جمال را بہ کمال
صواب کرد کہ پیدا نہ کرد ہر دو جہاں | یگانہ ایزدِ دادار بے نظیر و ہمال
وگرنہ ہر دو جہاں راکف تو بخشیدی | اُمید بندہ نماندی بایزدِ متعال
مرا دو بیت بفرمود شہریار جہاں | برآں صنوبر عنبر عذار مشکیں خال
دو بدرہ از بفرستاد ہر ہزار تمام | بزعم حاسد بیمار باد بال و نکال
چہ گفت حاسد ناکس کہ بدسگالِ من ست | ز راہ باطن و در آشکار و نیک سگال
دو بدرہ یافتی از نعمت و کرامتِ شاہ | غنی شدی دگر از جور روزگار منال
بلی دو بدرۂ دینار یافتم بہ تمام | حلال و پاکتر از شیرِ دایۂ اطفال
ہزار بود دو ہزارِ دگر ملک افزود | بیک غزل کہ زمن خواست بر لطیف غزال

جب یہ قصیدہ سلطان کے ملاحظہ میں پیش ہوا تو سلطان نے اُس کے صلہ میں چودہ ہزار درہم پھر عنایت کئے۔ اِس عطیۂ بیکراں کو دیکھکر عنصری نے بے حد پیچ و تاب کھایا اور اِس قصیدہ کے جواب میں ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے ؎

خدایگان خراساں و آفتاب کمال | کہ وقف کرد بر و ذوالجلال عز و جلال

سلطان نے عنصری کو بھی اُسی قدر رقم سرفراز کی۔[1]

---

[1] غضائری کو جو عطیات ملے ہیں اُن کی تفصیل خزانہ عامرہ میں مذکور ہے۔

ایک دن مجلس عشرت میں سلطان محمود کو بے حد خمار زیادہ ہوگیا اور حالت سرور میں ایاز پر نظر پڑی اُس کے چہرہ پر پیچ در پیچ کاکل بکھری ہوئی تھیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابر میں ماہتاب چمک رہا ہے۔ سلطان کے جوش عشق کو غلبہ ہوا[1] لیکن زہد و اتقا نے قدم روک دیئے۔ اور ایاز کو حکم دیا کہ زلفیں قطع کردے۔ اُس نے اسی وقت تعمیل کی صبح جب نشہ فرو ہوگیا اور ایاز کا چہرہ دیکھا تو سخت پشیمان ہوا۔ اور طبیعت اِس درجہ مکدر ہوئی کہ تمام ندما و مقربین یہ کیفیت دیکھکر دم بخود رہ گئے۔ حاجب بزدک علی قریب نے عنصری سے تمام واقعہ بیان کیا۔ عنصری نے سلطان کے سامنے جاکر یہ رباعی پڑھی ؎

کے عیب سر زلف بت از کاستن است | چہ جائے بہ غم نشستن و خواستن است
جائے طرب و نشاط و مے خواستن است | کاراستن سرو ز پیراستن است

یہ اشعار سلطان کو بے حد پسند آئے اور حکم دیا کہ تین بار عنصری کا منہ جواہرات سے بھرا جائے[2]۔

سنہ ۴۱۳ھ میں سلطان محمود نے قلعہ کالنجر کا محاصرہ کیا تو وہاں کے راجہ نندا نے ۳۰۰ ہاتھی دے کر صلح کرلی۔ اور ہندی زبان میں ایک قصیدۂ مدحیہ لکھکر سلطان کی خدمت میں روانہ کیا۔ دربار ہند اور عرب و عجم کے جو علماء تھے اُنھیں سلطان نے یہ قصیدہ سُنایا سبھوں نے اُس کی تعریف و توصیف کی تو سلطان نے اِس کے صلہ میں نندا کے تمام علاقے واپس کردیئے۔ اور علاوہ اِس کے چودہ قلعوں کو اپنی طرف اُسے دیدیا[3]۔

باب چہارم

دربار محمود کے ارباب فضل و کمال

فضل بن احمد اسفرائینی۔ احمد بن حسن میمندی۔ ابو نصر مشکان۔ ابو نصر عتبی اور اُس کی تاریخ۔ امام ناصحی امام صعلوکی۔ ایلک خاں۔ امام ثعلبی حکیم ابو الخیر خمار۔ حکیم ابو ریحان بیرونی۔

ابو العباس فضل بن احمد اسفرائینی[4]۔ ابتدا میں سلاطین سامانیہ کا کاتب تھا۔ امیر ناصر الدین سبکتگین نے اس کو

---

[1] محمود و ایاز کے اِس قسم کے بے سر و پا قصوں کی مولوی محمود شیرانی نے اپنے مضامین میں جو اُردو میں شایع ہوئی ہیں نہایت تحقیق سے تردید کردی ہے (اڈیٹر)
[2] چہار مقالہ صفحہ ۴۴ و ۴۵۔ لطایف الطوایف [3] فرشتہ صفحہ ۲۱ طبقات اکبری صفحہ ۹ [4] شرح یمینی صفحہ ۱۵۶ و ۱۶۵ تاریخ گزیدہ صفحہ ۸۴ شاہنامہ صفحہ ۹۰۲ فرشتہ جلد ۱ حبیب السیر

اپنا وزیر بنایا۔ سبکتگین کے بعد محمود نے بھی اپنے ابتدائی زمانہ میں اس کو خدمت وزارت پر بحال رکھا۔ قریباً آٹھ سال اس نے وزارت کی۔ ۳۹۴ھ میں اُس کا انتقال ہوگیا۔ اس کو امور جہانبانی میں خوب لیاقت تھی۔ ایرانی النسل تھا۔ اس لئے ایرانی لٹریچر اور فارسی زبان سے رغبت تمام رکھتا تھا۔ پہلے سلطنت کے احکام و توقیعات عربی میں لکھے جاتے تھے۔ لیکن اُس نے عربی کے بجائے اُنھیں فارسی میں لکھنے کا حکم دیا۔ فردوسی جب شاہنامہ لے کر طوس سے غزنین میں آیا تو اُس نے دربار میں اُس کی تقریب کی۔ اس کی اولاد سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکے کا نام حجاج تھا۔ وزیر رشید نے جامع التواریخ میں اُن کی نسبت لکھا ہے کہ :-

"ابو العباس پسری داشت حجاج نام کہ در فضائل کسب نفسانی سرآمد آں دیار بود و اشعار عربی در غایت بلاغت نظم میفرمود و دختری نیز داشت کہ در علم حدیث مہارت بے نہایت پیدا کرد چنانچہ بعضے از محدثان از وی حدیث روایت کنند۔"

شمس الدین ابو القاسم احمد بن حسن میمندی[1] سلطان محمود نے اس کو ابتدا میں خراسان کا دیوان رسائل مقرر کیا تھا۔ فضل بن احمد کی معزولی کے بعد وزارت سے فایض ہوا۔ بلند پایہ اور زبردست عالم ہوا ہے۔ عربی فارسی میں شعر خوب کہا کرتا تھا۔ امام ابو المنصور ثعلبی نے یتیمۃ الدہر میں اُس کے عربی اشعار نقل کئے ہیں۔ اس نے اٹھارہ سال وزارت کی۔ اس کے بعد سلطان نے اس خدمت سے معزول کر کے قلعہ کالنجر میں قید کرایا۔ تیرہ برس اُس نے قید میں گزارے۔ مسعود کے زمانہ میں رہائی حاصل کی پھر وزارت سے سرفراز ہوا۔ ۴۲۴ھ میں انتقال کیا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ احمد کا باپ حسن میمندی سلطان محمود کا وزیر تھا۔ لیکن یہ صریح غلطی ہے۔ حسن میمندی امیر ناصر الدین سبکتگین کے زمانہ میں گذرا ہے۔ امیر سبکتگین نے جب قصبہ بست کو فتح کیا تو وہاں ضبط اموال کے لئے اس کا تقرر ہوا۔ لیکن خیانت کرنے کی وجہ سے امیر نے اُس کو قتل کرا دیا۔ یہ واقعہ سلطان محمود کے تخت نشین ہونے سے پہلے واقع ہوا ہے[2]

---

[1] شرح یمینی صفحہ ۱۶۶ و ۱۷۲۔ ابن اثیر جلد ۹ صفحہ ۲۸۳ و ۴۳۹۔ عوفی جلد ۱ صفحہ ۶۳ فرشتہ صفحہ ۳۰ [2] عتبی

ابو نصر بن خشکان[1] مشہور و معروف ادیب ہے۔ اُس نے علم ادب میں المقامات کے نام سے ایک بے نظیر کتاب لکھی ہے۔ مشہور مؤرخ ابوالفضل بیہقی اُس کا شاگرد تھا۔ سلطان مسعود کے زمانہ میں بھی دیوان رسالت کا عُہدہ اسی سے وابستہ تھا۔ ۴۳۹ھ میں بزمانۂ سلطان مودود اس کا انتقال ہوا۔

ابو نصر محمد بن عبدالجبار العتبی[2] مشہور ادیب ہے۔ سلطان محمود کے اہل دربار سے تھا۔ سلطان جب برسرِ حکومت ہوا تو اسے مہم کرجستان پر روانہ کیا۔ اُسی دوران میں کچھ عرصہ کے لئے گنج رستاق میں صاحب البرید ہو گیا پھر غزنین میں آکر دربار میں رہنے لگا۔ ۴۱۱ھ میں اس نے امیر ناصر الدین سبکتگین اور سلطان محمود کی تاریخ لکھی ہے جو یمینی کے نام سے مشہور ہے۔ اور بلحاظ انشاء کے اس کی عبارت اس قدر فصیح و بلیغ ہے کہ علمائے ادب اُسے مقامات ہمدانی اور حریری کے ہم پایہ قرار دیتے ہیں۔ احمد المینی المتوفی ۱۰۷۲ھ نے اُس کی شرح لکھی ہے اور اس میں اُس کے تمام لغات مشکلہ کو حل کیا ہے۔ یہ شرح فتح الوہبی کے نام سے ۱۲۸۶ھ میں بولاق میں چھپ گئی ہے یمینی کو ڈاکٹر اسپرنگر (Springer) نے ۱۸۴۷ء میں دہلی میں چھپوایا ہے۔ اور پروفیسر نولدیکی (Noldeki) نے جرمن میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ جو ۱۸۵۸ء میں بمقام ویانا شایع ہوا ہے۔

آذربائجان کے بادشاہ اتابک ابوبکر محمد بن ایلدگز (۵۸۷ھ ۶۰۷ھ / ۱۱۹۱ء ۱۲۱۰ء) کے زمانہ میں وزیر مہذب الدین ابوالقاسم علی بن الحسین کی فرمایش سے ابوالشرف ناصح بن ظفر بن سعد الجربادقانی نے یمینی کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ جربادقان جسے اہلِ فارس گلبائیگان کہتے ہیں علاقہ ہمدان میں اصفہان کے قریب واقع ہے۔ عربی کتاب کی بہ نسبت اِس فارسی ترجمہ نے زیادہ شہرت و قبولیت حاصل کی ہے۔ زمانہ مابعد میں ایرانی مؤرخین نے مثل حمد اللہ مستوفی احمد غفاری میرخوند، خوندمیر، فرشتہ، وغیرہ نے اِسی ترجمہ سے امیر سبکتگین اور محمود کے حالات نقل کئے ہیں۔ یہ ترجمہ ۱۲۷۴ھ میں بمقام طہران طبع ہو گیا ہے۔ اِس ترجمہ سے درویش حسن ترکی میں اور جیمس رینالڈ نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ انگریزی ترجمہ اورنٹیل ٹرانسلیشن فنڈ کے سلسلہ میں ۱۸۵۸ء میں لندن میں چھپا ہے۔

---

[1] ابن اثیر حوادث ۴۳۱ھ صلاح الدین صفوی نے الوافی بالوفیات میں اس کے مفصل حالات لکھے ہیں۔ امام ثعلبی نے تتمہ میں اس کے عربی کلام کو نقل کیا ہے

[2] روضۃ الصفاء جلد ۴ صفحہ ۹۴۔ حبیب السیر۔ طبقات ناصری ترجمہ ریورٹی جلد ۱ صفحہ ۸۶ حاجی خلیفہ جلد ۶ صفحہ ۵۱۴۔ ایلیٹ ہسٹری جلد ۲ صفحہ ۱۴ ریو جلد ۱ صفحہ ۱۵۷ رسالہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۶۰ء صفحہ ۴۲۴۔

امام ابو محمد عبد اللہ بن حسین الناصحیؒ[1]۔ تفسیر حدیث فقہ کے زبردست عالم اور مذہب حنفیہ کے امام وقت مانے جاتے تھے۔ سلطان محمود اور مسعود کے زمانہ میں مدت مدید تک قاضی القضاۃ کے عہدہ جلیلہ پر مامور رہے ہیں۔ ۴۴۷ھ میں فرخ زاد کے زمانہ میں ان کا انتقال ہوا ہے۔

۴۱۲ھ میں علماء فضلا اور دیگر اہل اسلام کی ایک جماعت کثیر نے سلطان محمود سے عرض کی کہ اعراب اور قرامطہ کی وجہ سے بیت اللہ کا راستہ مسدود ہو گیا ہے۔ ان کے خوف اور خلفاء کے خلفشار سے مسلمان ایک عرصہ سے حج و زیارت بیت اللہ سے محروم ہیں۔ سلطان نے قاضی صاحب کو امیر حجاج بنا کر غزنین سے حاجیوں کا ایک قافلہ روانہ کیا زادِ راہ کے لئے تیس ہزار دینار دیئے۔ یہ قافلہ مناسک حج ادا کرنے کے بعد ایک سال کے اندر خیر و خوبی سے واپس آیا[2]۔

امام ابو طیب سہیل بن سلیمان صعلوکیؒ[3] تفسیر حدیث فقہ ادب کلام میں امام وقت اور نیشاپور کے قاضی القضاۃ تھے۔ ائمہ حدیث نے اُن کو شیخ خراسان اور شمس الاسلام کے لقب سے یاد کیا ہے۔ خراسان کے فقہا اگر کسی مسئلہ میں اختلاف کرتے تو فیصلۂ آخر کے لئے وہ مسئلہ اُن کے یہاں پیش ہوتا تھا۔ اُنھوں نے ۴۰۴ھ میں بمقام نیشاپور وفات پائی ہے۔ ۳۸۹ھ میں ایلک خاںؒ[4] نے جب آل سامان کا خاتمہ کر دیا تو مملکت سامانیہ کے بارے میں ایلک خاں اور سلطان محمود کے مابین یہ قرار پایا کہ ماوراء النہر پر ایلک خاں کا اور خراسان پر محمود کا قبضہ رہے۔ اِس تصفیہ کے

---

[1] جواہر المضیہ جلد ۱ صفحہ ۲۷۱ [2] ابن اثیر جلد ۹ صفحہ ۲۲۹۔ فرشتہ جلد ۱ صفحہ ۳۰ [3] مفتاح السعادہ جلد ۲ صفحہ ۱۸۲

[4] ایلک خاں۔ مؤرخین نے ماوراء النہر کے بادشاہ کا نام ایلک خاں لکھا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ نام شخص خاص کا نہیں بلکہ خاندان کا لقب ہے۔ اس خاندان کے حالات کسی مؤرخ نے مستقل عنوان کے تحت میں نہیں لکھے ہیں۔ ابن اثیر ابن خلدون۔ منہاج سراج۔ وزیر رشید الدین وغیرہ نے اپنی تاریخوں میں مختلف مقامات پر اس خاندان کے حالات دوسرے سلاطین کے تحت میں لکھے ہیں احمد غفاری نے جہاں آرا ان کے حالات ایک علٰحدہ باب میں لکھے ہیں۔ لیکن وہ نہایت مختصر ہیں حال میں سر ہنری ہوارٹ نے مؤرخین عرب کی تصنیفات سے اخذ کر کے مضمون اس کے متعلق لکھا ہے جو نہایت مکمل اور معلومات مفیدہ سے مملو ہے۔

مؤرخین ان بادشاہوں کو خوانین ایلک خانیہ کے علاوہ آل افراسیاب بھی کہتے ہیں۔ یہ بتانا غیر ممکن ہے کہ کس زمانہ میں اس خاندان کا ظہور ہوا۔ لیکن چوتھی صدی کے اخیر ایام سے تاریخ میں اُس کا ذکر ملتا ہے اوائل زمانہ میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

بعد سلطان محمود نے امام صاحب کو سفیر بنا کر ایلک خاں کے پاس روانہ کیا۔ بے شمار تحف و ہدایا کے ساتھ اپنی لڑکی بھی ان کے ہمراہ کر دی۔ تاکہ ایلک خاں کے ساتھ امام صاحب اس کا عقد کر دیں۔ امام صاحب جب ترکستان میں پہونچے تو ایلک خاں نے ان کی بے حد تعظیم و تکریم کی اور کچھ عرصہ کے بعد امام صاحب فائز المرام ہو کر اوزکند سے واپس تشریف لائے۔[۱]

امام ابو المنصور عبد الملک محمد بن اسمٰعیل الثعلبی[۲] اپنے زمانہ کے سب سے بڑے مصنف اور ادب اور تاریخ میں امام وقت مانے جاتے تھے۔ ۳۵۰ھ میں بمقام نیشاپور پیدا ہوئے۔ اور ۴۲۹ھ میں بمقام غزنین انتقال کیا۔

موسیو زوٹن برگ (M. Zotenberg) نے کتاب الغرر فی اخبار ملوک الفرس کے دیباچہ میں اُن کے مفصل حالات لکھے ہیں امام صاحب کی بعض مشہور تصنیفات کے نام یہ ہیں۔ لطائف المعارف، سحر البلاغۃ، فقہ اللغۃ النہایہ فی الکنایہ، کتاب الغرر، تیمیۃ الدہر۔ وغیرہ امام صاحب کو دربار آل سبکتگین سے خاص تعلق تھا۔ اُنھوں نے کتاب الغرر امیر نصر بن سبکتگین کی فرمایش پر تصنیف کی ہے تیمیۃ الدہر تتمہ کو سلطان مسعود کے نام پر ڈیڈیکیٹ کیا ہے۔ ۴۰۹ھ میں سلطان محمود کی طرف سے سفیر ہو کر خلافت بغداد میں تشریف لے گئے۔ تاکہ سلطان کے لئے خطاب حاصل کریں۔ امام صاحب نے کامل ایک سال بغداد میں قیام فرما کر اس بارے میں کوشش کی۔ تب خلیفہ نے سلطان کو یمین الدولہ ولی امیر المومنین کا خطاب دے کر اُس کے بموجب احکام منا شیر صادر کئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) کاشغر ان کا مستقر تھا۔ آل سامان سے جب ما ورا النہر کو لے لیا تو بخارا کو صدر مقام قرار دیا۔ اُن کی حکومت بلاد ترکستان میں سرحد چین تک پھیلی ہوئی تھی۔ مؤرخین نے بغرا خاں کو اس خاندان کا پہلا بادشاہ بتایا ہے۔ بقول ابن اثیر اُس کا نام ہارون بن سلیمان اور لقب شہاب الدولہ تھا۔ ۳۸۲ھ میں اُس نے وفات پائی ہے (ابن اثیر حوادث ۳۸۳ھ)

بغرا خاں کے بعد جو بادشاہ تخت نشین ہوا۔ اس کا نام ابن اثیر نے ابو نصر احمد بن علی لکھا ہے۔ لیکن صحیح نام نصر بن علی ہے اور اُس کا بہترین ثبوت اُس کے سکہ جات ہیں جن پر اِس کا نام (ناصر الحق نصر ایلک) یا نصر بن علی ایلک، نقش ہے اُس نام کے سکے ۳۹۰ھ سے ۴۰۰ھ تک مسلسل دس سال کے دستیاب ہوئے ہیں یہ ہی نصر بن علی سلطان محمود کا معاصر تھا۔ اِسی کے دربار میں امام صعلوکی سفیر ہو کر تشریف لے گئے تھے۔ تمام مؤرخین کا اتفاق ہے کہ اِس نے ۳۸۳ھ سے ۴۰۳ھ تک قریباً بیس سال حکومت کی ہے لیکن ہوارٹ نے اِس کے خلاف یہ رائے ظاہر کی ہے کہ بادشاہ ۴۰۸ھ تک بقید حیات موجود تھا۔

[۱] عتبی طبع دہلی صفحہ ۵۵ ترجمہ صفحہ میرخوند سلاطین غزنویہ صفحہ ۲۴ فرشتہ جلد ۱ صفحہ ۲۳ [۲] ابن خلکان جلد ۲ صفحہ ۹۲ مفتاح السعادۃ جلد ۱ صفحہ ۲۱۳ و ۲۱۴ و ۱۸۷۔ دولت شاہ صفحہ ۴۳ برکلمان جلد ۱ صفحہ ۲۸۴ و ۲۸۶

ابن الخیر حسن بن الخمار[1] اسلام کے دَورِ اولین کا مشہور و معروف حکیم ہے۔ ماہ ربیع الاول ۳۳۱ھ کو بغداد میں پیدا ہوا۔ مامون خوارزم شاہ کا ندیم تھا۔ فتح خوارزم کے بعد سلطان محمود کے ہمراہ غزنین میں آیا۔ منطق فلسفہ اور طب میں اُس نے پندرہ سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ مگر اِس وقت ناپید ہیں۔

ابن الخمار کا سنہ وفات تحقیق نہیں ہوا۔ وسنفلڈ (Westenfeld) نے تاریخ اطبائے عرب میں لکھا ہے کہ اِس نے ۳۸۱ھ میں وفات پائی ہے۔ لیکن یہ صریح غلطی ہے۔ کیوں کہ سلطان محمود نے ۴۰۸ھ میں خوارزم کو فتح کیا۔ اور اِس کے بعد اُسے اپنے ہمراہ غزنیں میں لایا۔ یقین ہے کہ ۴۰۸ھ کے بعد بھی ابن الخمار عرصہ تک بقید حیات موجود تھا۔ علامہ ابن ندیم ابن الخمار کا معاصر ہے۔ اور اپنے کتاب الفہرست میں دو جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ شہرزوری نے بہ نسبت دیگر تذکرہ نویسیوں کے اِس کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

مُرکّب از دو کلمہ کہ ۔ و نام است یعنی نام خیر و نقل کردہ بود بسیارے کتب از سریانی بہ عربی حکمت را پیش یحییٰ بن عدی خواندہ بود۔ از خصوصیات او آں کہ ہرگاہ فقیری او را طلب میداشت پیادہ میرفت و میگفت این رفتن راہ کفّارہ درہائے ملوک و سلاطین فساق میسازم و اگر سلطان میطلبید سوار میرفت در لباس بزرگان و غلامان ترک و اسپہائے بدو وضاعت خود را بہ تواضع با فقرا و بہ تعاظم با بزرگان بجامی آورد۔ جالینوس و جمیع حکما و نیز ایں طریق سلوک میداشتند۔

و ابن ابوالخیر در بغداد تولد یافتہ بود۔ ماموں پسر محمد خوارزم شاہ او را پیش خوارزم شاہ برد محمود سبکتگیں بر خوارزم شاہ مستولی گشت او را بغزنہ آورد۔ روزے سلطان محمود بجہتہ عارضہ او را طلب نمود و اسپی از برائے سواری او فرستاد او سوار بہ بازار کفش فروشان عبور کرد اسپ او رم کرد او را بینداخت و بشکست۔ سلطان محمود او را ناحیہ عطا فرمود کہ آنرا ناحیہ خمار میگفتند و او را منسوب بایں بقعہ دانستہ اند۔

او را تصانیف بسیار است در اقسام علوم حکمت بعضے ازاں مقالہ است در توفیق میان نصاریٰ

---

[1] ابن ندیم صفحہ ۲۴۵ و ۲۶۵ شہرزوری عربی جلد ۱ صفحہ ۷، فارسی صفحہ ۱۶۶ قفطی صفحہ ۱۶۴۔ ابن ابی اصیبعہ جلد ۱ صفحہ ۳۲۲ و ۳۲۳

[2] ابن الخمار۔ دہر ابوالخیر حسن بن بابا بن سوار بن بہنام بغدادی۔ بہنام لفظ فارسی است۔

وفلاسفہ ومقالہ است درظاہر ساختن آرائے حکما ردرباری تعالےٰ وشرائع ومقالہ است درروز
بازگشت وکتابی است درکیفیت خلق انسان داورابقراط ثانی میگفتند سزاوار بود بہ ایں اسم۔

حکیم ابوریحان محمد بن احمد البیرونی[1] مشہور ومعروف مؤرخ اور ہیئت داں ہی۔ اور ۳ ذی الحجہ سنہ ۳۶۲ھ بمقام خوارزم پیدا ہوا۔ اور ۷۷ سال کی عمر میں ۳ رجب سنہ ۴۴۰ھ کو غزنین میں فوت ہوا۔ بیرونی منسوب ہی بیرونی خوارزم سے۔ ابوریحان چوں کہ خاص شہر خوارزم کا باشندہ نہیں تھا بلکہ حوالی خوارزم کا رہنے والا تھا، اس لئے بیرونی کے لقب سے مشہور رہا۔ امام عبدالکریم سمعانی المتوفی سنہ ۵۶۲ھ نے اپنی کتاب الانساب میں جو ابوریحان کی وفات کے قریباً سو سال بعد تالیف ہوئی ہی۔ لکھا ہے۔ البیرونی بفتح البا الموحدہ وسکون الیا آخر الحروف وضم الراء بعدہا الواو وفی آخرہا نون ہذہ النسبۃ الی خارج خوارزم فان بہا من یکون من خارج البلد ولایکون من نفسہا یقال لہ فلان بیرونی است ویقال بلغتہم ان بشرک است والمشہور بہذہ النسبۃ ابوریحان المنجم البیرونی۔

ابوریحان کی عمر کا ابتدائی حصہ خوارزم میں آل مامون کے دربار میں گزرا ہی۔ اسی دوران میں کچھ عرصہ کے لئے ابوریحان جرجان کو چلا گیا۔ اور وہاں شمس المعالی ابوقابوس بن وشمگیر کے دربار میں رہا۔ سنہ ۳۹۰ھ میں اُس کے نام سے آثار الباقیہ تصنیف کی۔ سنہ ۴۰۰ھ میں جرجان سے خوارزم میں واپس آیا۔ اور سنہ ۴۰۷ھ تک قریباً سات سال ابوالعباس مامون بن مامون خوارزم شاہ کے دربار میں بسر کئے۔ سلطان محمود فتح خوارزم کے بعد ۴۰۸ھ کے موسم میں غزنین کو واپس آیا تو اپنے ہمراہ ابوریحان کو بھی غزنین میں لایا۔ گمان ہوتا ہی کہ غزنین میں آنے کے بعد سلطان محمود کے حملوں میں شریک ہوکر ابوریحان کئی بار ہندوستان میں آیا۔ اور یہاں کے پنڈتوں سے میل جول پیدا کرکے سنسکرت زبان سیکھی پھر ہندوستان کے علم تاریخ وجغرافیہ ہیئت اور ریاضیات اور دیگر علوم کو حاصل کیا اس کے بعد اپنی مشہور کتاب الہند لکھنی شروع کی جو سلطان محمود کے زمانہ میں اختتام کو پہونچی ہی۔

---

[1] ایڈورڈ سیخاؤ (Seikhao) نے آثار الباقیہ کے دیباچہ میں ابوریحان کے حالات لکھے ہیں اور اس کی ترتیب میں ان تمام مضامین سے فائدہ اُٹھایا ہی جو گزشتہ صدی سے اخیر ایام تک ابوریحان کے متعلق مشرق ومغرب میں لکھی گئی ہیں اور اس سے بہتر تذکرہ اب تک نہیں لکھا گیا ہی۔ سطور بالا اسی مضمون سے ماخوذ ہیں تاہم بنظر احتیاط کتب ذیل بھی ہم نے دیکھ لی ہیں۔
ابن ابی اصیبعہ جلد ۲ صفحہ ۲۰ ایلیٹ ہسٹری جلد ۲ صفحہ ۱ بروکلمن جلد ۱ صفحہ ۴۷۵۔ آثار الباقیہ۔ ترجمہ انگریزی دیباچہ

ابوریحان نے مختلف علوم و فنون میں متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں قانون مسعودی سب سے بہترین تصنیف ہے۔ مسلمانوں نے علم ہیئت کے متعلق اس وقت تک جو کچھ لکھا ہے ان سب سے یہ کتاب مکمل اور بہتر تسلیم کی گئی ہے۔ آثار الباقیہ عن قرون الخالیہ میں اقوام قدیمہ کے علم کی تاریخ مذکور ہے۔ کتاب الہند میں ہندوؤں کی تاریخ اور علوم و فنون کے حالات ہیں۔ کتاب التفہیم فی صناعت التنجیم نجوم و ہندسہ تحریر ہیں۔ یہ کتاب ابوریحان نے خوارزم کی ایک امیرزادی ریحانہ بنت الحسن کے نام پر تالیف کی ہے اور اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ علمی قدردانی میں اُس زمانہ کی عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش تھیں۔ بعض دیگر تصنیفات کے نام یہ ہیں کتاب الارشاد فی احکام النجوم۔ کتاب الجماہر فی الزواہر۔ مقالید الہیئت۔ العجائب الطبعہ وغیرہ۔ علاوہ ان کے سنسکرت کی بیس سے زیادہ کتابوں کا ترجمہ کیا یا خلاصہ لکھا ہے۔

باب پنجم

دربار سلطان محمود کے شعرا

دربار سلطان محمود کے شعرا۔ عنصری۔ عسجدی۔ عضائری۔ فرخی۔ آل محتاج۔ اسدی منثوری۔ بہرامی۔ امیر قائینی۔ بدایعی بلخی۔

حکیم ابوالقاسم حسن بن احمد العنصری[۱] بلخ کا باشندہ تھا۔ ابوالمظفر امیر نصر بن سبکتگین خراسان کا گورنر تھا عنصری پہلے پہل اس کی خدمت میں آیا اور اس کے توسط سے سلطان محمود کے دربار میں باریاب ہوا سلطان نے اُس کی نہایت قدردانی کی اور ملک الشعرا کا خطاب دے کر دربار کے تمام شعرا کا افسر مقرر کیا۔ اس کے جاہ و جلال اور دولت و ثروت کا یہ حال تھا کہ اس کا کھانا سونے چاندی کے برتنوں میں پکتا تھا۔ اور جب مکان سے باہر نکلتا تھا تو چار سو زریں کمر غلام اُس کے ہمراہ رکاب رہا کرتے تھے۔

---

[۱] عوفی جلد ۲ صفحہ ۲۰ دولت شاہ صفحہ ۴۴ مجمع الفصحا جلد ۱ صفحہ ۳۵۵ خزانہ عامرہ صفحہ ۳۲۷ - مرآۃ الخیال صفحہ ۲۴ آتشکدہ صفحہ ۳۱۹ فرشتہ جلد ۱ صفحہ ۲۹ براؤن جلد ۲ صفحہ ۱۲۰

عام طور پر مشہور ہی کہ عنصری کے اشعار تیس ہزار سے زیادہ تھے۔ ۱۳۰۲ھ میں طہران میں اس کا ایک دیوان چھپا ہی جس میں قصائد کے علاوہ چند غزلیات اور رباعیات بھی ہیں اور اُس کے اشعار کی مجموعی تعداد تین ہزار ہی عنصری نے غزلیات و قصائد کے علاوہ متعدد مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ اسدی طوسی نے اپنے لغات میں ان مثنویوں کے بعض ابیات نقل کئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہی کہ شاد بہر شاہنامہ کی بحر میں ہی ؎

چو سر گشتہ غنچہ سُرخ گل　　جہاں جامہ پوشید ہمرنگ ِ مل

وامق و عذرا بحر ہفت پیکر کی بحر میں ہی ؎

گفت کیں مردمان بیباک اند　　ہمہ ہموارہ دزد و چالاک اند

ایک مطول قصیدہ میں عنصری نے سلطان محمود کے فتوحات بیان کئے ہیں۔ دولت شاہ نے لکھا ہی کہ اِس قصیدہ کے اَسّی بیت ہیں۔ لیکن دیوان کے مطبوعہ نسخہ میں کل ساٹھ شعر چھپے ہیں۔

تمام تذکرہ نویسوں نے باتفاق لکھا ہی کہ مسعود کے زمانہ میں ۴۳۱ھ / ۱۰۳۹ء میں اس کا انتقال ہوا۔ صاحب آتشکدہ نے لکھا ہی کہ سلطان ابراہیم بن مسعود کے زمانہ میں عنصری کا انتقال ہوا۔ لیکن یہ صریح غلطی ہے کیوں کہ عنصری کی وفات کے ۲۰ سال بعد ۴۵۱ھ / ۱۰۵۹ء میں ابراہیم بن مسعود تخت نشین ہوا ہی۔

ابونصر عبدالعزیز بن منصور العسجدی[۱]۔ عوفی نے لکھا ہی کہ مرو کا باشندہ تھا۔ دولت شاہ نے ہرات کو اِس کا وطن بتایا ہی۔ دربار سلطان محمود کے مشاہیر شعراء سے ہی۔ سلطان محمود جب سومنات کی مہم سے واپس آیا تو اُس کی تہنیت میں عسجدی نے ایک قصیدہ لکھا ہی جس کا مطلع یہ ہی ؎

تا خورده بین سفر سومنات کرد　　کردار خویش را علم معجزات کرد

سلطان مسعود کے زمانہ میں ۴۳۲ھ / ۱۰۴۰ء میں اِس کا انتقال ہوا۔

ابوزید محمد بن علی الغضائری[۲] المروزی۔ ری کا باشندہ ہی۔ ابتدا میں اِسے بہاؤ الدولہ بویہ ۴۰۳ھ / ۹۹۸

---

[۱] عوفی جلد ۲ صفحہ ۵۰ دولت شاہ صفحہ ۴۷ فرشتہ جلد ا صفحہ ۳۹ مرآۃ الخیال صفحہ ۲۴۔ آتشکدہ صفحہ ۳۶ ا مجمع الفصحا جلد ا صفحہ ۳۴۰۔ برون جلد ۲ صفحہ ۱۲۳　　[۲] عوفی جلد ۲ صفحہ ۵۹ دولت شاہ صفحہ ۳۳ خزانہ عامرہ صفحہ ۳۶۱ مجالس المومنین صفحہ ۵۰۵ مرآۃ الخیال صفحہ ۲۲ مجمع الفصحا جلد ا　　فرشتہ جلد ا صفحہ ۳۹ برون جلد ۲

۴۰۳ھ/۱۰۱۲ء کے دربار سے تعلق تھا۔ اور وہاں سے ہر سال ایک قصیدہ لکھکر سلطان محمود کی خدمت میں بھیجتا جس کے صلہ میں اسے ہزار دینار ملا کرتے تھے۔ بہاؤالدولہ کی وفات کے بعد غزنین میں آیا۔ اور سلطان مسعود کے اوائل عہد میں ۴۲۶ھ/۱۰۳۴ء فوت ہوا۔

غضائری کا املاء غین معجمہ سے ہے۔ اس کے معنی ہیں کاشی ساز و کاسہ گر۔ اور یہ منسوب ہے غضائر سے غضائر جمع قیاسی ہے غضارہ کی۔ غضارہ کے معنی ہیں گل چسپیدہ اور وہ ظروف سفالین جن پر کاشی اور چینی سے گل بوٹے بنائے جاتے ہیں غضارہ کہلاتے ہیں۔ صاحب مجمع الفصحا نے غضائری کو بدون یا بعد الالف لکھا ہے یعنی غضاری یہ غلطی ہے۔ حکیم عنصری اپنے ایک قصیدہ میں کہتا ہے ؎

کجا شریف بود چوں غضائری بر تو ۔۔۔ ز طبع باشد چونانکہ از مُرخ و سفال

برگ نے تاریخ فرشتہ کے ترجمہ میں اس کا تلفظ عین مہملہ سے ادا کیا ہے (Uzaeeri Razi) جن انگریزی مصنفین نے اس کے حالات برگ کے ترجمہ سے نقل کئے ہیں ان میں بھی یہ غلطی موجود ہے۔[1]

ابوالحسن علی بن جولوغ الفرخی[2] سجستان کا باشندہ ہے۔ اس کا باپ جولوغ امیر احمد خلف حاکم سجستان کا غلام تھا۔ فرخی ایک دہقان کے یہاں ملازم تھا۔ اور اس خدمت کے معاوضہ میں اسے سالانہ دو سو کیل غلّہ اور سو درہم ملا کرتے تھے۔ اس نے امیر خلف کی ایک کنیز سے نکاح کر لیا۔ جس کی وجہ سے موجودہ معاش غیر کافی ثابت ہوئی۔ اور اس نے دہقان سے تین سو کیل غلّہ اور ڈیڑھ سو درہم مانگے۔ لیکن دہقان نے صاف جواب دیدیا کہ اس قدر دینا قدرت سے باہر ہے۔ فرخی مایوس ہو کر سجستان سے نکلا۔ اور قسمت آزمائی کرتا ہوا ابوالمظفر چغانی کے دربار میں آیا۔ اور کچھ عرصہ چغانیاں میں بسر کرنے کے بعد سلطان محمود کے دربار میں باریاب ہوا رفتہ رفتہ ایسے مراتب عالیہ حاصل کر لئے کہ جب باہر نکلتا تو بیس زرّیں کمر غلام سواری کی جلو میں چلا کرتے تھے۔

فرخی نے صنائع بدائع فارسی میں ایک کتاب ترجمان البلاغۃ لکھی ہے جو اس وقت ناپید ہے۔ لیکن رشید الدین وطواط نے اسے دیکھا تھا۔ اور اپنی کتاب حدایق السحر میں اس کے متعلق لکھتا ہے۔

---

[1] فرشتہ کا انگریزی ترجمہ جلد ا صفحہ ۸۹ - نرندا ناتھ کی کتاب

[2] چہار مقالہ صفحہ ۴۶ تا صفحہ ۵۲ عوفی جلد ۲ صفحہ ۴۷ دولت شاہ صفحہ ۵۵ فرشتہ جلد ا صفحہ ۳۹۰ آتشکدہ صفحہ ۸۶ خزانہ عامرہ صفحہ ۳۶۷ مجمع الفصحا جلد ا صفحہ ۴۳۹ براؤن جلد ۲ صفحہ ۱۲۴ -

"کتابیست در معرفت بدائع شعر فارسی که آنرا ترجمان البلاغت خوانند بن بنده نمود بنگریستم شواہد این کتاب را ناخوش دیدم ہمہ از راہ تکلف نظم کردہ و بطریق تعسف فراہم آوردہ و با این ہمہ از انواع زلل و خلل خالی نہ بود۔"

۴۲۹ھ میں بزمانِ سلطان مسعود فرخی نے وفات پائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابوالمظفر چغانی کے بارے میں اکثر مؤرخین اور تذکرہ نویسوں سے غلطی سرزد ہوئی ہے۔ دولت شاہ نے اِس کا نام اِس طرح لکھا ہے۔" ابوالمظفر نصر بن ناصر الدین حاکم بلخ" مؤرخ فرشتہ اسے سلطان محمود کا برادر زادہ لکھتا ہے۔ میر غلام علی آزاد نے اس کا نام ناصر الدین چغانی بتایا ہے۔ والہ داغستانی اور لطف علی آذر سے بھی اِسی طرح کی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں حقیقت یہ ہے کہ ابوالمظفر کا نہ تو خاندان سبکتگین سے کوئی تعلق ہے اور نہ وہ بلخ کا والی رہا ہے۔ بلکہ اِس کا سلسلۂ نسب آل محتاج سے ملتا ہے۔ آل محتاج ماوراء النہر کے امیران کبار کا ایک خاندان ہے۔ ملوک سامانیہ اور غزنویہ کے زمانہ میں ان کو خوب عروج حاصل ہو گیا تھا۔ اور چغانیاں کی حکومت اِن کے خاندان میں بطور میراث چلی آتی تھی۔ ادب و تاریخ کے صفحات اُن کے حالات سے لبریز ہیں۔

ابوبکر محمد بن مظفر بن محتاج اس خاندان کا جدِ اعلیٰ ہے ۳۲۱ھ میں امیر نصر بن احمد سامانی نے اسے جمیع عساکر خراسان کا صاحب الجیش بنایا تھا۔ ۳۲۹ھ میں جب اس کا انتقال ہو گیا تو اِس کا لڑکا ابوعلی احمد بن محمد کو امیر نصر بن نصر نے اُس کے باپ کی خدمت پر بحال کر دیا۔ مشہور ادیب ابوالقاسم اِس کا کاتب تھا۔ ۳۳۳ھ میں کسی وجہ سے نوح بن نصر سامانی نے اسے معزول کر دیا تو اُس نے امیر کے خلاف بغاوت برپا کر دی اور ایک عرصہ تک اپنی موروثی حکومت کے لئے لڑائی جھگڑے کرتا رہا یہاں تک کہ ۳۴۴ھ میں اِس کا انتقال ہُوا۔ اِس کا لڑکا ابوالمنصور بن احمد بن محمد ابتدا میں اس کا نائب تھا۔ لیکن ابوعلی کی وفات پر امیر نوح نے اِسے باپ کی حکومت عطا کر دی۔ اِس کی وفات پر ابوالمظفر طاہر بن الفضل بن محمد بن المظفر جو ابوالمنصور کا چچا تھا برسرِ حکومت ہوا۔ طاہر بن فضل بڑا ذی علم اور ہنر پرور امیر تھا۔ شعر خوب کہتا تھا۔ بڑے بڑے شاعر دقیقی اور منجیک ترمذی وغیرہ اس کے دربار سے وابستہ تھے[1]۔ ۳۷۷ھ میں جب اُس کا انتقال ہوا تو ابوعلی کے لڑکے فخر الدولہ ابوالمظفر احمد بن

---

[1] عوفی جلد ا صفحہ ۲۷ و ۲۹

علی بن محمدؒ کو چغانیاں کی حکومت ملی۔ اسی کے زمانہ میں فرخی چغانیاں میں آیا تھا۔ اِس واقعہ کو نظامی عروضی سمرقندی نے چہار مقالہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

فرخی کو جب یہ معلوم ہوا کہ امیر ابو المظفر بڑا فیاض اور شعرا کا قدردان ہے تو سیستان سے نکل کر چغانیاں میں آیا۔ امیر نے افزایش نسل کے لئے اٹھارہ ہزار گھوڑیاں رکھی تھیں اور موسم بہار میں داغ گاہ میں جاکر اُن کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ امیر اس وقت داغ گاہ میں مقیم تھا۔ فرخی وہیں پہونچا عمید اسعد سے دربار میں پہونچانے کی خواہش کی عمید نے جب اُس کی شکل وصورت اور ظاہری حالت کو دیکھا تو اس کے شاعر ہونے کا اُسے مطلق یقین نہ آیا۔ اور امتحان کے لئے اِس سے ایک قصیدہ داغ گاہ کی تعریف میں لکھوایا جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

چوں پرند نیلگوں بر روئے پوشد مرغزار　　　پرنیانِ ہفت رنگ اندر سر آرد کوہسار

عمید نے جب قصیدہ سُنا تو حیران ہوگیا اور دوسرے روز اُسے امیر کی خدمت میں پیش کیا۔ فرخی نے تھوڑی دیر کے بعد بآواز حزیں اپنا ایک دوسرا قصیدہ امیر کو سُنایا جس کا مطلع یہ ہے ؎

باکارواں حلہ برفتم ز سیستاں　　　با حلۂ تنیدہ زدل بافتہ زجاں

امیر سخن شناس تھا۔ قصیدہ کو بے حد پسند کیا۔ اِس کے بعد فرخی نے وہ قصیدہ پڑھا جس میں داغ گاہ کی تعریف تھی۔ امیر کو سخت حیرت ہوئی۔ اور اسی عالم میں فرخی سے کہا کہ داغ گاہ میں ہزار بچھیرے ہیں اِن میں سے جس قدر تم پکڑ لو وہ سب تمہارے ہیں۔ فرخی اُٹھا۔ ایک عرصہ تک سرگرداں پھرتا رہا۔ لیکن اُسے ایک بچھیرے کے پکڑنے میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ دوسرے دن امیر نے فرخی کو بُلایا۔ ایک خاصہ کا گھوڑا تین اونٹ پانچ غلام اور پہننے کے کپڑے انعام عطا کئے اور بچھیروں کا وہ گلہ بھی اُسے دیدیا جن کے پکڑنے کے لئے فرخی ایک عرصہ سرگرداں رہا تھا۔

حکیم[۱] ابو نصر احمد بن منصور الاسدی[۲]۔ اسدی تخلص کے دو شخص گذرے ہیں۔ احمد بن منصور الاسدی اور

---

[۱] تا[۵] نفحا حوادث ۴۲۵ھ　[۲] فرشتہ جلد ۲ صفحہ ۳۲ دولت شاہ صفحہ ۳۵۔ آتشکدہ　مرآۃ الخیال صفحہ ۲۳ مجالس المومنین صفحہ ۵۰۰ مجمع الفصحا صفحہ ۱۰۷ براؤن جلد ۲ صفحہ ۳۵۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد ۲

علی بن احمد الاسدی۔ اِن میں پہلا باپ دوسرا بیٹا ہی۔ اِن کے حالات لکھنے میں فارسی تذکرہ نویسوں سے خاص غلطی ہوئی ہی۔ بلاامتیاز دونوں کو شخص واحد سمجھا ہے۔ اور اُن کے حالات باہم غلط ملط کردیئے ہیں۔

احمد بن منصور الاسدی۔ اِس کا سلسلہ قدیم شاہانِ ایران سے ملتا ہی۔ طوس کا باشندہ اور فردوسی کا اُستاد تھا۔ نیز فردوسی کی بہن بھی اس سے منسوب تھی۔ مدت تک سلطان محمود کے دربار میں رہا۔ اور سلطان مسعود کے عہد میں ۴۳۲؁ھ سے پہلے اِس کا انتقال ہوا ہی۔ اُس نے اپنے قصائد کے ابتدا میں بطور تمہید مناظرات لکھے ہیں۔ ان کے بعد مدح کی جانب گریز کرتا ہی۔ ان مناظرات کی علمی دنیا میں نہایت شہرت ہی۔ منجملہ ان کے پانچ مناظرون کے متعلق جن کے عنوان یہ ہیں۔ ارض وسما۔ لیل ونہار۔ قوس ورمح۔ عرب وعجم۔ گبر ومسلمان۔ ڈاکٹر ہرمن ایتھی (Ethe) نے ایک عالمانہ مضمون لکھکر نیشنل اورینٹل کانفرنس کی پانچویں اجلاس میں پیش کیا ہی جو ۱۸۸۱ء میں بمقام برلن منعقد ہوا تھا اور اس کی رویداد کے صفحہ ۴۸ میں چھپا ہی۔

علی بن احمد الاسدی کو ابتدا میں ملوک بویہ کے دربار سے تعلق تھا۔ پھر آذربائجان چلا آیا۔ اور ابو دلف کرکری رئیس اران کے مصاحبوں میں شامل ہوگیا۔ اُس کے وزیر کی فرمایش سے شاہنامہ کے جواب میں گرشاسپ نامہ لکھا ہی۔ چنانچہ دیباچہ میں کہتا ہی ؎ (صفحہ ۸)

بمن گفت فردوسی پاک مغز	بداد است داد سخنہائے نغز
بہ شہنامہ گیتی بیاراستہ است	وزاں نام نامِ نکو خواستہ است
تو ہم شہری او ور او ہم پیشہ	چو او در سخن چابک اندیشہ
ازاں ہمرہاں نامۂ باستاں	بہ نظم آر خرم یکے داستاں

گرشاسپ نامہ ۴۵۸؁ھ میں اختتام کو پہونچا ہی۔ اور اِس کا ایک نسخہ خود اسدی کے ہاتھ کا لکھا ہوا وینا کی امپریل لائبریری میں محفوظ ہے[1]۔ یہ کتاب نہایت کمیاب اور غیر معروف ہی۔ بعضوں نے اِس کو فردوسی کی تصنیف سمجھکر شاہنامہ میں ملحق کردیا۔ ٹرنر میکن نے بمقام کلکتہ جو شاہنامہ چھپوایا ہی۔ اُس کی جلد چہارم میں یہ الحاقی حصہ بطور ضمیمہ موجود ہی۔

لغت فرس علی اسدی فارسی لغت کا سب سے پہلا مدون ہی۔ اِس نے اپنی کتاب میں نادر اور غریب الفاظ جمع

---

[1] اس کے متعلق اِس رسالہ کا پہلا مضمون ملاحظہ ہو۔ (اڈیٹر)

کئے ہیں۔ اور بالالتزام ہر لفظ کے ساتھ اساتذہ کے اشعار کو بطور شواہد نقل کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۰۹ء میں بمقام گوٹنگن چھپی ہے۔

اکثر تذکروں میں لکھا ہے کہ فردوسی[1] جب غزنین سے نکلا تو شاہنامہ ناتمام تھا۔ اور جب اُس کا وقت رحلت قریب آیا تو اس نے اسدی کو بلا کر شاہنامہ کو مکمل کرنے کی خواہش کی۔ پس زیدی نے چار ہزار بیت میں تسلط عرب بر عجم کے حالات کو بیان کر کے کتاب کو ختم کر دیا۔ حقیقت میں یہ ایک فرضی کہانی ہے۔ کیوں کہ فردوسی تصنیف شاہنامہ کے بعد مدت تک زندہ رہا ہے۔ اس کے بعد عراق میں جا کر مثنوی یوسف زلیخا لکھی ہے۔ ایسی حالت میں یہ امر بعید از قیاس ہے کہ شاہنامہ کو فردوسی ناتمام رکھتا۔ اور اسدی سے اس کو مکمل کراتا۔

ابوسعید احمد بن محمد المنشوری[2]۔ سمرقند کا باشندہ ہے۔ سلطان محمود کے درباری شعرا میں شامل تھا۔ رشید الدین وطواط نے حدایق السحر میں لکھا ہے کہ اس نے صنعت تلون کو مختصر کیا ہے۔ اور خورشیدی نے اس کی شرح لکھی ہے جس کا نام کنز الغرائب ہے۔ صنائع لفظیہ میں تلون اس صنعت کو کہتے ہیں کہ ایک شعر دو بحر یا زیادہ میں پڑھا جائے۔

اُستاد ابوالحسن علی البہرامی[3]۔ سرخس کا باشندہ ہے۔ فن عروض و قافیہ میں سرآمد روزگار رہا ہے۔ عوفی نے اُس کے حالات میں لکھا ہے کہ

"او را در علم شعر و معرفت آں مہارتے کامل بود خجستہ نامہ کہ در علم عروض بے نظیر است از مشئات اوست۔ بہرامی نے شعر فارسی کے متعلق کئی کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً غایت العروضین کنز القافیہ خجستہ نامہ وغیرہ یہ کتابیں اس وقت ناپید ہیں۔ شمس الدین قیسی نے انھیں دیکھا تھا۔ اور اپنی کتاب المعجم فی معائیر اشعار العجم کی تالیف میں اُن سے استفادہ کیا ہے۔"

بہرامی نے ۵۰۰ھ ۱۱۰۶ء میں وفات پائی ہے۔ عوفی نے اس کو محمودی شعرا میں شمار کیا ہے۔ صاحب مجمع الفصحا کا بیان ہے۔ کہ ناصر الدین سبکتگین کا معاصر تھا۔ لیکن یہ صریح غلطی ہے۔ کیوں کہ سبکتگین نے ۳۸۷ھ ۹۹۷ء میں وفات

---

[1] تذکرہ دولت شاہ [2] چہار مقالہ صفحہ ۳۵ عوفی جلد ۲ صفحہ ۴۴ حدایق السحر ورق ۱۱ مجمع الفصحا جلد ۱ صفحہ ۵۰۷

[3] چہار مقالہ صفحہ ۳۵ و ۴۳ عوفی جلد ۲ صفحہ ۵۵، ۵۷ لغات اسدی صفحہ ۱۲ مجمع الفصحا جلد ۱ صفحہ ۱۷۳

پائی ہی۔ اور بہرامی اُس کی وفات کے قریباً ایک سو تیرہ سال بعد ۵۰۰ھ ۱۱۰۶ء میں فوت ہوا ہی۔

امیر بزرجمہر ابوالمنصور قسیم بن ابراہیم بن منصور قاینی[1] سلطان محمود اور مسعود کے زمانہ میں گذرا ہی۔ ذی ثروت اور دولت مند امیر تھا۔ عربی فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتا تھا۔ فارسی کلام عوفی نے نقل کیا ہی۔ عربی قصاید جو سلطان محمود کی مدح میں ہیں اُن کے بعض انتخاب امام ثعلبی کی کتاب تتمۃ الیتیمہ میں مذکور ہیں۔

محمد بن محمود البدائعی[2] بلخ کا باشندہ ہی۔ سلطان محمود کی فرمایش سے اُس نے وزن تقارب میں نصیحت نامہ نوشیرواں کو منظوم کیا ہی۔ یہ کتاب اِس وقت کمیاب ہی۔ صاحب مجمع الفصحا نے اِس کے متفرق اشعار نقل کئے ہیں۔

---

[1] چہار مقالہ صفحہ ۳۵ - عوفی جلد ۱ صفحہ ۳۳ - مجمع الفصحا جلد ۱ صفحہ ۶۶ [2] مجمع الفصحا جلد ۱ صفحہ ۱۷۴

خطباتِ گارساں دتاسی

(مترجمہ جناب سید راس مسعود صاحب بی اے (آکسن) آئی ای ایس ۔ ناظم تعلیمات حیدرآباد (دکن))

(تیسرا[1] خطبہ ۔ بتاریخ ۵ ر دسمبر ۱۸۵۲ء)

حضرات !

لفظ " ہندوستانی " اُس زبان کے حق میں جس کے لئے یہ استعمال کیا جاتا ہے ناموزوں ہے اور اُسے اس نام سے یاد کرنا ہماری بدمذاقی ہے البتہ اس کو ہندوستانیں (Hindustaniens) کہا جاسکتا ہے ۔ مگر انگریزوں کی تقلید میں ہم نے بھی اس کی ابتدائی شکل قائم رکھی جیساکہ نام سے ظاہر ہے ہندوستانی اہل ہندوستان کی زبان ہے مگر یہ زبان اپنی حقیقی حدود سے باہر بھی بولی جاتی ہے خصوصاً مسلمان اور سپاہی اس کو تمام جزیرہ نما ہندوستان نیز ایران تبت اور آسام میں بھی بولتے ہیں ۔ پس اس زبان کے لئے لفظ " ہندی " یا " انڈین " جو ابتدا میں اس کو دیا گیا تھا اور جس نام سے کہ اکثر باشندے اس ملک کے اب تک اس کو موسوم کرتے ہیں اس نام سے زیادہ موزوں ہے جو اہل یورپ نے اختیار کیا ہے ۔ اہل یورپ لفظ ہندی سے ہندوؤں کی بولی مراد لیتے ہیں جس کے لئے " ہندوی " بہتر ہے اور مسلمانوں کی بولی کے واسطے " ہندوستانی " کا نام قرار دے لیا ہے ۔ خیر یہ جو کچھ بھی ہوا ، ہندوستانی اس جدید زبان کی دو بڑی اور خاص شاخیں برٹش انڈیا کے بڑے حصّے میں بولی جاتی ہیں اور شمال کے مسلمانوں کی زبان یعنی ہندوستانی اُردو ممالک مغربی و شمالی کی سرکاری زبان قرار دی گئی ہے ۔ اگرچہ ہندی بھی اردو کے ساتھ ساتھ

[1] سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ ماہ جنوری ۲۳ء

اسی طرح قائم ہے جیسے کہ وہ فارسی کے ساتھ تھی ۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمان بادشاہ ہمیشہ ایک ہندی سکرٹری جو ہندی نویس کہلاتا تھا اور ایک فارسی سکرٹری جس کو وہ فارسی نویس کہتے تھے رکھا کرتے تھے تاکہ اُن کے احکام ان دونوں زبانوں میں لکھے جائیں اسی طرح برٹش گورنمنٹ ممالک مغربی وشمالی میں ہندو آبادی کے مفاد کے لئے اکثر اوقات سرکاری قوانین کا اردو کتابوں کے ساتھ ہندی ترجمہ بھی دیو ناگری حروف میں دیتی ہے ۔

حضرات ! میں نے اس سے قبل آپ کے سامنے کئی مرتبہ ہندوستانی علم ادب اور اس کی مختلف شاخوں کی نسبت تقریر کی ہے ۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس زبان کی تاریخ کی پہلی جلد میں میں نے ۰ ۵ ے مصنفوں اور آٹھ سو سے زیادہ کتابوں کا ذکر کیا ہے ۔ اس کی تیسری جلد میں جس کے طبع ہونے میں بعض وجوہ سے تاخیر ہوگئی ہے ، میں اس سے دو چند جدید مصنفوں کا اور اسی قدر کتابوں کا احوال لکھوں گا ۔ دیسی سوانح نویس عموماً صرف ان لوگوں کے چند اشعار لکھ دینے پر اکتفا کرتے ہیں جن کی سوانح عمری وہ لکھ رہے ہیں اور اُن کی خاص خاص تصانیف اور تالیفات کا ذکر نہیں کرتے ۔

اس وقت میں ان بیشمار مصنفیں میں سے صرف تین کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جن کے متعلق میں نے اطلاع بہم پہنچائی ہے ۔ یہ تینوں صاحب دہلی کالج کے پروفیسر ہیں ۔ جہاں کا صدر یعنی پرنسپل بارہ سال سے ایک مشہور فرانسیسی فیلیکس بوترو (M. Felix Boutros) ہے ۔ صدر مذکور "ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی" (یعنی انجمن ترجمہ) کے بانیوں میں سے ہیں ۔ اور اسی انجمن نے سنسکرت فارسی عربی اور انگریزی زبانوں سے ترجمے کرکے ہندوستانی زبان کی بڑی خدمت کی ہے ۔

مذکورہ بالا اصحاب میں سے پہلے شخص رام چندر ہیں جن کے عیسائی مذہب قبول کر لینے پر (اور کہا جاتا ہے کہ دہلی کے یہ پہلے ہندو ہیں جنھوں نے یہ مذہب اختیار کیا) اس سال کے ماہِ جولائی میں خاصی ہلچل مچ گئی تھی ۔ اس پنڈت کی عمر اس وقت ۳۰ سال کی ہے ۔ یہ شخص دہلی کالج کا طالب علم تھا ۔ اور اس کالج میں اس نے انگریزی ، ہندوستانی اور فارسی زبانوں کو حاصل کیا تھا ۔ لیکن علم ریاضی کی طرف اس کا خاص رجحان تھا ۔ وہ متعدد مفید کتابوں کا مصنف اور مترجم ہے جن میں سے ایک الجبرا ہے جو (Bridge and Colenso) کی

تقلید میں لکھا گیا ہے۔ ایک کتاب علم مثلث پر ہے جس میں مخروطات بھی شامل ہیں ۔ Analytical
(Trignometry with conic sections -) اور ایک کتاب علم ہندسہ پر ہے جو Hutton & Bourdhorlat کے طریقہ پر مرتب کی گئی ہے۔ ایک کتاب علم الحساب پر لکھی ہے اور ان کے
علاوہ کئی کتابیں ادب پر ہیں۔ یہ پروفیسر دو رسالوں کے اڈیٹر بھی ہیں اُن میں سے ایک خاص طور قابل ذکر
ہے جس کا نام "محبوب ہند" ہے یہ ایک ماہانہ پرچہ ہے جس میں اہم مسائل و معاملاتِ وقت پر دیسیوں کی تعلیمی حالت
پر اور مشترکہ ادب یعنی ہندوستانی زبان کی ترقی پر مضامین لکھے جاتے ہیں۔

دوسرے صاحب جن کی طرف میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں رام کرشن ہیں یہ زبردست صوفی عالم اور
انگریزی ادب میں ایسے ہی قابل ہیں جیسے رام چند۔ یہ کشمیری النسل اور دہلی کے رہنے والے ہیں۔ ان کی عمر
قریب چالیس سال ہے۔ انھوں نے بہت سے مضامین انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کئے ہیں جن کی عبارت نہایت
فصیح اور شستہ ہے۔ چند اُن میں سے یہ ہیں۔ دی پرنسپلس آف ہندو لا (اصول ہندو شاستر) مصنفہ سر ولیم میکناٹن
کا ترجمہ۔ یہی وہ صاحب ہیں جو عربی (الف لیلہ) کے اڈیٹر ہیں اور افغانوں اور انگریزوں کی گذشتہ لڑائی میں
بمقام کابل مقتول ہوئے۔ ترجمۂ اصول حکومت (دی پرنسپلس آف گورنمنٹ) کے علاوہ بھی قانون پر اُن کی کئی
تالیف ہیں۔ نیز دوسرے فنون میں بھی چند کتابیں لکھی ہیں مثلاً فن زراعت پر طب پر اور ایک انگریزی گرامر
ہندوستانی زبان میں جس کے لکھنے میں انھیں ڈاکٹر اسپرنگر (Sprenger) نے بھی مدد دی ہے
ڈاکٹر اسپرنگر اُس وقت دہلی کالج کے پرنسپل تھے۔ آج کل فورٹ ولیم کالج میں ممتحن اور ایشیاٹک سوسائٹی آف
بنگال کے سکرٹری ہیں۔ اُن میں سے تیسرے صاحب کریم الدین ہیں۔ یہ پانی پت کے رہنے والے اور
جیسا کہ اُن کے نام سے ظاہر ہے مسلمان ہیں تقریباً ۱۸۱۲ء میں دہلی کالج میں شریک ہوئے اس وقت اُن کی
عمر ۹ ۵ سال کی ہے اُن کی تمام تالیفات نثر میں ہیں اُن کو اس بات پر فخر ہے کہ انھوں نے کبھی کوئی نظم
نہیں لکھی۔ انھوں نے بہت بُرا بھلا کہا ہے کہ لوگوں نے ہندوستان میں شاعری کو پیشہ بنا لیا ہے۔ اُن کی کتابوں
میں بعض جدید تصانیف ہیں بعض ترجمے اور بعض تالیفات۔ پہلی صنف میں حسب ذیل کتابیں ہیں: ایک کتاب عورتوں
کی تعلیم پر جس کے متعلق ہندوستان میں بہت غفلت کی جاتی ہے۔ ایک سوانح عمری ایشیا اور افریقہ کی مشہور

عورتوں کی - اور ایک کتاب عروض پر جو بہت مشہور ہوئی - دوسری صنف میں یہ کتابیں ہیں ابوالفدا کی تاریخ کا ترجمہ - ہندوستانی شاعروں کا تذکرہ اور عرب کے شاعروں کی تاریخ - تیسری صنف میں یہ کتابیں ، ہندوستانی (اردو) کے اساتذہ کے کلام کا انتخاب - ایک کتاب وراثت پر جو اسلامی شریعت میں نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے - علوم عملی (Exact sciences) پر ایک مختصر رسالہ اور دلچسپ مقولوں اور لطیفوں کی ایک کتاب جس کا نام "باغ ہند" ہے -

۱۸۵۰ء کی طرح ۱۸۵۱ء میں بھی ہندوستانی مطابع ممالک مغربی وشمالی میں برابر کام کرتے رہے - اس زمانہ میں ہندی اور اردو رسالے اور بہت سی کتابیں شائع ہوئیں - اس سال پھر میرے پاس بعض دوستوں کی عنایت سے نئے مطبوعات کی فہرست پہنچ گئی ہے -

حضرات ! میں آپ کے سامنے ابتدائی رسالوں یا جو قدیم اساتذہ کی تصانیف یا مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کا جو دوبارہ یا بار بار چھپتی رہتی ہیں ، ذکر نہ کرونگا - اگرچہ اسلامی مذہبی کتب میں سے قرآن شریف معہ اردو ترجمہ کے ایک دہلی کا اور دوسرا آگرہ کا قابل لحاظ ہے - لیکن مذکورہ ذیل کتابیں خاص طور پر قابل بیان ہیں - "تاریخ آگرہ" جو محمد سدیدالدین نے اردو میں لکھی ہے - "بہار عشق" مولفہ نور علی یہ کتاب نل کا قصہ معلوم ہوتی ہے - "قصہ گرو چیلا" یہ قصہ کلیلہ دمنہ کے قصہ کے طرز پر لکھا گیا ہے - "قصہ سپاہی زادہ" "دیوان نوید" ایک مشہور ہمعصر شاعر کا دیوان - "دیوان نظیر" جو اب تک کامل نہیں چھپا تھا - گلستاں کا ہندوستانی ترجمہ جو پہلی مرتبہ فارسی متن کے ساتھ طبع ہوا ہے - ایک تاریخی نظم فاتحانِ ہندوستان پر معہ انگریزی ترجمہ کے یہ کتاب شہنشاہِ دہلی کے حکم سے شاہی شاعر مہاراجہ اپروا کرشن بہادر نے لکھی تھی - یہ شاعر اگرچہ ہندو تھا - مگر بجائے ہندی میں لکھنے کے جو عام طور پر ہندوؤں کی زبان ہے - اُس نے اردو میں لکھی - آخر میں ایک قصہ قابل بیان ہے - جو علم الاقوام کے نقطۂ نظر سے موجب دلچسپی ہے اور ٹھیٹ ہندوستانی میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش کے بغیر لکھا گیا ہے - اس کے لکھنے والے انشاء اللہ خاں تھے جو اسی صدی کے ابتدا میں ایک مشہور شاعر گذرے ہیں یہ قصہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے ایک رسالہ میں طبع ہوا ہے -

ہندی کی صرف اِن کتابوں کے بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔ اخلاقی مقولے موسوم بہ "نتی بنود"
ہندو مہاجنوں کے لئے ایک کتاب جس کا نام "مہاجنی سروپکا" ہے ہندی مطبوعات میں جن کی اشاعت
کی اس سال اطلاع دی گئی ہے، وید کے کامل ترجمے خاص طور پر قابل بیان ہیں جس کے ساتھ اصل سنسکرت بھی ہوگی
حضرات! مجھے اُمید ہے کہ میرے لکچر ہندوستان کی جدید زبان کے علمی اور ادبی مطبوعات کے پڑھنے
میں کافی طور پر رہنمائی کریں گے۔ میری تعلیم کا طریقہ جو میں نے اختیار کیا ہے، وہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے
تفصیلی ہے۔ میں ہر لفظ کی تشریح کرتا ہوں اور متن کے معنی و مطالب کے ساتھ ساتھ نحوی قواعد پر بھی نظر ڈالتا
جاتا ہوں اور ہر محاورے کا تجزیہ کرتا ہوں۔ میری دانست میں یہی ایک طریقہ اصلی اور صحیح ترقی کرنے کا ہے۔
ہم اس سال شیر شاہ کی تاریخ کے اُس حصہ کو ختم کریں گے جو گذشتہ سال ختم کیا گیا تھا۔ شیر شاہ افغانوں کا
کیخسرو ([illegible]) تھا جو اگرچہ ابتدا میں ایک گورنر تھا مگر اپنی قابلیت، اپنے کیرکٹر اور اپنے
انصاف و عدل کی وجہ سے تخت دہلی پر قابض ہو گیا۔ ابھی وہ بہت کم عمر تھا کہ اُس کے والد نے اُسے
اپنے علاقہ کے ایک حصہ کا انتظام سپرد کیا۔ والد سے رخصت ہوتے وقت اُس نے یہ الفاظ کہے "ابا جان!
مجھے اجازت دیجئے کہ میں جناب سے اپنے دلی خیالات کا صاف صاف اظہار کروں۔ میری خواہش ہے کہ
میں اس ملک کی زراعت کی ترقی میں کوشش کروں جس کو آپ نے میرے سپرد کیا ہے اور اس کی فلاح و
بہبودی میں کوشاں رہوں۔ مگر میں اپنے مقصد میں اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں
ہر معاملہ میں عدل و انصاف سے کام نہ لوں۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ عدل اعلیٰ ترین نیکی ہے اسی سے سلطنتوں
کی وسعت اور استحکام ہی۔ اور اسی سے خزانہ مالا مال اور شہر اور قصبے آباد و خوش حال ہوتے ہیں۔ ظلم اس کے برعکس ہی
اور بدترین عیوب میں سے ہے یہ تباہی و بربادی کا موجب ہوتا ہی اور جو اس کا مرتکب ہوتا ہی وہ دنیا و عاقبت
میں ذلیل و رسوا ہوتا ہے۔ پس ہر بادشاہ کا فرض ہی کہ اپنی رعایا سے مہربانی سے پیش آئے اور اُن کی خبر گیری کرے
کیونکہ خدا نے رعایا کو بادشاہوں کی پناہ میں دیا ہے جن کا فرض ہے کہ اُن کو ظلم و استبداد سے بچائیں اور
اُن کو خوش رکھیں۔ اس کے حصول کے لئے کامل عدل و اعلیٰ انتظام ضروری ہے۔ عمدہ حکومت کے نہ ہونے سے
بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور رعایا کے حقوق تلف ہوتے ہیں۔ اچھی حکومت کی مثال اُس بارش کی سی ہے

جو زندگی بخشتی ہے اور بغاوت کے گرد و غبار کو دبا دیتی ہے اور وہ اس تلوار کی مانند ہے جس کے جوہر کا عکس سلطنت کے رخسار پر پڑتا ہے اور اس کو مثل آفتاب کے منور کر دیتا ہے۔

میں اس امر سے ناواقف نہیں ہوں کہ بعض عہدہ دار جو میرے ماتحت کام کے لئے تجویز کئے گئے ہیں ظلم اور سختی کو جائز رکھتے ہیں۔ میں سب سے اوّل اُن کو نرمی سے متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ میرے کہنے پر عمل کریں گے تو مجھے سختی نہیں کرنی پڑے گی لیکن اگر کچھ ایسے ہوں گے جن میں یہ خرابی اس درجہ سرایت کئے ہوئے ہے کہ وہ اُن سے نہیں چھوٹ سکتی تو میں سختی میں کوتاہی نہ کروں گا اور اُن کو ایسی سزا دوں گا جو دوسروں کے لئے باعث عبرت ہوگی۔ جب بدنظمی پھیلانے والے بدطینت لوگ سلطنت کی آگ کو شعلہ زن دیکھتے ہیں تو چھپے رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے جب انھیں ذراسی بھی بدنظمی انتظام مملکت میں نظر آتی ہے تو ہر جگہ فساد پیدا کرتے ہیں اور حکومت کی عمارت بہت جلد شکستہ ہو جاتی ہے۔ حکیموں نے کہا ہے کہ مملکت مانند ایک درخت کے ہے جس کی جڑوں کی آبیاری ہمیشہ اچھے نظم و نسق سے کرنی چاہیئے تاکہ وہ امن و امان اور اطمینان کے ثمر سے بار آور ہو۔ ...."

حضرات ! میں اس سال پریم ساگر کی بھی تشریح کروں گا۔ پریم ساگر ایک کہانی ہے جو مسجع اور مقفیٰ عبارت میں لکھی گئی ہے اور جگہ جگہ اس میں نظم بھی آتی ہے۔ یہ کہانی کرشن جی کے حالات سے متعلق ہے اور بھاگوت کے دسویں باب سے ماخوذ ہے۔ اسی " پران " کے ترجمہ کے طبع کا کام ایک مشہور ہندی کے عالم نے اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ وہ اسی دسویں باب تک پہونچا تھا کہ موت نے علم و ادب کے اس سرمایۂ ناز کو ہم سے چھین لیا۔ لیکن ایک اور کتاب جو ہندی نظم میں ہے اور اسی دسویں باب کے تتبع میں لکھی گئی ہے اور پریم ساگر سے بھی قدیم ہے۔ فرانسیسی زبان سے حال میں (M. Th. Pavie) موسیو تھامس بے دی نے طبع کرائی ہے۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ موسیو موصوف میرے شاگردوں میں ہیں۔ اس کا نام "کرشن جی اور اُن کی تعلیم" ہے۔ اسے یوجین بورنوف کی کتاب کا تتمہ سمجھنا چاہیئے۔

پریم ساگر ایک نہایت دلچسپ افسانہ ہے جو معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰؑ کی مقدس تاریخ سے لیا گیا ہے۔ اس کے ہر صفحہ میں عیسائی مذہب کے واقعات کا مبہم سا اعادہ نظر آتا ہے لیکن اتنا فرق ہے کہ وہ سچ ہے اور یہ غلط۔

اور اسی لئے یہ کتاب تناقضات اور اضداد سے بھری ہوئی ہے۔ کرشن جی کی تاریخ اگرچہ مشرقی تخیل کے عجائبات سے پُر ہے اور غیر مسیحی اخلاقی خرابیوں نے اُسے خراب کر دیا ہے۔ تاہم عیسیٰ مسیح کی تاریخ سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ یہ وہ بات ہے جسے میں نے اپنی ایک تصنیف میں نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور اگرچہ میرا یہ خیال عیسائی ہونے کی بنا پر تھا مگر میں نے دیکھا کہ یہ مقابلہ مذہبی احساسات کو صدمہ پہونچانے کے بجائے کتاب کی وقعت کو اور بڑھا دے گا۔ مجھے یہ بات بہت دلچسپ معلوم ہوئی کہ کرشن جی کی زندگی کے حالات عیسیٰ مسیح کے حالات کی صدائے بازگشت ہیں اور اس کی تعلیم عیسائی مذہب کے اصول کا ایک عکس ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عیسائی مذہب ہندوستان میں بہت پہلے پھیل چکا تھا جیسا کہ ہماری مذہبی روایتوں سے بھی ظاہر ہے۔ سینٹ فرانسیس زیویر جو پیرس یونیورسٹی کا مشہور طالب علم تھا اور "انڈیز کے بشر" کے لقب سے مشہور رہے، جب کوچین اور ٹراونکور کے ساحلی قصبوں میں مذہب عیسائیت کی تبلیغ کے لئے پہونچا تو اُس نے وہاں کے اصلی باشندوں کو عیسائی مذہب کا پیرو پایا۔ جن کو اس زمانہ کے وقائع نویسوں نے "بروا" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اُسی نے مقام میلا پور میں سینٹ تھامس کی قبر بھی دیکھی۔ یہاں میں اس بات کا اشارہ بھی کرنا چاہتا ہوں کہ صوبہ بیجا پور میں جس کے بڑے شہروں میں گوا بھی ہے سینٹ مذکور کو ہندوستان کی دکنی بولی میں وعظ کرنا پڑا ہوگا۔ یہ بولی بیجا پور میں اسی طرح مروج ہے جس طرح مرہٹی۔

(چوتھا خطبہ ۔ بتاریخ ۲۹ نومبر ۱۸۵۳ء)

حضرات! ہندوستانی زبان، جیسا کہ آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے، صرف بول چال ہی میں استعمال نہیں ہوتی بلکہ اس ملک میں روز بروز تحریر کے کام میں بھی ترقی کرتی جاتی ہے جسے ہم انڈیا (ہندوستان) کہتے ہیں جو وسعت میں اسی قدر بڑا ہے جس قدر براعظم یورپ۔ اسی طرح اس کا علم ادب ترقی کر رہا ہے اور اچھی اچھی تالیفات و تصنیفات سے مالامال ہو رہا ہے۔

۱۸۵۱ء سے نئے سنگی مطبع قائم ہوئے ہیں جہاں سے دلچسپ کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ نئے رسالے

اور اخبار بھی جاری ہوئے ہیں اور پرانے تقریباً سب کے سب زندہ ہیں۔

اس اطلاع کی بنا پر جو میرے دوستوں اور ایک انگریزی اخبار (فرینڈ آف انڈیا) نے اپنی عنایت سے مجھے بہم پہنچائی ہے میں ممالک مغربی و شمالی کے ان مطابع کے متعلق صحیح تفصیل آپ کے سامنے بیان کرسکتا ہوں جو ۱۸۵۲ء کے آغاز میں وہاں جاری تھے۔ ممالک مغربی و شمالی رقبے میں فرانس سے دوچند ہیں اور وہاں کی زبان ہندوستانی ہے، خواہ اردو ہو یا ہندی۔ افسوس ہے کہ میں آپ کو راجپوتانہ، دکن، اودھ اور انگریزی احاطوں کے تینوں دارالحکومتوں کے متعلق کوئی نئی بات نہیں بتاسکتا۔ تاہم جو جزوی تفصیل میں آپ کے سامنے پیش کروں گا اس سے آپ اس ادبی تحریک کا اندازہ کرسکیں گے جو اس زبان کے ذریعہ سے جس کے حاصل کرنے کے لئے آپ یہاں آئے ہیں، ہندوستان میں حقیقی طور پر ظاہر ہورہی ہے نیز آپ بھی قیاس کرسکینگے کہ زمانہ دراز سے اس نے ایک حیثیت اور اہمیت حاصل کرلی ہے۔

۱۸۵۲ء کے آغاز میں ممالک مغربی و شمالی کے پندرہ شہروں میں ۴۱ سنگی مطبع تھے جن میں ہندوستانی مطبوعات شائع ہوتی تھیں اور ۱۳ ہندوستانی رسالے اور اخبار تھے۔ مطبعوں کی تفصیل یہ ہے۔ (۷) آگرہ میں (۶) دہلی میں (۲) میرٹھ میں (۲) لاہور میں (۷)، بنارس میں اور ایک ایک سردھنے۔ بریلی۔ کانپور۔ مرزا پور اندور۔ لدھیانہ۔ بھرت پور۔ امرتسر اور ملتان میں۔

ان مطبعوں سے مفصلہ ذیل ہندوستانی اخبار شائع ہوتے ہیں:۔ آگرہ سے "مطبع الاخبار" جو شہر آگرہ میں خوب بکتا ہے "اخبار الحقائق" جو ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا ہے اور "اسد (اسعد) الاخبار" جو ہفتہ میں ایک بار نکلتا ہے۔ ایک اور اخبار اسی شہر سے نکلتا ہے جس کا نام "قطب الاخبار" ہے جس میں مذہب اسلام کے متعلق بحث ہوتی ہے اس میں اخبار (احادیث) اسلام۔ انبیاء۔ شہدا اور اولیائے اسلام کے حالات شائع ہوتے ہیں اور قدیم مصنفین کی کتابوں میں سے اقتباسات بھی درج کئے جاتے ہیں۔ "معیار الشعرا" ایک ادبی رسالہ ہے جس میں قدیم وجدید شعرا کا کلام درج ہوتا ہے۔

"اخبار النواح" (؟) پہلے ایک علمی پرچہ تھا۔ مگر اب معمولی خبروں کا اخبار ہے۔ "آگرہ گورنمنٹ گزٹ" کا ذکر بھی مناسب خیال کرتا ہوں۔ یہ سرکاری اخبار ہے اور ہندوستانی اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع

ہوتا ہے۔ اب اگر ہم دلی کی طرف رجوع کریں تو وہاں "سراج الاخبار" جو اس شہر کا سب سے پرانا اخبار ہے "دہلی اردو اخبار" اردو میں چھپتا ہے۔ "مظہر الحق" کے اڈیٹر ایک صاحب محمد علی ہیں جن کی اسی نام کی ایک تالیف ہے جس میں مذہب اسلام کی مختلف رسموں کا ذکر ہے۔ "قران السعدین" ایک باتصویر اخبار ہے جس میں سائنس، ادب اور سیاست سے بحث ہوتی ہے اس کے چند نمبر جو میرے پاس آئے ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتصویر رسالہ ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنے ہم وطنوں میں مغربی معلومات کو شایع کرے۔ اس میں خبریں بھی چھپتی ہیں۔ ہفتہ میں ایک بار پیر کے روز شائع ہوتا ہے اور ایک ماہانہ رسالہ بھی جس کا نام "فوائد الناظرین" ہے۔ اس میں علاوہ خبروں کے مضامین بھی چھپتے ہیں جو انگریزی ذرائع سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ "دقیق الاخبار" ہندوؤں کا ہے۔

میرٹھ میں دو ہندوستانی اخبار ہیں۔ ایک "مفتاح الاخبار" جس کے اڈیٹر محبوب علی ہیں۔ انھوں نے ہندوستانی لغت اللغات کا خلاصہ بھی لکھا ہے جو لکھنؤ میں ۱۸۴۷ء میں طبع ہوا دوسرا "جام جہاں نما" ہے یہ جمشید کے اُس پیالے کی طرف اشارہ ہے جس کی تہ میں وہ دنیا کے تمام واقعات جو گزرتے تھے معلوم کر لیتا تھا۔ اس اخبار میں علاوہ معمولی خبروں کے سرکاری گزٹ اور ممالک مغربی وشمالی کی عدالت عالیہ (سوپریم کورٹ) کے فیصلوں کے اقتباسات بھی درج ہوتے ہیں اس کے ساتھ ایک ورق بطور ضمیمہ کے شایع ہوتا ہے جس میں فیضی کی مہابھارت کا فارسی ترجمہ شایع ہوتا ہے یہ ضمیمہ اخبار کے خریداروں کو مفت نذر کیا جاتا ہے

بنارس میں چھ ہندوستانی اخبار ہیں۔ ان میں سے دو اخباروں کا ایک ہی اڈیٹر ہے۔ ایک ہندی یعنی دیوناگری حروف میں دوسرا اردو یعنی فارسی حروف میں شایع ہوتا ہے۔ پہلے کا نام "بنارس اخبار" ہے۔ سُنا ہے کہ راجہ نیپال سے امداد ملتی ہے جن کی رانی بنارس میں ہے۔ بہرحال اڈیٹر جو ایک پرجوش ہندو ہے ان دونوں اخباروں میں وہ عیسائی مشنریوں کے خلاف ہندو مذہب کی پرزور حمایت کرتا ہے۔ بنارس کا تیسرا ہندوستانی اخبار "سدھاکر اخبار" ہے یہ اخبار جو انگریزی حکومت کو اچھا سمجھتا ہے پہلے ہندی اردو دونوں زبانوں میں نکلتا تھا مگر اب صرف ہندی میں شایع ہوتا ہے اس کی ہندی دقیق اور سنسکرت کے الفاظ سے بھری ہوتی ہے۔ اس کی اشاعت صرف تعلیم یافتہ ہندوؤں تک محدود ہے۔ چوتھا اخبار "باغ وبہار" ہے جس کا نام اسی نام کی مشہور کتاب پر

رکھا گیا ہے۔ یہ مہاراجہ بنارس کی سرپرستی میں نکلتا ہے۔ مہاراجہ جدید ادب کے بڑے مربی ہیں اور بہت سی کتابیں انھوں نے اپنے خرچ سے چھپوائی ہیں اور خود بھی ہندوستانی اور فارسی کے شاعر ہیں۔ پانچواں اخبار "سائرین ہند" (؟) ہے یہ دو ہفتے میں ایک بار چھوٹی تقطیع کے آٹھ صفحوں پر چھپتا ہے اور ہر صفحہ میں دو کالم ہوتے ہیں علاوہ معمولی خبروں کے جو کسی قدر تفصیل سے لکھی جاتی ہیں اس میں مختلف قسم کے مضامین ہوتے ہیں۔ چھٹا اخبار "بنارس ہرکارا" ہے جو ۱۸۵۸ء سے اب تک نکل رہا ہے۔

بریلی سے "عمدۃ الاخبار" شایع ہوتا ہے اس کے اڈیٹر لکشمن پرشاد ہیں۔ انھوں نے چھوٹی سی علمی اور اخلاقی سائکلو پیڈیا بھی لکھی ہے اور اس کا نام مشرقی طرز پر "دماغی تفریح" (؟) رکھا ہے۔

مرزا پور سے "خیرخواہ ہند" نکلتا ہے یہ امریکی پروٹسٹنٹ مشنریوں کا اخبار ہے اور اس کا مقصد تبلیغ مذہب ہے۔

"شملہ اخبار" شملہ سے شائع ہوتا ہے یہ بہت اچھا اخبار ہے جسے آج کل شیخ عبداللہ مرتب کرتے ہیں یہ انگریزی ہندوستانی دونوں سے واقف ہیں۔ ہندوستانی ان کی مادری زبان ہے۔

اندور کا اخبار۔ جو مالوہ کا دارالحکومت ہے "مالوہ اخبار" ہے۔ یہ آٹھ صفحوں کا ہفتہ واری ہے۔ اس کے ایک کالم میں اردو اور دوسرے میں ہندی ہوتی ہے اس کے اڈیٹر دھرم نراین ہیں جن کی عمر صرف چھبیس ستائیس سال کی ہوگی۔ یہ بہت اچھے شاعر ہیں اور انھوں نے مِل کی پولیٹکل اکانمی (معاشیات) اور انگلستان کی ایک تاریخ کا ترجمہ بھی کیا ہے۔

بھرت پور، صوبہ آگرہ میں ہے۔ وہاں کا اخبار "مظہر السرور" ہے جو راجہ بھرت پور کی سرپرستی میں شایع ہوتا ہے۔ "مالوہ اخبار" کی طرح اس کے ایک کالم میں اردو اور دوسرے میں ہندی ہوتی ہے۔

اب ہم پنجاب کے اخباروں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ ان کے ناموں کے دیکھنے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ روشنیٔ علم کی اشاعت میں زیادہ کوشاں ہیں۔ کیونکہ وہاں کے اخبارات کے ناموں کے ساتھ اکثر نور کا لفظ لگا رہتا ہے مثلاً "دریائے نور" جو لاہور کا اخبار ہے۔ ایک دوسرا جو ہفتے میں دوبار شائع ہوتا ہے "کوہ نور" ہے۔ اس مشہور ہیرے کا نام ہے جو آج کل ملکۂ انگلستان کے قبضہ میں ہے۔

لدھیانہ کا اخبار "نورٌ علیٰ نور" ہے جسے محمد حسین نے ۱۸۵۱ء میں جاری کیا تھا - یہ اپنی ایک نظم کی وجہ سے مشہور ہیں جس میں اُنھوں نے فطرت کی اُن پیداواروں کو منظوم کیا ہے - جن کا ذکر احادیث میں آیا ہے امرتسر سے "باغِ نور" اور ملتان سے جو اسی نام کے صوبہ کا دارالحکومت ہے "ریاضِ نور" نکلتا ہے -

حضرات ! اب میں ہندوستانی تالیف و تصنیف کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جو ممالک مغربی و شمالی میں ۱۸۵۱ء میں شایع ہوئیں - میں اس معلومات میں جو میں نے گزشتہ سال آپ کے سامنے پیش کی کچھ اضافہ کرنا چاہتا ہوں -

رومن کیتھلک نقطۂ نظر سے سردست ان صوبجات میں ایسا ہے جیسے صحرا میں نخلستان - یہاں رومن کیتھلک مشنریوں نے مطبع قائم کر رکھا ہے جس میں حال میں علاوہ اور چیزوں کے مذہبی عقاید کی سوال و جواب کی کتاب بھی چھپی ہے - آگرہ والی کتاب سے زیادہ تفصیلی ہے - کئی کتابیں دعاؤں کی اور فلیوری کے تاریخی سوال و جواب کا ترجمہ ، عیسائی اولیا کے تذکرے اور کئی اور مذہبی کتابیں فارسی اور دیوناگری حروف میں چھپی ہیں -

پراٹسٹنٹوں کی مذہبی مطبوعات بلاشبہ بہت زیادہ ہیں اور اُن کی اشاعت سے اہل ہند میں رفتہ رفتہ عیسائی خیالات کی اشاعت ہوتی جاتی ہے اور اسی کے ساتھ ابتدائی کتابیں جو انگریزی سے ترجمہ کی جاتی ہیں مغربی علوم کے پھیلانے میں مدد دیتی ہیں -

گزشتہ سال میں نے آپ سے رام چندر کے عیسائی ہونے کا ذکر کیا تھا اور میں نے اپنے خطبہ میں اُس اخبار کا بھی ذکر کیا تھا جس کے وہ اڈیٹر ہیں - اس سال ایک ہندوستانی شاہزادہ کا ذکر کرتا ہوں اور صرف یہی ایک ہندوستانی شاہزادہ ہے جو ہمارے زمانہ میں عیسائی ہوا ہے - مہاراجہ دلیپ سنگھ لاہور کے شاہی خاندان کا سکھ شاہزادہ ہے - اس نے فتح گڑھ میں گزشتہ مارچ کی آٹھویں تاریخ کو عیسائی مذہب قبول کیا - اس وقت وہ فتح گڑھ ہی میں مقیم ہے -

لیکن ہمیں ہندوستان کے مطابع کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھنی چاہئے - کیونکہ یہی سب سے بڑی چیز ہے جو یورپ کی توجہ کی مستحق ہے - ۱۸۵۱ء کے دوران میں تیس دیسی مطابع میں جس قدر کتابیں چھپی ہیں اُن کا ایک گوشوارہ تیار کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی تعداد ۱۲۶ ہے جن میں سے ۴۰ ہندوستانی ہیں -

افسوس ہے کہ اُن میں سے متعدد کتابوں کے صرف نام لکھے ہیں دوسری کسی قسم کی کیفیت درج نہیں ہے اور محض نام سے کتاب کے متعلق صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مشرقی کتب کے نام بعض اوقات اصل مضمون سے کچھ تعلق نہیں رکھتے۔ اس لئے حضرات، میں بعض کتابوں کا تذکرہ کرنے سے معذور ہوں۔ ممکن ہے کہ اُن کا جاننا بہت دلچسپ ہوتا۔

ہندی کتب میں سے لایق ذکر مفصلہ ذیل کتابیں ہیں جو آپ کی محتاجِ توجہ ہیں۔

راماین کی شرح جو مہاراجہ بنارس کی فرمایش سے طبع ہو رہی تھی، جنوری ۱۸۵۲ء میں تکمیل کو پہنچ گئی سُجن چوتر۔ یہ کتاب راجۂ بھرت پور کے حکم سے طبع ہوئی۔ اس میں اس لڑائی کا منظوم تذکرہ ہے جو سورج مل (جو راجہ بھرت پور کے بزرگوں میں سے تھے) اور صلابت خاں اور دوسرے افغان سرداروں میں ہوئی تھی۔

نجات المومنین۔ باوجود عربی نام کے یہ کتاب پنجاب کی ہندی بولی میں جسے پنجابی کہتے ہیں لکھی گئی ہے اور لدھیانہ میں چھپی ہے۔

حاتم طائی ہندی منظوم بنارس میں چھپی۔ ایک ہندی لغت مرتبۂ تشق دہلی میں چھپی ہے۔ یہ صاحب کئی کتابوں کے مؤلف ہیں۔ جو اس سے قبل شایع ہو چکے ہیں اگر میں سرکاری مطبوعات جنتریوں اور چھوٹی چھوٹی مذہبی کتابوں نیز ایسی کتابوں کو جو دوبارہ چھپی ہیں اپنے تبصرہ میں شریک کرلوں تو یہ فہرست آسانی سے بہت طویل ہو سکتی ہے۔

یہی کیفیت اردو مطبوعات کی ہے جن کی تعداد ان سے کہیں زیادہ ہے۔ کیونکہ ہندی مصنفین بھی زبان کی اُسی شاخ میں لکھنا پسند کرتے ہیں جسے سلمان مصنفین نے قابل تعریف کمال تک پہنچا دیا ہے۔

حضرات۔ اس سال میں اُردو مطبوعات میں سے چند ایسی کتابوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جو حقیقی طور پر قابل قدر ہیں۔

کانپور کا مطبع ہندوستانی مطابع میں بہت ہی معروف و مقبول ہے۔ ۱۸۵۱ء میں اس مطبع میں علاوہ دوسری کتابوں کے ایک نظم "قصۂ منصور" کے نام سے چھپی ہے۔ منصور ایک مشہور حکیم (صوفی)

گزرا ہے۔ جو زیادہ تر " حلاج " کے نام سے معروف ہے۔ اس مشہور شخص پر جو صوفی ہے ۹۲۲ء میں کفر کا فتویٰ لگایا گیا اور اس جرم پر کہ وہ اپنے تئیں " الحق " کہتا تھا جو خدا کا نام ہے قتل کیا گیا۔ صوفیا اُسے شہید سمجھتے ہیں۔ اور اُن کی تصانیف میں اس کا ذکر بہت عزت و حرمت سے کیا گیا ہے۔ بعض لوگ اسے عیسائی خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ دہربولے نے اپنی کتاب " اورنیٹل ببلیوتیک " میں اس کے چند اشعار نقل کئے ہیں جن سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ آخری اشعار تھے جو شہادت سے پہلے اُس کی زبان سے نکلے تھے۔

" حمد ہو ہمیشہ اس کے لئے جس نے اپنی الوہیت کو چھپا کر جو تمام دنیا میں ساری ہے، اپنی انسانیت (انسانی شکل) کو ہم پر ظاہر کیا۔ یہاں تک کہ اُس نے خواہش کی کہ وہ ہم کو کھاتا پیتا نظر آئے۔ وہ جو مجھے اپنے دسترخوان پر بلاتا ہے تو بُرا نہیں کرتا کیونکہ وہ مجھے وہی پیالا پینے کو دیتا ہے جو وہ خود پیتا ہے۔ وہ درحقیقت مجھ سے ایسا ہی برتاؤ کرتا ہے جیسا ایک میزبان اپنی مہمان کے ساتھ کیا کرتا ہے۔"

علاوہ اس کے اس مطبع سے مفصلہ ذیل کتابیں شایع ہوئی ہیں۔

مجموعۂ مثنوی۔ یہ اردو منظوم حکایتوں کا مجموعہ ہے۔ حکایت نصیحت آمیز۔ ناز و نیاز یہ خدا اور رسول خدا صلعم کی حمد و ثنا میں ہے۔ یہ اُسی قسم کی کتاب ہے جو آگرہ میں نظم نادر کے نام سے شایع ہوئی ہے۔ گلستان مسرت[1] یہ شعرا کے کلام کا مجموعہ ہے جو اس مطبع کے روشن خیال مالک نے انتخاب کیا ہے۔

اب ان اُردو کتب کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرتا ہوں جو دوسرے مطبعوں سے شایع ہوئی ہیں۔ اُن میں سے ایک عربی کی مشہور کتاب "مقامات حریری" کا اُردو ترجمہ ہے۔ دھرم سنگھ کا قصہ جو ایک دلچسپ قصہ ہے۔ بو علی قلندرؒ کی فارسی مثنوی کی شرح۔ بہارستان سخن جو ناسخ، آتش، آباد کے کلام کا مجموعہ ہے۔ میزان عقلی، یہ فارسی کتاب کا ترجمہ ہے تاکہ لوگ کثرت سے مستفید ہوسکیں۔

اس سال کے شروع میں پنجاب کے ایک اخبار نے ایک جدید کتاب کی اطلاع شائع کی ہے یہ میجر ایڈورڈ کی کتاب " پنجاب میں ایک سال " کا ترجمہ ہے۔ اس کے مترجم نواب امام الدین ہیں جو پہلے کشمیر

[1] یہ فارسی شعرا کے کلام کا انتخاب مضامین کی ترتیب سے ہے۔ پروفیسر موصوف غلطی سے اسے اُردو خیال کرتے ہیں (اڈیٹر)

سے گورنر تھے اور جنھوں نے کابل کے محاصرے اور دوسری لڑائیوں میں نمایاں کام کئے ہیں۔

میں ان جغرافی نقشوں کا ذکر نہیں کروں گا جو مختلف مطبعوں میں چھپے ہیں۔ ہر کلاٹس اور ٹیین کے نقشوں کے بعد سے ممالک مغربی و شمالی کے مطابع میں نہ صرف دنیا کے نقشے بلکہ ہندوستان اور ہر ضلع کے نقشے چھپ کر شایع ہوئے ہیں۔

میں اپنی تعلیم کے دوران میں کئی سال تک "ہندوستانی انتخابات" پڑھاتا رہا ہوں۔ یہ عمدہ انتخاب فاضل مسٹر شکسپیر کا کیا ہوا ہے اور اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے کالجوں کے نصاب میں داخل تھا۔ اب اُس کی جگہہ طوطا کہانی اور باغ و بہار رکھی گئی ہیں۔ اس سال میں اُن کتابوں کی تعلیم دوں گا۔ نہ صرف ان انگریزوں کے فائدہ کے خیال سے جو میرے لکچروں میں حاضر ہوتے ہیں بلکہ اس خیال سے کہ اُردو میں ان کتابوں کا طرز تحریر نہایت پاکیزہ اور لطیف ہے۔ یعنی یہ ہندوستان کی اُس خوبصورت زبان میں لکھی گئی ہیں جس میں فارسی اور اُس کی معین عربی اعتدال کے ساتھ شریک ہیں ان کتابوں میں استعارات اور دیگر صنائع و بدائع اور لفظی مناسبت کا صرف ایک حد تک استعمال کیا گیا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کے اہل مشرق بہت شایق ہیں۔

ان میں سے پہلی کتاب سے آپ واقف ہیں کیونکہ اس کا ترجمہ (Tales of a Parrot) کے نام سے ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس کے متعلق مجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسرا ایک مشہور قصہ ہے۔ اور ہندوستان میں یہ قصہ کئی صاحبوں نے لکھا ہے۔ اُن سے باغ و بہار نام کا بہت قابل قدر ہے اور ہندوستان میں اس قدر مقبول ہوا ہے کہ بار بار چھپا ہے۔ اور اس میں کا ایک ترجمہ ارمنی زبان میں بھی ہوا ہے۔ علاوہ اور باتوں کے اس میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں اُردو ہندی کی بہت سی ضرب المثلیں اور اشعار بھی جگہہ جگہہ آتے ہیں۔ س کا نام باغ و بہار کسی قدر عجیب ہے۔ خود مصنف نے اپنے دیباچے میں اس کی وجہ تسمیہ ان الفاظ میں بیان کی ہے:

"یہ نام ہم تاریخ اس میں نکلتی ہے۔ تب میں نے یہی نام رکھا جو کوئی اس کو پڑھے گا گویا باغ کی سیر کریگا" جیسا کہ اکثر مشرقی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ اس قصے میں کئی اور قصے شامل ہیں اور (Orlando Furioso) کی طرح قصے کا انجام عام ہے جس میں قصے کے تمام خاص اشخاص شریک ہیں۔ یہ کتاب کئی شخصوں کی عجیب

وغریب آپ بیتیوں کا مجموعہ ہے جن میں عجائب نگاری کی شان ہر جگہ پائی جاتی ہے اور باوجود بار بار اعادہ کے اہل مشرق اسے بہت پسند کرتے ہیں مگر اس سے درحقیقت اکثر اوقات قصوں کا لطف کم ہوجاتا ہو۔ لیکن خوشی کی بات یہ ہو کہ اس میں " اسلامی عجائبات" بھی آجاتے ہیں جو زیادہ قابل قبول اور تشفی بخش ہیں۔

حضرات ۔ میں اب آپ سے باغ وبہار کا خلاصہ بیان کرتا ہوں۔ تاکہ آپ کے خیال میں کتاب کا ایک تصور پیدا ہوجائے اور اصل کتاب کے پڑھنے میں آسانی ہو (اس کے بعد کتاب کا خلاصہ ہی جو غیر ضروری سمجھ کر ترجمہ میں چھوڑ دیا گیا)۔

میں نے مختصر طور سے باغ وبہار کا خاکہ آپ کے سامنے کھینچ دیا ہے۔ لیکن اس کتاب کے پڑھتے وقت آپ بہت مفید اور کارآمد بات یہ پائیں گے کہ ان قصوں میں ہر صفحہ پر آپ کو قومی خصوصیات کے متعلق ایسی باتیں ملیں گی جو ہمیں اصلی ہندوستان اور خاصکر اسلامی ہندوستان کے سمجھنے میں بہت کارآمد ہوں گی۔ اس قسم کی باتیں قصّے کے ہر صفحے میں پائی جاتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بعض جگہہ مذہبی جوش اور ظلم کی کارستانیاں اس ناگوار طریقہ سے بیان کی گئی ہیں کہ وہ حصّے کسی قدر خلاف قیاس معلوم ہوتے ہیں، لیکن بہت سے حصّے ایسے ہیں کہ اُن کا جوڑ بڑی خوبصورتی سے بٹھایا گیا ہے اور درحقیقت بہت دلچسپ ہیں۔

لہذا حضرات اس کتاب میں آپ اس زبان کا مطالعہ کریں گے جو خاص طور پر ہندوستانی کہلاتی ہو اور اس میں آپ اُن الفاظ کو نہیں پڑھیں گے جن کا کوئی مفہوم نہیں، بلکہ ایسے الفاظ دیکھیں گے جو ان اشیا کا مفہوم بتاتے ہیں جو بہت دلچسپ ہیں اور جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے آپ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی پائیں گے اور وہ یہ ہے کہ اس کے الفاظ خیالات کی نیابت کرتے ہیں۔ کیونکہ اُن کا تجزیہ کرنے سے ہم ان مادوں تک پہنچتے ہیں جو انڈو یورپین زبانوں کے ایک بہت بڑے مجموعہ کی کنجی ہیں اور خود ہماری زبان بھی انھیں میں شامل ہے اور درحقیقت ہندوستانی کی ایک بہن ہے۔

پیارا پیارا گھر اپنا

(نتیجۂ فکر جناب محمد عظمت اللہ خاں صاحب ۔ بی اے)

۱۔ وہ چین کہاں اپنے گھر کا وہ بات کہاں اپنے گھر کی
پیارا پیارا گھر اپنا
وہ راج کہاں اپنے گھر کا وہ رات کہاں اپنے گھر کی
آنکھوں کا تارا گھر اپنا

۲۔ سکھ چین اگر دنیا میں ہے اپنے ہی گھر میں ملتا ہے
سکھ کا سہارا گھر اپنا
دکھ درد کی گر کوئی دوا ہے اپنے ہی گھر کی سیوا ہے
دکھ کا مداوا گھر اپنا

۳۔ وہ گھر والی سندر چترا گھر کی سیوا کرنے والی
دل کا دلاسا گھر اپنا
آرام ہمیں دینے والی آپ مصیبت بھرنے والی
جان سے پیارا گھر اپنا

۴۔ آنکھوں کے تارے لاڈلے گھر کے سب مل کر گھر سر پہ اٹھاتے
دودھوں نہایا گھر اپنا
کھیلتے ہنستے روٹھتے منتے سنتے کہانی سوتے سلاتے
بسا بسایا گھر اپنا

۵- ہم پر جان چھڑکنے والا وہ پروان چڑھانے والا
پالنے والا گھر اپنا
وہ بلوان بنانے والا وہ انسان بنانے والا
ڈھالنے والا گھر اپنا

۶- وہ پاک ہوا اپنے گھر کی پیار کی جلا اپنے گھر کی
دل میں سمایا گھر اپنا
ایثار وفا اپنے گھر کی وہ درد دیا اپنے گھر کی
روح پہ چھایا گھر اپنا

۷- جڑ بنیاد وطن کی گھر ہے وطن گھروں کا اپنے گھر ہے
اپنے گھروں کا گھر اپنا
اپنے گھر پہ نثار وطن ہے اور وطن کے صدقے گھر ہے
وطن کا شیدا گھر اپنا

۸- وطن کی چاہت اپنے گھر سے وطن کی طاقت اپنے گھر سے
وطن کا پیارا گھر اپنا
وطن کی دولت اپنے گھر سے وطن کی عزت اپنے گھر سے
راج دلارا گھر اپنا
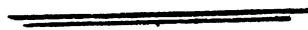
غالبؔ کے نئے کلام کا انتخاب

(از جناب مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن)

کچھ عرصہ ہوا رسالہ اُردو میں ہم مرزا غالب کے غیر مطبوعہ یا نئے کلام پر جو نسخہ حمیدیہ میں چھپا ہے تبصرہ کر چکے ہیں۔ اِس کلام کو بغور دیکھنے سے ہمارا یہ خیال درجۂ یقین کو پہونچ گیا کہ مرزا غالب کے ابتدائی زمانہ کے اکثر اشعار اگرچہ مشکل ہیں مگر تلف کرنے کے لائق نہیں ہیں، اور اگر سلیقے کے ساتھ ان کی شرح لکھدی جائے تو دیگر "اساتذۂ اُردو" کے کلام کی نسبت ان شعروں میں قبولِ خاطر کی صلاحیت کچھ کم نہ نکلے گی۔ اس قسم کی مفصل شرح کا تو نہ معلوم کب موقع آئے گا، سردست جناب اڈیٹر صاحب اُردو کے فرمانے کے مطابق ہم اِس نئے کلام کا ایک سرسری انتخاب ناظرینِ اُردو کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اِس میں جہاں تک ہوا آسان شعر چُنے ہیں اور پہلے اُن اشعار کو لیا ہے جن کی ہم طرح غزلیں متداول دیوان میں موجود تھیں۔ بہ الفاظِ دیگر یہ وہ شعر ہیں جنھیں حسب روایت مرزا صاحب کے دوستوں نے قلمزن کیا تھا۔ اور گو اُن حضرات نے اِس انتخاب میں کمال دیانت و قابلیت سے کام لیا ہو، بایں ہمہ جیسا کہ اپنے تبصرے میں عرض کر چکے ہیں انھوں نے اپنے انفرادی ذوق اور کچھ اہلِ زمانہ کے عام رجحان کے اثر سے بعض وہ شعر بھی خارج کر دیئے جو آج کل ہرگز نظر انداز کرنے کے قابل نہ سمجھے جائیں گے۔

ان اشعار کے بعد اُن غزلوں کا انتخاب کیا ہے جن کا کوئی ہم طرح شعر متداول دیوان میں نہ تھا۔ اور جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں، ظاہرا یہ ابتدائی عمر کا وہی کلام ہے جس کی نسبت مرزا صاحب ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامینِ خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اُس دیوان کو دُور کیا اوراق یکقلم چاک کیے دس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے دیوان میں رہنے دیئے"۔ یہی سبب تھا کہ بہت سے صاف اور اچھے شعر بھی انھی اوراق کے ساتھ اتنے عرصہ تک

محو و بے نشان رہی جنھیں بکمال بے دردی سے "یک قلم چاک" کر دیا گیا تھا۔

(۱)

(اُن اشعار کا انتخاب جن کی ہم طرح غزلیں متداول دیوان میں موجود ہیں)

تنگی، رفیقِ رہ تھی عدم یا وجود تھا
میرا سفر بہ طالعِ چشمِ حسود تھا

خور شبنم آشنا نہ ہوا ورنہ میں اسد
سر تا قدم گذارشِ ذوقِ سجود تھا!

ہی کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

خاکبازیٔ اُمید کارخانۂ طفلی
یاس کو دو عالم سے لب بخندہ وا پایا

شب نظارہ پرور تھا خواب میں خیال اس کا
صبح موجۂ گل کو نقشِ بوریا پایا

کارخانے سے جنوں کے بھی میں عریاں نکلا
میری قسمت کا نہ ایک آدھ گریباں نکلا

ساغرِ جلوۂ سرشار ہی ہر ذرۂ خاک
شوقِ دیدار بلا آئینہ ساماں نکلا

یعنی خود شوقِ دیدار نے اِس بلا کی قابلیت عکسِ معشوق لینے کی پیدا کر دی ہی۔

دیدہ تا دل ہی یک آئینہ چراغاں کس نے
خلوتِ ناز پہ پیرایۂ محفل باندھا؟

مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے غالب
ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا

اِس غزل کا صرف مقطع متداول دیوان میں رہ گیا باقی چھ شعر انتخاب کرنے والوں نے خارج کر دیئے جن میں سے چار نیچے درج ہیں:-

نہ بھولا اضطرابِ دم شماری، انتظار اپنا
کہ آخر شیشۂ ساعت کے کام آیا غبار اپنا

ز بس آتش نے فصلِ رنگ میں رنگِ دگر پایا
چراغِ گل سے ڈھونڈے ہی چمن میں شمعِ خار اپنا

اسیرِ بے زباں ہوں۔ کاشکے صیادِ بے پروا
بہ دامِ جوہرِ آئینہ ہو جائے شکار اپنا

اگر آسودگی ہے مدّعائے رنجِ بیتابی　　　　نثارِ گردشِ پیمانۂ مے روزگار اپنا!

مقطع

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں　　　　کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

یہاں اس مطبوعہ مقطع کو نقل کرنے سے ہمیں یہ دکھانا مقصود ہے کہ بعض دفعہ انتخاب کرنے والوں نے آسان شعروں کو کاٹ کر پیچیدہ کو باقی رکھا ہے!

نہ پائی وسعتِ جولانِ یک جنوں ہم نے　　　　عدم کو لے گئے دل میں غبارِ صحرا کا

مرا شمول ہر اک دل کے پیچ و تاب میں ہے　　　　میں مدّعا ہوں تپش نامۂ تمنّا کا

ضعفِ جنوں کو وقتِ تپش در بھی دور تھا　　　　اِک، گھر میں، مختصر سا بیاباں ضرور تھا

اے وائے غفلتِ نگہ شوق! ورنہ یاں　　　　ہر پارہ سنگ، لختِ دلِ کوہِ طور تھا

درسِ تپش ہے برق کو اب اِس کے نام سے　　　　وہ دل ہے یہ کہ جس کا تخلص "صبور" تھا

ہر رنگ میں جلا اسدِؔ فتنہ انتظار　　　　پروانۂ تجلّیِ شمعِ ظہور تھا

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار　　　　سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گُل ناآشنا!

اِس کے بعد آگے جا کر م کی ردیف میں چند شعر اس قابل ملتے ہیں کہ متداول دیوان کی غزل میں انھیں شامل کر لیا جائے:-

فرطِ بیخوابی سے ہیں شب ہائے ہجرِ یار میں　　　　جوں زبانِ شمع، داغِ گرمیِ افسانہ ہم

جانتے ہیں جوششِ سودائے زلفِ یار میں　　　　سنبلِ بالیدہ کو موئے سرِ دیوانہ ہم

بسکہ وہ چشم و چراغِ محفلِ اغیار ہے　　　　چُپکے چُپکے جلتے ہیں جوں شمعِ ماتم خانہ ہم

اِس جوش انگیز مقطع کو بھی انتخاب کرنے والوں نے خارج کر دیا تھا کہ ؎

قطرہ ہائے خونِ بسمل زیبِ داماں ہیں، اسدؔ — ہے تماشا کردنی گلچینیٔ جلاّدیاں

ذیل کے شعروں میں سے مطلع خود مرزا غالبؔ نے گلِ رعنا کے چیدہ اشعار میں داخل کیا تھا ؎

ہے نزاکت بسکہ فصلِ گل میں معمارِ چمن — قالبِ گل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوارِ چمن

وقت ہے گر بلبلِ مسکیں زلیخائی کرے — یوسفِ گل جلوہ فرما ہے بہ بازارِ چمن

پھر حلقۂ کاکل میں پڑیں دید کی راہیں — جوں دُود فراہم ہوئیں روزن میں نگاہیں

پایا سرِ ہر ذرہ جگر گوشۂ وحشت — ہیں داغ سے معمور شقایق کی کلاہیں

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنّا — واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں!

"تکرارِ تمنّا" میں مایوس رہ جانے کا بھی کنایہ تھا اسی لئے دوسرے مصرعے میں وضاحت کی اور یہ نادر مضمون پیدا کیا کہ عشقِ حقیقی تو اس طلب کا نام ہے جس کی اِس دنیا میں کوئی نہایت نہیں۔ پس یہ سالک کے تھک جانے کی دلیل ہے کہ وہ دیر یا حرم کو اپنی منزلِ مقصود قرار دے لے۔

ہر چند عمر گذری آزردگی میں لیکن — ہے شرحِ شوق کو بھی جوں شکوہ ناتمامی

ہے یاس میں اسدؔ کو ساقی سے بھی فراغت — دریا سے خشک گزری مستوں کی تشنہ کامی

ذیل کی غزل کا بے نظیر مطلع اور کئی شعر انتخاب کرنے والوں نے خارج کر دیئے تھے:-

نظر بہ نقصِ گدایاں کمال بے ادبی ہے — کہ خارِ خشک کو بھی دعویٔ چمن نسبی ہے

ہوا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ — لبِ قدح پہ کفِ بادہ جوشِ تشنہ لبی ہے

مرزا کی عالی ظرفی ہمیشہ "دلِ بے مدعا" مانگتی ہے لیکن "مدعا طلبی" کے جو اسباب انھوں نے گنوائے ہیں

وہ باریک بینی کی انتہا ہی۔ فرماتے ہیں ؎

خوشا وہ دل کہ سراپا طلسمِ بے خبری ہو　　جنون و یاس و الم رزقِ مدعا طلبی ہو!
چمن میں کس کے یہ برہم ہوئی ہی بزمِ تماشا　　کہ برگ برگِ سمن شیشہ ریزۂ حلبی ہی

ذیل کی غزل میں سے صرف دو شعر خارج کئے گئے تھے۔ وہ دونوں ہم نقل کئے دیتے ہیں:۔

ظاہر ہی طرزِ قید سے صیّاد کی غرض　　جو دانہ دام میں ہی سو اشکِ کباب ہی
بے چشم دل نہ کر ہوسِ سیرِ لالہ زار　　یعنی یہ ہر ورق، ورقِ انتخاب ہی

کباب میں سے جو پانی رِستا ہی اسے "اشکِ کباب" کہتے ہیں اور وہی جم کر دانہ بن جاتا ہی۔

کہوں کیا گرمجوشی مے کشی میں شمع رویاں کی　　کہ شمعِ خانۂ دل آتشِ مے سے فروزاں کی
ہوا شرمِ تہی دستی سے وہ بھی سرنگوں آخر　　بس اے زخمِ جگر اب دیکھ لی شورش نمکداں کی
یہ یادِ گرمیِ صحبت برنگِ شعلہ دہکے ہی　　چھپاؤں کیوں کہ غالب سوزشیں داغِ نمایاں کی!

"آئینۂ زانو مجھے" والی غزل کا مطلع، جو بجائے خود فلسفۂ زندگی کا رسالہ ہی، یہ تھا:۔

باعثِ واماندگی ہی عمرِ فرصت جو مجھے　　کر دیا ہے پا بہ زنجیرِ رمِ آہو مجھے

"رمِ آہو" سے شاعر نے زنجیرِ زنداں تیار کی ہی اور یہ بالکل نئی تشبیہ ہی۔ شعر کا مقصود یہ ہے کہ قسمت یا فطرت ہی نے مجھے مجبور کر دیا ہی کہ فرصت و فراغت کی تلاش کروں لیکن خود یہ تلاش فرصت کی ضد ہی اور تھکا دینے کے لئے کافی ہی۔

عروجِ نشہ ہی سرتاقدم قدِ چمن رویاں　　بجائے خود وگر نہ سرو بھی مینا سے خالی ہی
یہ مستی ہی اہلِ خاک کو ابرِ بہاری سے　　زمیں جوشِ طرب سے جامِ لبریزِ سفالی ہی

اسدؔ اُٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرائش — لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے!

حُسنِ تخیل اور قوتِ بیان کے اعتبار سے مجھے اُمید نہیں کہ اُردو شاعری میں مندرجۂ بالا مقطع کی کوئی نظیر آسانی سے مُیسّر آجائے! ؎

ہوجہاں تیرا دماغ ناز مستِ بیخودی — خوابِ نازِ گلرخاں دُودِ چراغِ کشتہ ہے

تر جبیں رکھتی ہے شرمِ قطرہ سامانی مجھے — موجِ گردابِ حیا ہے چینِ پیشانی مجھے

شوقؔ[1] ہے مثلِ حباب از خویش بیروں آمدن — ہے گریباں گیرِ فرصت ذوقِ عریانی مجھے

غم و عشرت قدم بوسِ دلِ تسلیم آئیں ہے — دُعائے مُدّعا گم کردگانِ عشق "آمیں" ہے

پیامِ تعزیت پیدا ہے اندازِ عیادت سے — شبِ ماتم، تہِ دامانِ دُودِ شمعِ بالیں ہے

اسدؔ کو حسرتِ عرضِ نیاز تھی دمِ قتل — ہنوز یک سخنِ بے صدا نکلتی ہے!

"سخن" کا لفظ یہاں مؤنث بندھا ہے آج کل عام طور پر مُذکّر بولتے ہیں۔ اور "سخنِ بے صدا" کے معنی محض ایک کیفیت کے رہ جائیں گے۔

(۲)

(اُن غزلوں کا انتخاب جن کا کوئی شعر متداول دیوان میں نہ تھا)

بہ رہنِ شرم ہے با وصفِ شہرت اہتمام اُس کا — نگیں میں جوں شرارِ سنگ ناپیدا ہے نام اس کا

اسدؔ سودائے سر سبزی سے ہے تسلیم رنگیں تر — کہ کشتِ خشک اُس کا، ابرِ بے پروا خرام اِس کا

یہ مطلع اور مقطع دونوں لاجواب اور نہایت وسیع معانی کے حامل ہیں۔ پہلا شعر مولانا حسرت گل رعنا سے

---

[1] نسخۂ حمیدیہ میں یہ لفظ "شوخ" چھپا ہے۔ میں نے "شوق" بنا دیا۔

نقل کر کے چھاپ چکے ہیں لیکن ان کے ہاں "شہرت" کی جگہ "شوخی" کا رنگین تر لفظ تحریر ہے۔

آخر کار گرفتارِ سرِ زلف ہوا　　دلِ دیوانہ کہ وارستۂ ہر مذہب تھا
شوق، سامانِ فضولی ہے وگرنہ غالبؔ　　ہم میں سرمایۂ ایجادِ تمنا کب تھا

یک گام بیخودی سے لوٹیں غبارِ صحرا　　آغوشِ نقش پا میں کیجے فشارِ صحرا
وحشت اگر رسا ہے بے حاصلی ادا ہے　　پیمانۂ ہوائے ہے مشتِ غبارِ صحرا
اے آبلہ کرم کر یاں رنجہ اک قدم کر　　اے نورِ چشمِ اُلفت اے یادگارِ صحرا
دیوانگی اسدؔ کی حسرت کشِ طرب ہے　　در سر ہوائے گلشن در دل غبارِ صحرا

وحشی بن صیاد نے ہم رمخوروں کو کیا رام کیا　　رشتۂ چاکِ جیبِ دریدہ صرفِ قماشِ دام کیا
مُہر بجائے نامہ، لگائی برلبِ پیکِ نامہ رساں　　قاتلِ تمکیں سنج نے یوں خاموشی کا پیغام کیا

سیر آں سوئے تماشا ہے طلب گاروں کا　　خضر مشتاق ہے اس دشت کے آواروں کا
دادخواہِ تپش و مُہرِ خموشی برلب　　کاغذِ سرمہ ہے جامہ ترے بیماروں کا
پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے　　رنگ اُڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا
جلوہ مایوس نہیں دل نگرانی، غافل　　چشمِ اُمید ہے روزن تری دیواروں کا

تیسرا شعر مرزا صاحب نے خود انتخاب کر کے گلِ رعنا میں درج کیا تھا اور مولانا حسرت کے ہاں چھپ چکا ہے۔ اور چوتھے شعر میں "دل نگرانی" سے دلی نگرانی یا آرزوئے حقیقی مراد ہے۔

ذیل کی ہوائی غزل ہم پہلے اپنے تبصرے میں نقل کر چکے ہیں۔ چند شعر یہاں انتخاب کرتے ہیں:۔

بہ مہر نامہ جو بوسہ گلِ پیام رہا — ہمارا کام ہوا اور تمہارا نام رہا
ہوا نہ مجھ سے بجز درد حاصلِ صیّاد — بسانِ اشک گرفتارِ چشمِ دام رہا
دل و جگر تفِ فرقت سے جل کے خاک ہوئے — ولے ہنوز خیالِ وصال خام رہا
شکستِ رنگ کی لائی سحر شبِ سنبل — پہ زلفِ یار کا افسانہ ناتمام رہا

قطعِ سفرِ ہستی و آرامِ فنا، ہیچ — رفتار نہیں بیشتر از لغزشِ پا ہیچ
حیرت ہمہ اسرار پہ مجبورِ خموشی — ہستی نہیں جز بستنِ پیمانِ وفا ہیچ
کس بات پہ مغرور ہے اے عجزِ تمنّا — سامانِ دُعا، وحشت و تاثیرِ دُعا ہیچ
آہنگِ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ بیدلؔ — عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

اے نوا سازِ تماشا! سر بکف جلتا ہوں میں — اِک طرف جلتا ہے دل اور اِک طرف جلتا ہوں میں
شمع ہوں لیکن بپا در رفتۂ خارِ جستجو — مُدّعا گم کردہ ہر سو ہر طرف جلتا ہوں میں

فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں — برنگِ جادہ سرِ کوئے یار رکھتے ہیں
جنونِ فرقتِ یارانِ رفتہ ہے غالبؔ — بسانِ دشت دلِ پُر غبار رکھتے ہیں

گر یاس سر نہ کھینچے تنگی عجب فضا ہے — وسعت گہِ تمنّا یک بام و صد ہوا ہے
نے حسرتِ تسلّی نے ذوقِ بیقراری — یک درد و صد دوا ہے یک دست و صد دعا ہے
ہر نالہ اسدؔ ہے مضمونِ دادخواہی — یعنی سخن کو کاغذ احرامِ مدعا ہے

نفس بہ نالہ رقیب و نگہ بہ اشک، عدو — زیادہ اُس سے گرفتار ہوں کہ تو جانے!

زباں سے عرضِ تمنائے خامشی معلوم — مگر وہ خانہ برانداز "گفتگو" جانے ؟

عذارِ یار نظر بندِ چشمِ گریاں ہے — عجب کہ پرتوِ خور شمعِ شبنمستاں ہی
کشودِ غنچۂ دلہا عجب نہ رکھ، غافل — صبا خرامیِ خوباں بہار ساماں ہی

فرصت، آئینۂ صد رنگِ خود آرائی ہی — روز و شب یک کفِ افسوسِ تماشائی ہے

نوائے خفتۂ الفت اگر بیتاب ہو جاوے — پرِ پروانہ تارِ شمع پر مضراب ہو جاوے
برنگِ گل اگر شیرازہ بندِ بیخودی رہیے — ہزار آشفتگی مجموعۂ یک خواب ہو جاوے
اسد باوصفِ عجز و بے تکلف خاک گردیدن — غضب ہی گر غبارِ خاطرِ احباب ہو جاوے

تا چند نازِ مسجد و بت خانہ کھینچیے — جوں شمع، دل بہ خلوتِ جانانہ کھینچیے
عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر — دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچیے!
ہی ذوقِ گریہ عزمِ سفر کیجیے اسد — رختِ جنونِ سیل بہ ویرانہ کھینچیے

گل سر بسر اشارۂ جیبِ دریدہ ہے — نازِ بہار جز بہ تقاضا نہ کھینچیے
گر صفحے کو نہ دیجیے پردازِ سادگی — جز خطِ عجز نقشِ تمنا نہ کھینچیے
خود نامہ بن کے جائیے اس آشنا کے پاس — کیا فائدہ کہ منتِ بیگانہ کھینچیے

تماشا تھا

پرِ طاؤس تماشا نظر آیا ہی مجھے — ایک دل تھا کہ بصد چشم دکھایا ہی مجھے
جامِ ہر ذرہ ہی سرشارِ تمنا مجھ سے — کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہی مجھے

جوشِ فریاد سے لوں گا دیتِ خواب اسدؔ شوخیٔ نغمۂ بیدلؔ نے جگایا ہے مجھے

فسردگی میں ہے فریادِ بیدلاں تجھسے چراغِ صبح و گُلِ موسمِ خزاں تجھسے
نیاز پردۂ اظہارِ خود پرستی ہے جبینِ سجدہ فشاں تجھسے، آستاں تجھسے!

رنجشِ یار مہرباں عیش و طرب کا ہے نشاں دل سے اُٹھا ہے جو غبار گردِ سوادِ باغ ہے
شعر کی فکر کو اسدؔ چاہیئے ہے دل و دماغ عُذر۔ کہ یہ فسردہ دل بے دل و بے دماغ ہے

مرزا غالب کے اُس کلام کا جو مدّتِ دراز تک بے نشان رہنے کے بعد اب روشنی میں آیا ہے، سردست یہ مختصر انتخاب شایقین کو اِس طرف متوجّہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ اِس نمونے کو دیکھکر بھی اِس بات کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو سکے گا کہ مرزا کی اُردو شاعری کن کن مراحل سے گزری ہے۔ ان کے ابتدائی کلام میں بے شبہ بعض خامیاں ہیں لیکن انھی خامیوں کی تہ میں شاعر کی حیرت انگیز وسعتِ نظر اور تخیّل کی وہ خداداد قوّت اور بلندی نظر آتی ہے جن کی بدولت یقین ہے کہ غالبؔ کا شمار ایک دن دُنیا کے چند بہترین شعرا میں ہو کر رہے گا۔

یہودی (از روسی مصنف ٹرگی نف)

(مترجمہ جناب سید تفضل حسین صاحب)

"کرنل صاحب، آج تو ہمیں کوئی قصہ سنائیے"۔ ہم نے آخر کار نکولے ایلی ایچ سے فرمائش کی۔

کرنل مسکرایا۔ سگار کا کش لے کر اس ترکیب سے دُھواں چھوڑا کہ وہ بل کھاتا ہوا اس کی موچھوں کے درمیان سے نکلنے لگا۔ اپنے سفید بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ہم پر ایک نظر ڈالی اور آنکھیں بند کر لیں گویا کچھ سوچ رہا ہے۔ نکولے سے ہم لوگ بہت مانوس تھے اور اس کا ادب کرتے تھے، کیوں کہ زندہ دل اور خوش مذاق افسر ہونے کے علاوہ وہ خصوصاً ہم نوجوانوں سے بہت ہی شفقت اور بے تکلفی سے پیش آتا تھا۔ وہ کشیدہ قامت، فراخ سینہ اور قوی الجثّہ آدمی تھا۔ اس کا سانولا اور شاندار روسی چہرہ، اس کی آنکھیں جن سے ذہانت اور راستی ٹپکتی تھی، اس کی زیر لب مسکراہٹ، اس کی بلند مگر ملائم آواز، غرض اس کی ہر بات ملنے والوں کے دل کو خوش کرتی اور اپنی طرف کھینچتی تھی۔

"اچھا تو سنئے"، اس نے شروع کیا۔

۱۸۱۳ء کا واقعہ ہے۔ ہم نے ڈینزگ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اِس وقت میرا تعلق سپر دار سواروں کی رجمنٹ ای ... سے تھا اور مجھے یاد ہے، میں نے انھیں دنوں میں کارنٹ (سب لفٹنٹ) کے درجہ پر ترقی پائی تھی۔ لڑائی ... ایک تفریح بخش مشغلہ ہے اور سربراہی کی مہمیں بھی بجائے خود دلچسپی سے خالی نہیں ہیں، مگر محاصرہ کن فوج میں سپاہیوں کو غضب کی کاہلی سے سابقہ پڑتا ہے۔

دن بھر کسی خندق یا خیمے کے اندر کیچڑ یا گھاس پر بیٹھے ہوئے ہیں اور صبح سے لے کر شام تک سارا وقت پتے کھیلنے میں گزرتا ہے۔ کوئی بیکاری سے گھبرا اُٹھا تو باہر جا کھڑا ہوا کہ تھوڑی دیر بم کے گولوں اور بندوقوں کی گولیوں کو ہوا میں اُڑتے ہوئے دیکھ کر ہی دل بہلائے۔

پہلے تو قلعہ بند فرانسیسی وقتاً فوقتاً اپنے اچانک دھاووں سے ہماری دلچسپی کا سامان کرتے رہے، مگر بعد چندے انھوں نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ ادھر اپنی یکسانی مہموں سے ہم خود بھی بہت جلد اُکتا گئے۔ آخر خالی بیٹھے بیٹھے یہاں تک نوبت پہونچی کہ قریب تھا مارے وحشت کے ہم چیخیں مارنے لگیں۔ اس وقت میری عمر ۱۹ سال سے زیادہ نہ تھی۔ تندرست، توانا اور پھول کی طرح تر و تازہ تھا۔ اگر کوئی فکر تھی، تو بس اتنی کہ تفنن طبع کا نت نیا سامان ہوتا رہے، دشمن کے مقابلہ میں یا اور کسی طرح سے ۔ ۔ ۔ ۔ آپ میرے مطلب کو پہونچ گئے ہوں گے۔ چنانچہ ایک اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ کام تو کچھ تھا نہیں، میں نے جوا کھیلنا شروع کر دیا۔ چند تباہ کن نقصان اُٹھانے کے بعد دفعتہً میری قسمت نے پلٹا کھایا اور صبح ہوتے ہوتے (عموماً ہم رات کے وقت کھیلا کرتے تھے) میں نے ایک کثیر رقم جیت لی۔ تھکن اور نیند میں چور خیمہ سے نکل کر میں کھلے میدان میں گیا اور ایک ٹیلے پر جا بیٹھا۔ میں آپ سے کیا کہوں، کیسا سہانا اور پُر فضا وقت تھا۔ ہماری قلعہ بندی کے طویل سلسلہ کو کہر نے نظروں سے غائب کر دیا تھا۔ میں نظارہ کرتا رہا، یہاں تک کہ تکان غالب آگئی اور جہاں بیٹھا تھا وہیں اونگھنے لگا۔

کسی کے جان بوجھکر کھنکارنے سے میں چونک پڑا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو ایک یہودی کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔ وہ ایک چالیس سالہ ادھیڑ آدمی تھا۔ خاکی رنگ کا ڈھیلا ڈھالا لبادہ پہنے ہوئے تھا، پاؤں میں سلیپر اور سر پر ہلکی سی سیاہ ٹوپی تھی۔ اس کا نام گرشیل تھا اور وہ ہمیشہ ہمارے کیمپ میں گھومتا رہتا تھا: کسی کو شراب لا دی، کسی کو کچھ اور سامان فراہم کر دیا، غرض وہ ہم لوگوں کی ایسی ہی چھوٹی موٹی ضرورتیں پوری کر دیتا تھا۔ وہ دُبلا پتلا، پستہ قد، سُرخ مو اور چیچک رُو تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بھی سُرخ تھیں، اور لگاتار جھپکتی رہتی تھیں، ناک سُتواں اور خمدار تھی، اور وہ پیہم کھانستا رہتا تھا۔ اس نے میرے سامنے جلد جلد پینترے بدلنا اور جھک جھک کر کورنش بجا لانی شروع کی آخر میں نے پوچھا۔

کہو، تم کیا چاہتے ہو۔

جی میں ۔ ۔ ۔ میں صرف اس واسطے آیا ہوں کہ شاید حضور کو مجھسے کوئی کام ہو۔

مجھے تم سے کوئی کام نہیں، جاؤ اپنا کام کرو۔

جو حکم، بسر و چشم! میں تو حضور کا، ایک ادنیٰ ساخادم ہوں۔ میں نے خیال کیا تھا، شاید کہ

حضور، کوئی خدمت ۔ ۔ ۔ ،

ناحق پریشان کرتے ہو جی ۔ ۔ ۔ چلے جاؤ، بس کہدیا ۔

واقعی ۔ ۔ حضور ۔ ۔ ۔ واقعی ۔ ۔ ۔ مگر حضور عالی ۔ ۔ ۔ خادم کو ۔ ۔ ۔ مبارکباد عرض کرنے کی اجازت تو ضرور ملنی چاہیئے ۔ ۔ ۔ ،

خوب! یہ تم کو کیسے معلوم ہوا؟،

جی، مجھے معلوم ہے ۔ ۔ اچھی طرح معلوم ہے ۔ ۔ ۔ ایک کثیر رقم ۔ ۔ ۔ بہت کثیر ۔ ۔ جی ہاں بہت ہی کثیر، یہ کہکر گرشیل نے ہاتھ پھیلا دیئے اور گردن مٹکانے لگا ۔

مگر خالی خولی باتوں سے فائدہ؟، میں نے جھنجھلا کے کہا، ایسی منحوس جگہ، بھلا روپیہ کس کام آسکتا ہے؟

جی واہ! ۔ ۔ ۔ ایسا نہ فرمایئے حضور، ۔ ۔ ۔ روپیہ بڑی چیز ہے، ہمیشہ کار آمد ۔ ۔ ۔ روپیہ سے آپ جو چیز چاہیں پیدا کر سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ حضور، جو چیز چاہیں ۔ ۔ ۔ بس حکم کی دیر ہے، اور آپ کا خادم، دیکھئے، ہر چیز پیدا کر دیگا ۔ ۔ حضور، ہر چیز! ہر چیز!،

ابے جا، کیوں باتیں بناتا ہے ۔

یہودی اپنی زلفوں کو جھٹک کر بولا، وائے، وائے! حضور کو میرا یقین نہیں آتا ۔ ۔ ۔ وائے لے وائے! پھر آنکھیں بند کر لیں اور سر دھننے لگا ۔

آہا ۔ ۔ میں پا گیا، حضور کا دل کیا چاہتا ہے، میں پا گیا ۔ ۔ جی ہاں، پا گیا ۔ یہودی نے اب بالکل ایسے تیور اختیار کر لئے گویا وہ میرا محرم راز ہے ۔

واقعی!،

پھر اس نے چوکنا ہو کر اپنے اردگرد نظر ڈالی اور میری طرف کو جھکا ۔

اے حضور! ایسی پیاری صورت ہے کہ میں آپ سے کیا کہوں، بہت ہی پیاری ۔ ۔ گرشیل نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور ہونٹ چبانے لگا ۔

حضور، بس حکم کی دیر ہے ۔ ۔ آپ خود دیکھ لیں گے ۔ ۔ یاد رکھئے میں کیا کہتا ہوں ۔ ۔ مگر آپ کو یقین ہی

نہیں آتا۔ ۔ ۔ اچھا تو لا کر نہ دکھادوں ۔ ۔ ۔ ۔ بات تو چبھی ہے۔

میں چپ چاپ اس کا منہ تکتا رہا۔

بس تو یہی ٹھیک ہے۔ ہاں یہی ٹھیک ہے۔ میں لا کے دکھا دیتا ہوں۔

یہ کہکر گرشیل ہنسا اور آہستہ آہستہ میری پیٹھ تھپکی مگر پھر فوراً ہی زقند بھر کر دُور جا کھڑا ہوا، گویا اس پر کسی نے کھولتا ہوا پانی ڈال دیا ہے۔

مگر حضور، کچھ تھوڑا سا پیشگی نہیں دلوایئے گا؟

مگر تم مجھے چکمہ تو نہ دو گے؟ کہیں ادھر اُدھر سے کسی نکمّی چڑیل کو لا کے سامنے کھڑا کر دو۔

اجی واہ، آپ کیا فرماتے ہیں، حضور؟ ۔ ۔ ۔ یہودی نے ہاتھوں کو جھٹک کر غیر معمولی جوش کے ساتھ کہا۔ یہ آپ نے کیوں کر ۔ ۔ ۔ ؟ واہ، وا! اگر میں ایسا کروں تو آپ حکم دیجئے، حضور کہ پانسو، جی ہاں، پورے پانسو کوڑے میری پیٹھ پر لگائیں۔ پھر جلدی سے پوچھا تو آپ حکم دیتے ہیں؟

اس وقت میرے ایک ہمدرد نے اپنے خیمہ کی چک اُٹھائی اور مجھے نام لے کر پکارا۔ میں جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک اشرفی یہودی کی طرف پھینکدی۔

یہودی "آج رات کو، آج رات کو" بڑبڑاتا ہوا پیچھے رہ گیا۔

رات کب ہوتی ہے، دوستو، میں آپ سے اقرار کرتا ہوں، اس انتظار میں میرا دل بہت ہی بے قرار رہا۔ اسی روز اتفاق سے فرانسیسیوں نے چھاپا مارا اور ہماری رجمنٹ ان کے مقابلہ پر بھیجی گئی۔ شام ہوئی۔ لوگ جابجا آگ کے گرد بیٹھے تھے۔ سپاہی کھانا پکا رہے تھے۔ میں بھی ایک جگہ لبادہ بچھا کر لیٹ گیا۔ چا، پی۔ دوستوں کے قصے کہانیاں سنتا اور ہنکارے بھرتا رہا۔ تاش کھیلنے کی تجویز ہوئی، میں نے حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ ایک ایک کرکے سب افسر اپنے خیموں میں چلے گئے۔ آگ بجھنے لگی۔ سپاہی تتر بتر ہو گئے یا وہیں لمبی تان کر سو گئے۔ چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ میں نے اُٹھنے کا نام نہ لیا۔ میرا اردلی بیٹھا آگ تاپ رہا تھا اور اونگتا جاتا تھا۔ میں نے اسے بھی پروانگی دیدی۔ دیکھتے دیکھتے سارے کیمپ میں سناٹا ہو گیا۔ میں اب بھی وہیں لیٹا تھا گویا کسی کا منتظر ہوں۔ رات بہت آچکی تھی تارے جھلملا رہے تھے۔ بڑی دیر تک میں شعلوں کو دم توڑتے ہوئے دیکھتا رہا۔ آخری شعلہ بھی گل ہو گیا۔ ملعون یہودی

تو نے خوب چکمہ دیا! اس خیال سے دل میں پیچ و تاب کھا کر میں اُٹھنے والا ہی تھا کہ قریب سے اے حضور! کی کانپتی ہوئی آواز میرے کان میں آئی۔ آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو گرشیل۔ اس کا منہ بالکل فق تھا۔ زبان لکنت کرتی تھی۔ آہستہ سے میرے کان میں کہا۔

آیئے حضور، آپ کے خیمے میں چلیں۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کے پیچھے چلا۔ یہودی دبکتا سکڑتا نرم نرم گیلی گھاس پر پھونک پھونک کر قدم دھر رہا تھا کہ یکایک مجھے ایک شکل نظر آئی جو بُرقعے میں لپٹی ہوئی بے حس و حرکت ایک طرف کو کھڑی تھی۔ یہودی نے اُسے اشارہ سے بُلایا۔ ۔ ۔ وہ اس کے پاس جا کھڑی ہوی۔ اس نے کچھ اس کے کان میں کہا، میری طرف پھرا، کئی بار سر ہلایا اور ہم تینوں خیمے میں داخل ہوئے۔ آپ سُن کر ہنسیں گے، میری اوپر کی سانس اوپر تھی اور نیچے کی نیچے۔ یہودی دبی زبان سے اٹک اٹک کر کہنے لگا، حضور، آپ دیکھتے ہیں۔ ۔ ۔ آپ دیکھتے ہیں، اس وقت یہ کچھ ڈر گئی ہے، حضور، ڈر گئی۔ حالاں کہ میں نے اس کو سمجھا دیا ہے کہ حضور والا بہت عمدہ افسر ہیں اور بڑے ہی شریف آدمی ہیں۔ ۔ ۔ ڈرو مت ۔ ۔ ۔ ڈرو مت ۔ ۔ ۔ مکرّر کہا، ڈرو مت۔

بُرقعہ پوش شکل بت کی طرح ساکت و صامت تھی۔ میں بھی بے طرح سٹ پٹایا ہوا تھا اور کوئی بات نہ سوجھتی تھی۔ ادھر گرشیل کی بے قراری کا یہ حال تھا کہ ایک جگہ نچلا کھڑا نہ ہوتا تھا اور عجیب عجیب اشارے کر رہا تھا۔

میں نے اس سے کہا، بس آپ اب باہر جایئے۔

وہ چلا تو گیا مگر معلوم ہوتا تھا، بڑی بیدلی سے اس نے میرے حکم کی تعمیل کی ہے۔

میں بُرقعہ پوش شکل کے پاس آیا اور نقاب اس کے چہرہ سے اُلٹ دیا۔

قلعہ کے اندر آگ بھڑکی، اتنے فاصلہ پر اس کی جو کچھ ہلکی سی سنہری جوت پہونچ سکی، اس میں مجھے ایک نوجوان یہودن کا زرد چہرہ نظر آیا۔ اس کی خوبصورتی دیکھکر میں دنگ رہ گیا۔ میں اس کی طرف مُنہ کر کے کھڑا ہو گیا اور چپ چاپ اس کی صورت تکنے لگا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں خفیف سی سرسراہٹ پر میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا کہ گرشیل خیمے کا کونہ اُٹھا کر باحتیاط تمام اندر جھانک رہا ہے۔ میں نے جھنجھلا کر اشارہ کیا، چلے جاؤ، وہ غائب ہو گیا۔

میں نے جی کڑا کر کے پوچھا، تمہارا کیا نام ہے؟

جواب دیا، سارہ۔

دفعتہً اس کی بڑی بڑی لمچھوئی آنکھوں اور اس کے چھوٹے چھوٹے ہموار چمکیلے دانتوں کی سفیدی بجلی کی طرح میری آنکھوں میں پھر گئی۔

میں نے دو چرمی گدے گھسیٹ لئے اور زمین پر بچھا کر اس سے بیٹھنے کے لئے کہا۔ اس نے دوشالہ اُتار ڈالا اور بیٹھ گئی۔ وہ کاسک وضع کی چست، اونچی جاکٹ پہنے تھی کہ سامنے سے کھلی ہوئی، اور اس میں چاندی کی نقشین گول گھنڈیاں لگی تھیں۔ بالوں کے موٹے سیاہ جوڑے کو اس نے اپنے نازک سر کے گرد دوہرا پیچ دیکر لپیٹ رکھا تھا۔ میں اس کے پہلو میں بیٹھ گیا اور اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ اس نے تھوڑی سی مزاحمت کی، مگر اتنی جرأت نہ تھی کہ مجھ سے آنکھ ملاتی اور اس کی سانس بھی کچھ اُکھڑی ہوئی سی تھی۔ میں اس کی مشرقی سج دھج پر عش عش کر رہا تھا اور ڈرتے ڈرتے اِس کی سرو کانپتی ہوئی انگلیوں کو دبا رہا تھا۔

کیا تمھیں روسی آتی ہے؟

ہاں، تھوڑی سی۔

کیا تم روسیوں کو چاہتی ہو؟

ہاں چاہتی ہوں۔

تو پھر تم مجھے بھی چاہتی ہو؟

ہاں، میں تمھیں چاہتی ہوں۔

اب میں نے ارادہ کیا کہ اُسے بغل میں لیلوں مگر وہ تڑپ کر الگ جا بیٹھی۔

جی نہیں، جی نہیں، معاف فرمایئے۔

اچھا خیر، میری طرف دیکھو تو سہی۔

اس نے اپنی کالی کالی دل میں کھبنے والی آنکھیں مجھ سے چار کیں مگر پھر فوراً ہی شرما کر نیچے دیکھنے لگی۔
میں نے بشوقِ تمام اس کا ہاتھ چوم لیا۔ اس نے کن انکھیوں سے مجھے گھورا اور آہستہ آہستہ ہنسنے لگی۔

یہ کیا ہے؟

اس نے آستین سے منہ چھپا لیا اور کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ خیمے کے دروازہ پر گرشیل نے نمودار ہو کر اس کی طرف اُنگلی سے اشارہ کیا۔

اس کی ہنسی موقوف ہو گئی۔

میں نے دانت پیس کر کہا چلے جاؤ، تم نے میری جان ضیق میں ڈال دی۔ گرشیل وہیں کھڑا رہا۔

میں نے پیٹی کھول کر مٹھی بھر اشرفیاں نکالیں اور اس کے ہاتھ میں رکھ کر باہر دھکیل دیا۔ حضور مجھے بھی ستارہ نے کہا۔

میں نے چند اشرفیاں اس کی گود میں بھی ڈال دیں۔ وہ اُن پر یوں جھپٹی جیسے بلّی۔

اب تو میں ضرور پیار لوں گا۔

نہیں، جی نہیں، حضور، اس نے لجا کر کہا۔

آخر تم کیوں ڈرتی ہو؟

جی ہاں، میں ڈرتی ہوں۔

یہ کیا واہیات ہے؟

جی نہیں۔

وہ مجھے سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی، سر کو ایک طرف جھکا لیا اور اُنگلیوں میں اُنگلیاں ڈال کر ایک انگڑائی لی۔

پھر تھوڑے سے سکوت کے بعد بولی، اگر آپ چاہتے ہیں تو۔ . . . یہ لیجئے۔

اس نے اپنا ہاتھ میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں نے اُسے بوسہ تو دیا مگر زیادہ شوق سے نہیں۔ ستارہ پھر ہنسنے لگی۔

میرا خون کھول رہا تھا۔ مجھے اپنے اوپر غصّہ آ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں، واقعی میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں بھی کیسا اُلّو ہوں۔

میں پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

سارہ، سنو، میں تم پر دل وجان سے عاشق ہوں۔

میں جانتی ہوں۔

تم جانتی ہو؟ اور تم خفا تو نہیں ہو؟ کیا تم بھی مجھے چاہتی ہو؟

سارہ نے سر ہلایا۔

میں نے کہا، نہیں، صاف صاف جواب دو۔

اچھا تو آپ مجھے اپنی صورت دکھایئے۔

میں اس کی طرف جھک گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میرے شانوں پر رکھ دیئے اور میرے چہرہ کو غور سے دیکھنے لگی۔ تیوری چڑھائی، مسکرائی، مجھے اپنے نفس پر قابو نہ رہا اور بے اختیار ہو کر اس کا منہ چوم لیا۔ وہ اچھل پڑی اور ایک پھلانگ میں دروازہ پر جا کھڑی ہوئی۔

میں نے کہا، لے آؤ بھی، کیسی شرمیلی ہو۔

اس نے میری بات کا جواب نہ دیا اور وہیں کھڑی رہی۔

میں نے پھر بلایا کہ آؤ یہاں آ کر بیٹھو۔

بولی، نہیں حضور، اب رخصت، پھر کسی وقت سہی۔

گرشیل نے پھر جھانک کر دیکھا۔ دو ایک کلمے اس کے کان میں کہے۔ وہ خم ہوئی اور سانپ کی طرح سٹک گئی۔ میں خیمے سے نکل کر اس کے تعاقب میں چلا، مگر نہ تو اسی کی پرچھائیں ملی اور نہ گرشیل کی رات بھر میری پلک سے پلک نہیں جھپکی۔

دوسری رات کو ہم کپتان کے خیمے میں بیٹھے تھے۔ میں پتے کھیل رہا تھا مگر طبیعت اچاٹ تھی۔ اتنے میں اردلی نے حاضر ہو کر کہا۔

حضور، کوئی شخص آپ سے ملنے آیا ہے۔

کون؟

ایک یہودی۔

مجھے تعجب ہُوا، گرشِل تو نہیں ہے۔ میں نے بازی ختم ہونے تک کھیل جاری رکھا۔ پھر اُٹھ کر باہر آیا۔ میرا خیال صحیح نکلا۔ گرشِیل ہی تھا۔ کیا ڈھیٹھ تھا، چھوٹتے ہی پوچھا

ہاں تو فرمایئے حضور، آپ کا دل خوش ہُوا؟

ارے تجھ پر خدا کی۔ ۔ ۔ ۔! اس وقت کرنل نے اپنے ارد گرد دیکھکر کہا، (یقیناً یہاں کوئی لیڈی تو موجود نہیں ہے۔ ۔ ۔ اچھّا تو مضائقہ نہیں، القصہ!)

ہاں، تجھے خدا سمجھے۔ میں نے کہا، تو آپ مجھسے دل لگی کر رہے ہیں۔

کیوں جی؟

یہ کیسے؟

یہ کیسے! کیا اچھّا سوال ہے!

جی، جی، آپ بڑے خراب آدمی ہیں؛ حضور، لڑکی ٹھیری کم سن اور شرمیلی۔ ۔ ۔ ۔ آپ نے اس کو ڈرایا بیشک ڈرا دیا۔ گرشِل نے طنزیہ کہا مگر ساتھ ہی مُسکراتا بھی جاتا تھا۔

نرالی شرم ہے! اچھّا تو اس نے روپیہ کیوں لیا؟

تو پھر کیا ہوا؟ کوئی روپیہ دیتا ہو تو کیوں نہ لیں؟

گرشِل سنو، اسے پھر لاؤ، ورنہ میں تم سے دست بردار نہ ہونگا۔ مگر اتنی مہربانی کرو کہ اسے یہاں چھوڑ کر تم اُلٹے پاؤں چلے جاؤ اور ہمیں تھوڑی دیر چین سے بیٹھنے دو۔ سُنتے ہو؟

گرشِیل کی آنکھوں سے چنگاریاں اُڑنے لگیں۔

یہ آپ کیا فرماتے ہیں؟ آپ کو اس سے محبّت ہے؟

ہاں، ہے۔

کیا پیاری صورت ہے! ایسی اور کہیں نہ ہوگی۔ فرمایئے، مجھے اس وقت کچھ دلوایئے گا؟

ہاں لو، مگر اتنا خیال رہے کہ راست بازی کے سامنے روپیہ کوئی چیز نہیں۔ اس کو لاؤ اور تم یہاں سے کالا منہ کرو۔ میں آپ اُسے مکان پہونچا آؤں گا۔

اپنی مادیان پر سوار ہو گیا اور میرے پیچھے پیچھے چلا۔ میں نے سارہ سے پوچھا۔

کہو، تم مجھسے راضی ہوئیں؟

وہ میری طرف دیکھکر مسکرانے لگی۔

تم اتنے دن کہاں رہیں؟

آنکھیں نیچی کر کے بولی۔ میں کل آپ کے پاس آؤں گی۔

رات کو؟

جی نہیں، صبح کو۔

یاد کر کے، کہیں دھوکہ دو۔

نہیں، نہیں دھوکہ نہ دوں گی۔

میں اُسے پرشوق نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ دن کی روشنی میں وہ اور بھی حسین معلوم ہوتی تھی۔ مجھے اب تک یاد ہے، اس کے چہرہ کا پختہ کہربائی رنگ اور اس کی کالی کالی لٹوں میں نیلگوں دھاریاں میرے دل میں کھبی جاتی تھیں۔ میں نے زین پر سے جھک کر اس کے نازک ہاتھوں کو بڑی گرمجوشی سے دبایا۔

خدا حافظ، سارہ! خبردار، ضرور آنا۔

اچھا۔

وہ چلی گئی۔ میں نے سارجنٹ کو سواروں سمیت پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور گھوڑے کی باگ اٹھائی۔

دوسرے دن میں بہت سویرے اٹھا۔ وردی پہنی اور خیمہ کے باہر آیا۔ صبح کا پُرفضا وقت تھا۔ سورج ابھی نکلا تھا اور گھاس کی ایک ایک پتی شبنم اور شفق کی سنہری روشنی میں چمک رہی تھی۔ میں ایک بلند دمدمے پر چڑھکر ایک سنگ انداز کے کنارہ پر بیٹھ گیا۔ میرے پاؤں میں ایک بھاری بھرکم آہنی توپ اپنی بھیانک گردن کھلے میدان کی طرف نکالے ہوئے جھانک رہی تھی۔ میں خالی الذہن بیٹھا ہوا ادھر اُدھر نظر دوڑا رہا تھا۔ یکایک کوئی سو قدم کے فاصلہ پر مجھے ایک کمر خمیدہ شخص دکھائی دیا جو خاکی لبادہ پہنے ہوئے تھا۔ وہ بہت دیر تک ایک ہی جگہ

چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر دفعتہً ایک سمت کو تھوڑی دُور تک دوڑا چلا گیا اور تیز تیز چو روں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھا۔

ایک گھٹنا ٹیک کر بیٹھ گیا۔ گردن بلند کرکے ہوشیاری کے ساتھ چاروں طرف دیکھا کان لگا کے سُنا میں اس کی حرکات کو بہت صفائی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بغل میں ڈال کر ایک کاغذ کا پرزہ اور پنسل نکالی اور اُس پر کچھ لکھنے یا لکیریں کھینچنے لگا۔ اس کا ہاتھ بار بار رُک جاتا تھا۔ خرگوش کی طرح چوکنا ہو جاتا تھا۔ اپنے اردگرد کی ہر شے کا بہت تعمق کے ساتھ معائنہ کرتا تھا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ ہمارے کیمپ کا خاکہ اُتار رہا ہے۔ کئی مرتبہ اِس نے کاغذ کو چھپا چھپا لیا۔ آنکھیں آدھی بند کیں آدھی کھلی رکھیں۔ ہوا کی بُو سونگھی اور پھر اپنے کام میں محو ہو گیا۔ آخر کار یہودی گھاس پر پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ ایک پاؤں سے سلیپر نکالی اور وہ پرچہ کاغذ کا اس کے اندر ٹھونس دیا مگر ابھی سنبھل کر کھڑا نہ ہونے پایا تھا کہ دفعتہً اس سے دس قدم کے فاصلہ پر ایک پشتے کی آڑ سے میرے سارجنٹ سلیا فکا کا لمبی موچھوں والا چہرہ نمودار ہوا اور رفتہ رفتہ اس کا بھدّا جسم پورے کا پورا گویا زمین کے نیچے سے نکل آیا۔ یہودی اس کی طرف پیٹھ کئے کھڑا تھا۔ سلیا فکا ایک آن میں اس کے قریب آ پہونچا اور اپنا بھاری پنجہ اس کی گردن پر جما دیا۔ گرشیل معلوم ہوتا کہ سکڑ کر آدھا رہ گیا یا اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ چوب خشک کی طرح کانپ رہا تھا اور خرگوش کی سی نحیف چیخیں اس کے مُنہ سے نکل رہی تھیں۔ اب سلیا فکا نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور دھمکا دھمکا کر خطاب کرنے لگا۔ میں اُن کی گفتگو تو نہیں سُن سکا مگر یہودی کے مایوسانہ اشاروں اور عاجزانہ تیوروں سے میں کچھ کچھ تاڑ گیا کہ صورت حال کیا ہے۔

یہودی دوبار سارجنٹ کے پاؤں پر گرا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک فرسودہ سا رومال نکالا۔ گرہ کھولی اور اشرفیاں نکال کر سلیا فکا کو نذر دیں۔ سلیا فکا نے اس پیشکش کو بہت وقار کے ساتھ قبول کیا، مگر اس کا گریبان نہ چھوڑا اور اُسے برابر اپنی طرف گھسیٹتا رہا۔ گرشیل نے یکبارگی ایک جست لگائی اور چھڑا کر بھاگا۔ سارجنٹ بھی تعاقب میں جھپٹا۔ یہودی خوب تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ بھاگنے میں اس کی نیلی جُرابیں واقعی بڑی پھرتی کے ساتھ چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں مگر سلیا فکا نے تھوڑی دُور جا کر اسے پکڑ لیا اور گود میں اُٹھا کر سیدھا کیمپ کا رُخ کیا۔ میں دمدمے سے اُتر کر اس سے ملنے کو چلا۔ سلیا فکا مجھے دیکھتے ہی چلا یا، آہا، حضور، میں ایک جاسوس کو آپ کی

خدمت میں لا رہا ہوں، جاسوس کو۔۔۔ گرانڈیل روسی پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔

یہودی بچے، باز آ، کیوں ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔۔۔ ٹھہر تو سہی۔۔۔ ملعون۔۔۔ خبردار ہو جا، نہیں تو ٹینٹوا دبا دوں گا۔

بدقسمت گرشل اپنی کہنیاں سلیافکا کی پسلیوں میں چبھوئے دیتا تھا اور پیہم لاتیں چلا رہا تھا اور اس کی آنکھوں کی پتلیاں جلد جلد گردش کر رہی تھیں۔

کیا قصّہ ہے؟ میں نے سلیافکا سے پوچھا۔

حضور، زحمت تو ہوگی، آپ ذرا اس کے دہنے پاؤں سے سلیپر اُتار لیں۔ میرا ہاتھ وہاں تک نہیں پہونچتا۔

وہ ابھی تک یہودی کو گود میں اُٹھائے ہوئے تھا۔ میں نے سلیپر اُتاری اور اُس کے اندر سے احتیاط کے ساتھ لپٹا ہوا کاغذ نکالا، کھولا، اس پر صحیح صحیح نقشہ ہمارے کمپ کا کھچا ہوا تھا۔ حاشیہ پر چند نوٹ درج تھے جو یہودی نے اپنی زبان میں بہت باریک لکھ رکھے تھے۔ اس اثنا میں سلیافکا نے گرشل کو زمین پر کھڑا کر دیا۔ یہودی نے آنکھیں کھولیں، مجھے دیکھا اور میرے پاؤں پر گر پڑا۔

کچھ کہے بغیر میں نے اُسے کاغذ دکھایا۔

یہ کیا چیز ہے؟

جی یہ، کچھ بھی نہیں حضور۔۔۔ میں تو صرف۔۔۔ اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

کیا تم جاسوس ہو؟

وہ میرا مطلب نہیں سمجھا۔ اناپ شناپ بک رہا تھا اور میرے پاؤں کو دباتا جاتا تھا۔

تم جاسوس ہو؟

اس پر غشی کی حالت طاری تھی۔ اس نے سر ہلایا اور چیخ کر بولا، میں!۔۔۔ ہرگز نہیں۔ کیسے ہو سکتا ہے، ناممکن۔ سراسر محال۔ پھر دبی زبان سے کہا، میں تیار ہوں۔ فوراً اسی دم۔۔۔ میرے پاس روپیہ موجود ہے۔ ابھی دیتا ہوں۔ یہ کہکر آنکھیں بند کر لیں۔

اس کی سیاہ ٹوپی پھسل کر گردن پر ڈھلک گئی تھی۔ اس کے سفید بالوں کی لیٹیں بکھری ہوئی تھیں اور اوران سے پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے اور پھڑک رہے تھے۔ اس کی بھویں کھچ گئی تھیں اور چہرہ اُتر گیا تھا۔ سپاہی ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ میں نے شروع میں یہ خیال کیا تھا کہ گرشیل کو قرار واقعی سرزنش کر کے چھوڑ دوں اور سلیا فکا سے کہدوں کہ خاموش رہے، مگر اب معاملہ فاش ہو گیا تھا اور حکام کے علم میں لائے بغیر چارہ نہ تھا۔

میں نے سارجنٹ سے کہا کہ اسے جرنیل صاحب کے پاس لیجاؤ۔

حضور، حضور، یہودی مایوس ہو کر چلانے لگا۔ حضور، میں بے گناہ ہوں۔ اس سے فرمایئے کہ مجھے چھوڑ دے۔ حضور، فرمایئے۔

سلیا فکا نے کہا، چلو آؤ، حضور جرنیل بہادر اس کا فیصلہ کریں گے۔

یہودی میری طرف مڑ کے چلایا، حضور، فرما دیجئے اس سے، رحم کیجئے۔ اس کی چیخوں سے میرے دل پر چوٹ سی لگتی تھی۔ میں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ ہمارا جرنیل ایک جرمن نژاد، متدین اور زندہ دل افسر تھا، مگر قانون جنگ کی پابندی میں بڑا سخت تھا۔ میں اس چھوٹے سے مکان میں گیا، جو عارضی طور پر اس کے لئے بنایا گیا تھا اور چند الفاظ میں اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ میں قواعد جنگ کی سختی سے آگاہ تھا اور اس لئے دوران گفتگو میں جاسوس کا لفظ تک زبان پر نہیں لایا۔ بلکہ تمام سرگزشت اس پیرایہ میں بیان کی گویا بالکل سرسری واقعہ ہے اور کسی توجّہ کے قابل نہیں ہے، مگر گرشیل کی شومئی قسمت کہ جرنیل نے ادائے فرض کو رحم پر مقدم رکھا۔

وہ مجھسے اپنی ٹوٹی پھوٹی روسی زبان میں کہنے لگا، آپ ہو۔ نوجوان، ناتجربہ کار، آپ کو ابھی جنگی معاملات کا تجربہ کہاں ؟ یہ معاملہ جس کی آپ ہم کو رپٹ دیا ہے، اہم ہے، بہت اہم۔ ہاں۔ ہاں وہ شخص کہاں ہے، جو ماخوذ ہوا، وہ یہودی ؟ کہاں ہے وہ ؟

میں نے باہر آکر یہودی کو اندر لیجانے کا حکم دیا۔ وہ لوگ اس شامت زدہ کو ہاتھوں ہاتھ لے گئے۔ بیچارہ مشکل سے کھڑا ہو سکتا تھا۔

جرنیل نے مجھسے مخاطب ہو کر پوچھا، ہاں، وہ نقشہ کہاں ہی جو اس شخص کے پاس سے برآمد ہوا ؟
میں نے کاغذ اس کے حوالہ کیا۔ جرنیل نے اسے کھول کر الٹا پلٹا۔ اپنی نظر اس پر جما دی، اور ناک بھوں چڑھا کر بولا۔
یہ نہایت تعجب کی بات ہی۔ ۔ ۔ کس نے گرفتار کیا اس کو ؟
سلیا فکا نے جھٹ پکار کر کہا، میں نے حضور والا ۔
خوب کیا، شاباش! جناب آپ اپنی صفائی میں کیا کہتے ہو ؟
گرشیل نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا، عالی ۔ ۔ ۔ عالی ۔ ۔ ۔ جناب ۔ ۔ ۔ ۔ بالکل ۔ ۔ ۔ عالیجناب میں بالکل بے قصور ہوں ۔ ۔ ۔ یہ کارنٹ صاحب تشریف فرما ہیں، ان سے دریافت فرمایا جائے۔ میں تو ایک ایجنٹ ہوں ۔ ۔ ۔ عالیجناب بالکل بے قصور، جرنیل نے سنجیدگی سے سر ہلاتے ہوئے دبی زبان سے کہا اس پر جرح کرنی چاہیئے ۔ ۔ ۔ ہاں تو، جناب، آپ کیا اظہار دیتے ہو ؟
میں بے قصور ہوں، عالیجناب میں بے قصور ہوں ۔
مگر یہ تو خلاف قیاس کے ہی، تم ۔ ۔ ۔ روسی زبان میں اس کو کیا کہتے ہیں ۔ ۔ ۔ تم موقع واردات پر گرفتار کیے گئے ہو۔ عین بر سر موقع ۔
سُنئے حضور، میں بے قصور ہوں ۔
کیا تم یہ نقشہ کھینچا ہی تم دشمن کا جاسوس ہو ؟
گرشیل گھبرا کر چلایا، نہیں حضور، میں نہیں ۔
جرنیل نے سلیا فکا کی طرف دیکھا ۔
حضور والا، یہ جھوٹ بکتا ہی، خود کارنٹ صاحب نے اپنے ہاتھ سے نقشہ اس کی سلیپر کے اندر سے نکالا ہی۔
جرنیل نے مجھے دیکھا۔
ناچار سر کے اشارہ سے میں نے اس کی تصدیق کی۔

جناب من، تو آپ دشمن کا جاسوس ہو۔

حواس باختہ مجرم نے گڑگڑا کر کہا۔ میں نہیں، میں نہیں۔

جرنیل نے پوچھا، پہلے بھی تم اس قسم کا معلومات دشمن کو پہونچایا؟ اقبال کرو۔

میری کیا مجال تھی!

جناب من، آپ ہم کو دھوکہ ندو، آپ جاسوس ہو؟

یہودی نے آنکھیں بند کرلیں، سر جھکا لیا اور اپنی عبا کا دامن پھیلا دیا۔

تھوڑی دیر سکوت کرکے جرنیل نے واضح الفاظ میں حکم دیا۔

اس کو پھانسی دیدو۔ ۔ ۔ ایڈ فیوڈور شلیکل مان کہاں ہے؟

سپاہی شلیکل مان، جرنیل کے اڈجوٹنٹ کو بلانے کے لئے دوڑے۔ گرشیل کا چہرہ نیلگوں ہوگیا منہ کھل گیا، آنکھیں اُبل پڑیں۔

اڈجوٹنٹ حاضر ہوا۔ جرنیل نے اسے ضروری ہدایات دیئے۔ منشی آیا اور اپنی مدقوق چیچک زدہ صورت کی جھلکی دکھا کر اُلٹے پاؤں چلا گیا۔ دو تین افسروں نے متجسانہ نگاہوں سے کمرہ کے اندر جھانک کر دیکھا۔

میں نے حتی الامکان بہت ہی شستہ جرمن میں جرنیل سے عرض کیا، حضور والا، کافی تنبیہ ہوچکی، اب اس کو رہا فرما دیجئے۔

اس نے رُوسی زبان میں مجھے جواب دیا، ہم ابھی کہہ رہا تھا، تم جوان آدمی ناتجربکار ہو اور لہذا براہ مہربانی تم خاموش رہو، ہم کو مت دق کرو۔

گرشیل چیخ مار کر جرنیل کے قدموں میں لوٹنے لگا۔

حضور عالی، رحم! رحم! میں پھر کبھی۔ ۔ ۔ حضور، میرے ایک بیوی ہے، ایک بیٹی ہے، حضور، رحم! رحم! ۔ ۔ ۔ واقعی حضور، مجھسے قصور ہوا۔ ۔ ۔ یہ پہلا وقت ہے، حضور، پہلا وقت ہے۔ یقین فرمایئے۔

تم اور کاغذات تو نہیں پہونچایا؟

پہلا وقت ہے، حضور، میری بیوی، میرے بچے۔ رحم! رحم!

مگر تم جاسوس ہو۔

میری بیوی، حضور، میرے بچے۔

جرنیل کا دل اس کی فریاد سے کچھ پسیجا مگر افسوس کہ راہ گریز نہ تھی۔

اس نے دل پر جبر کر کے ایسے انداز میں جب کہ آدمی خلاف مرضی تشدّد سے کام لیتا ہے اور اپنے نرم جذبات کو فرض منصبی پہ قربان کر دیتا ہے۔ کہا

قانون کے موافق اس عبرانی کو پھانسی دیدی جائے۔ لگا دو پھانسی۔ ۔ فیوڈور کاپلچ، مہربانی کر کے آپ اس واقعہ کی رپٹ مرتب کرو۔

گرشیل کی حالت اب بالکل ہی غیر ہو گئی۔ بجائے اس معمولی خوف اور وحشت کے جو قوم یہود کا خاصہ ہے اس کے چہرہ پر وہ کیفیت طاری تھی جو اکثر نزع کے وقت دیکھنے میں آتی ہے۔ وہ پھندے میں پھنسے ہوئے وحشی جانور کی طرح تلملا رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اس کی گھگھی بندھ گئی تھی۔ وہ زمین پر پچھاڑیں کھاتا تھا اور چھاتی پیٹتا تھا۔ اس کے ایک ہی پاؤں میں سلیپر تھی، دوسری پہنانے کا کسی کو خیال نہ رہا تھا۔ عبا کے بند ٹوٹ گئے تھے اور ٹوپی گر پڑی تھی۔ ہم سب کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ جرنیل حکم سنا کر خاموش ہوا تو میں نے پھر عرض کیا۔

حضور والا، بس اب معاف کر دیجئے۔

جرنیل نے چھوٹتے ہی جواب دیا، ہرگز نہیں، قانون کا پابندی لازم ہے، تاکہ دوسروں کو عبرت ہو مگر اس کا لہجہ ہمدردی سے خالی نہ تھا۔

از راہ خدا ترسی۔

بگڑ کر بولا۔ مسٹر کارنٹ، مہربانی کر کے آپ اپنی جگہ پر جائیے اور تحکمانہ باہر جانے کا اشارہ کیا۔

میں سلام کر کے کمرہ سے نکل آیا۔ میں کسی خاص جگہ پر تو متعین تھا نہیں، جرنیل کی قیام گاہ سے تھوڑے فاصلہ پر ٹھہر گیا۔

دو منٹ کے بعد گرشیل برآمد ہوا۔ سلیافکا اور تین سپاہی اس کو تھامے ہوئے تھے۔ یہودی کے حواس بر جا نہ تھے اور بیچارہ کو پاؤں اٹھانا دوبھر تھا۔

سلیافکا میرے پاس سے گزر کر کیمپ میں گیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہاتھ میں رسّی لئے ہوئے واپس آگیا۔ اس کا چہرہ سخت تھا مگر دل سخت نہ تھا اور اس وقت اس کے تیوروں سے ایک گونہ تاسف و دلسوزی ٹپک رہی تھی۔

رسی پر نظر پڑتے ہی یہودی کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ خاک پر بیٹھ کر جزع فزع کرنے لگا۔ سپاہی چپ چاپ اس کو گھیرے کھڑے تھے۔ ان کے چہرے اُداس تھے اور آنکھیں زمین پر لگی ہوئی تھیں۔ میں نے نزدیک پہونچکر گرشل کو مخاطب کیا، جو دودھ پیتے بچے کی طرح ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ وہ میری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ میں دست تاسف ملتا ہوا اپنے خیمے میں چلا آیا۔ ایک گدّے پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

دفعتہً کوئی شخص گھبراہٹ میں دوڑتا ہوا اندر آیا۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو سارہ پر نظر پڑی۔ وہ اپنے آپ میں نہ تھی۔ وہ میرے قریب جھپٹ کر آئی اور میری آستین کھینچ کے بولی، میرے ساتھ چلو، میرے ساتھ چلو،

اس کی سانس پھول رہی تھی۔

کہاں؟ کس واسطے؟ یہیں بیٹھو۔

ابّا کے پاس، ابّا کے پاس، جلدی، اس کو بچاؤ، اس کو بچاؤ۔

ابّا؟ کس کا ابّا؟

میرا ابّا، اس کو پھانسی دے رہے ہیں۔

ہیں! گرشیل تمہارا ۔ ۔ ۔ ۔،

میرا باپ ہے، میں پھر کسی وقت آپ سے سب کہدوں گی۔ خدا کے لئے اُٹھئے، اُٹھئے، میرے ساتھ چلئے، اس نے یہ چند جملے ہاتھ مل مل کر بڑی یاس کے ساتھ ادا کئے۔

ہم دونوں خیمے سے نکل کر دوڑے۔ کھلے میدان میں ایک اونچے سے درخت کی طرف جاتے ہوئے ہمیں سپاہیوں کا ایک غول نظر آرہا تھا، سارہ نے کچھ کہے بغیر ان کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے سٹ پٹا کر کہا، ٹھیرو، ہم کہاں دوڑے جا رہے ہیں؟ سپاہی میرا کہا نہ مانیں گے۔

سارہ مجھے اسی طرح کھینچے لئے جا رہی تھی۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔ آسمان میری آنکھوں میں گھوم رہا تھا،

میں نے پھر کہا، سارہ، سنو تو سہی، یہاں دوڑتے پھرنے سے کیا حاصل؟ بہتر یہ ہوگا کہ میں پھر جرنیل کے پاس جاؤں۔ آؤ ہم تم مل کر چلیں۔ شاید اُسے ترس آجائے۔

سارہ ایک دم ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی اور دیوانوں کی طرح ٹکٹکی باندھکر میرے مُنہ کو تکنے لگی۔

سارہ خدارا سمجھو، میں کیا کہتا ہوں۔ میں تمہارے باپ کے لئے کچھ نہیں کرسکتا، ہاں جرنیل کو البتہ اختیار ہے۔ آؤ اس کے پاس چلیں۔

سارہ نے رو کے کہا، مگر اتنے ہم وہاں پہنچیں وہ اُسے پھانسی پر لٹکا دیں گے۔

میں نے ادھر اُدھر دیکھا، تھوڑی دُور پر منشی کھڑا ہوا تھا، میں نے اُسے پکار کر کہا، آیوان! مہربانی ہوگی، ذرا وہاں تک دوڑتے ہوئے جاؤ اور اُن سے کہو، میں جرنیل بہادر کے پاس سفارش کرنے گیا ہوں، تھوڑی دیر توقف کرو۔

بہت خوب، آیوان روانہ ہوگیا۔

ہم کو جرنیل کے حضور میں جانے کی اجازت نہیں ملی۔ میں نے بہت کچھ منت سماجت کی، قسمیں دلائیں، مگر کوئی تدبیر نہ چلی۔ آخر سارہ نے اپنے بال کھول دئے، سنتریوں کے قدم لئے مگر انھوں نے کسی طرح اندر نہ جانے دیا۔

سارہ نے دیوانہ وار اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا اور بے تحاشا میدان کی طرف دوڑی۔ میں بھی پیچھے پیچھے چلا۔ ہر شخص ہم کو حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔

ہم بھاگا بھاگ سپاہیوں کے پاس جا پہونچے۔ وہ حلقہ باندھے کھڑے تھے اور میرے دوستو، ذرا خیال کرنے کی بات ہے، سب کے سب بیچارے مُصیبت کے مارے گرشل کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے مجھے غیظ آگیا اور اُن کو ڈانٹ کر منع کیا۔ یہودی نے ہم کو دیکھا اور اپنی بیٹی کے گلے میں باہیں ڈالدیں اور سارہ بیتاب ہوکر اس سے لپٹ گئی۔

غریب کو خیال ہُوا کہ شاید معافی مل گئی ہے اور میرا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا کہ میں نے مُنہ پھیر لیا۔ ہاتھ مل کے چلّایا۔ حضور، مجھے معافی ملی، میں نے کچھ جواب نہ دیا۔

نہیں ؟

نہیں۔

بسور کر کہنے لگا، دیکھئے حضور، اسے دیکھئے، یہ لڑکی۔ ۔ ۔ آپ کو معلوم ہے۔ ۔ ۔ یہ میری بیٹی ہے'

میں نے کہا، مجھے معلوم ہے، اور منہ پھیر لیا۔

بولا، حضور، میں خیمے سے زیادہ دُور نہیں گیا تھا۔ کسی طرح۔ ۔ ۔ میرا یہ مطلب نہ ۔ ۔ ۔'

وہ کہتے کہتے رُک گیا اور لمحہ بھر کے لئے آنکھیں بند کر کے کہا، میں آپ سے بس روپیہ اینٹھنا چاہتا تھا حضور، میں اقرار کرتا ہوں۔ ۔ ۔ مگر کچھ اور ۔ ۔ ۔'، میں خاموش تھا۔ گرشیل میری نظروں سے بالکل گر گیا اور وہ اس کی شریک کار بھی۔

پھر اُس نے دھیمی آواز سے رُک رُک کر کہا، اب اگر آپ مجھے بچا لیں۔ ۔ ۔ میں اُسے حکم دیدونگا۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ آپ سمجھے میرا مطلب ؟ ۔ ۔ ۔ ہر بات ۔ ۔ ۔ مجھے بالکل عذر نہ ۔ ۔ ۔'

وہ تھر تھر کانپ رہا تھا اور دہنے بائیں دیکھتا جاتا تھا۔ سارہ چُپ چاپ بے خودی کے عالم میں اس سے چمٹی ہوئی تھی۔ دفعتہً اڈجوٹنٹ نے آکر کہا، کارنٹ صاحب، حضور، جرنیل بہادر نے مجھے آپ کو حراست میں لینے کا حکم دیا ہے اور تم ۔ ۔ ۔'، اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ یہودی کو ۔ ۔ ۔ فوراً۔ سلیافکا یہودی کے قریب آیا۔

میں نے اڈجوٹنٹ سے کہا، فیوڈور کارلچ (اس کے ہمراہ پانچ سپاہی آئے تھے) کم سے کم ان سے کہکر بیچاری لڑکی کو تو یہاں سے الگ کر دو۔'

البتہ، ضرور۔

ناشاد لڑکی اپنے حواس میں نہ تھی۔ گرشیل یہودی زبان میں اس سے کچھ سرگوشی کر رہا تھا۔ سپاہیوں نے بمشکل تمام سارہ کو باپ کی آغوش سے چھڑایا اور اُٹھا کر لیچلے۔ بیس قدم بھی نہ گئے تھے کہ وہ دفعتہً ان کی گرفت سے تڑپ کر نکل آئی اور گرشیل کی طرف دوڑی۔ ۔ ۔ سلیافکا نے اسے روکنا چاہا۔ سارہ نے اس کو ایک طرف دھکیل دیا۔ اس کا چہرہ لال ہو گیا، اس کی آنکھیں چمکنے لگیں، اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کے اور جرمن زبان میں یوں چیخ چیخ کے کوسنا شروع کیا :-

تم پر خدا کی مار ہو، تمہارا ستیاناس جائے۔ لعنت ہو تم پر، تمہاری سات پشت پر خدا کی اور خدا کے ولیوں کی، تمہاری نسل قطع ہو جائے، تم فاقے کر کے مرو۔ تم ایڑیاں رگڑ کے مرو، تم کتے کی موت مرو اللہ رے، بیرحمو! اللہ رے، خونخوارو! زمین تم کو نگل لے، آسمان تم پر پھٹ پڑے، اس کی گردن پیچھے کو ڈھلک گئی اور وہ تیورا کر زمین پر گر پڑی۔ سپاہی اسے اٹھا لے گئے۔

سپاہیوں نے گرشیل کے ہاتھ باندھ دیئے۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ جس وقت میں سارہ کے ساتھ کیمپ سے دوڑتا ہوا آیا تھا، یہ لوگ یہودی پر کیوں ہنس رہے تھے۔ باوجودیکہ موقع ایسا عبرتناک تھا مگر اس کی حالت نہایت ہی مضحکہ خیز تھی۔ دنیا سے، بیوی بچوں سے، عزیز و اقربا سے، جدا ہونے کے قلق میں اس سے کچھ ایسے مضحک اشارے، بھیانک آوازیں اور عجیب و غریب حرکتیں سرزد ہو رہی تھیں کہ اس کو دیکھ کر ہنسی ضبط کرنا دشوار تھا۔ اگرچہ، موقع، عام لوگوں ہی کے لئے ہی نہیں، بلکہ ہم سپاہیوں کے لئے بھی درد انگیز، نہایت ہی درد انگیز تھا۔ کمبخت کی جان مارے خوف کے ہونٹوں پر آگئی تھی۔ زبان پر بغیر یاد جاری تھی، ہائے! ہائے! ٹھیرو، ارے ٹھیرو۔ مجھے کچھ کہنا ہے، بہت کچھ کہنا ہے۔۔۔ نائب سارجنٹ صاحب، آپ تو مجھ سے واقف ہیں! میں ایک ایجنٹ ہوں، بے گناہ ایجنٹ۔ مجھے کیوں پکڑ رکھا ہے؟ ٹھیرو، منٹ بھر ٹھیرو، ارے آدھا منٹ، پاؤ منٹ، ٹھیرو، جانے دو۔ میں تو غریب یہودی ہوں۔ سارہ؟۔۔۔ ارے، سارہ کہاں ہے؟ ہاں، مجھے خبر ہے، وہ کوئر لفٹنٹ صاحب کے خیمے میں ہے (خدا جانے مجھکو یہ نو ساختہ خطاب عطا کرنے سے اس کا کیا مطلب تھا) حضور، کوئر لفٹنٹ صاحب میں خیمے کے پاس موجود ہوں۔

...... (سپاہی گرشیل کو مضبوط پکڑے ہوئے تھے۔۔۔ اس نے زور سے ایک چیخ ماری اور تڑپ کر ان کے ہاتھوں سے نکل گیا)

حضور عالی، رحم کرو! مصیبت کا مارا ہوں، بال بچوں والا ہوں۔ میں آپ کو دس اشرفیاں دیتا ہوں، پندرہ دیتا ہوں۔۔۔ حضور عالی۔۔۔ سپاہی اسے درخت کے قریب کھینچ لے گئے۔

چھوڑ دو، رحم کرو، حضور، لفٹنٹ صاحب! حضور، جرنیل صاحب! کپتان صاحب! آخر انہوں

نے اس کی گردن میں پھندا ڈال ہی دیا۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں اور وہاں سے بھاگا۔

میں دو ہفتہ تک زیرِ حراست رہا۔ مجھے خبر ملی کہ بدنصیب گریشل کی بیوہ اس کے کپڑے لینے کے لیے آئی تھی۔ جرنیل نے اُسے سو روبل دلوائے۔ سارہ کو میں نے پھر کبھی نہیں دیکھا۔ میں لڑائی میں زخمی ہوگیا اور ہسپتال میں داخل کردیا گیا۔ میرے اچھا ہونے کے تک ہی ڈنزگ نے پھاٹک کھول دیئے اور میں اپنی رجمنٹ متعینہ رہائن میں جا شامل ہوا۔
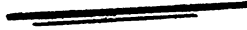
تبصرہ

اُردو کے جدید مطبوعات

ادب

قزاق (مترجمہ و مولفہ جناب محمد عمر صاحب بی اے و نور الٰہی صاحب بی اے قیمت (۸/)
شیخ مُبارک علی تاجر کتب، لاہوری دروازہ - لاہور)

ہم اس سے قبل اس امر کی اطلاع دے چکے ہیں کہ اِن دونوں صاحبوں نے یہ تہیّہ کیا ہے کہ دُنیا کے مشہور اور اعلیٰ ڈراموں کا ترجمہ اُردو زبان میں کریں اور یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ وہ بڑے سرعت سے اپنے ارادے کو پُورا کر رہے ہیں۔ اِس سے پہلے "روحِ سیاست" اور "جانِ ظرافت" دو ڈرامے شائع ہو چکے ہیں اور اب یہ تیسرا ڈراما ہے۔ یہ جرمن کے نامور فلسفی شاعر اور ڈراما نگار شِلر کے مشہور اور زبردست ڈرامے کا ترجمہ ہے۔ اسے محض ترجمہ کہنا ناانصافی ہے، یہ ترجمہ اور تالیف دونوں ہے۔

قابل مترجمین کا شروع سے یہ خیال ہے کہ اِن ڈراموں کا کامل ترجمہ زیادہ سودمند نہیں بلکہ اہل ملک کے ذوق اور ملکی ناٹک کے حالات کے رو سے اِس میں مناسب تصرف کی ضرورت ہے تاکہ پڑھنے والوں اور ناٹک دیکھنے والوں کی دلچسپی بڑھے اور ایسے حالات اور خیالات کے دیکھنے اور سننے سے الجھن میں نہ پڑیں جن سے وہ مانوس نہیں۔ ایک حد تک تو مجھے اِس خیال سے اتفاق ہے یعنی ملکی تھیٹر کی ضروریات کی خاطر تصرف جائز ہے کیوں کہ بعض اوقات ڈرامے محض پڑھنے کے لئے لکھے جاتے ہیں اور اسٹیج کے لئے ان میں کتر بیونت کرنی پڑتی ہے۔ مطالعہ کی حالت بالکل جُدا ہے اور جب وہی تھیٹر کے اسٹیج پر آتا ہے تو اس کا رنگ اور ہوتا ہے۔ وہاں اصل زندگی کی ہو بہو نقل کرنی پڑتی ہے بلکہ نقل کو اصل کر دکھانا مقصود ہوتا ہے، اور پھر اس کے ساتھ اُن شرائط

اور قیود کی پابندی بھی کرنی پڑتی ہے جو تھیٹر کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مثال کے طور پر قزاق ہی کو لیجئے۔ اصل ڈراما مطالعہ کے لئے بے مثل اور عجیب کتاب ہے اور اسی لئے جرمن زبان میں بھی تھیٹر کی خاطر تصرف کر کے نیا اڈیشن تیار کرنا پڑا۔ نور عمر صاحبان (یعنی محمد عمر صاحب و نور الٰہی صاحب) نے بھی اردو کے دو اڈیشن تیار کئے ہیں ایک عام مطالعہ لئے اور دوسرا تھیٹر کے واسطے کیا اچھا ہوتا اگر عام مطالعہ کے لئے تمام و کمال ڈراما کا ترجمہ کر دیا جاتا۔ کیوں کہ اس میں تمدنی حالات و خصوصیات کی وہ نزاکتیں نہیں ہیں جن کی وجہ سے پڑھنے والے کو الجھن پیدا ہو۔ اس کا تعلق زمانہ وسطیٰ سے ہے جس کا تمدن ہر جگہ تقریباً یکساں تھا اور اردو خواں طبقہ اسے بڑے ذوق سے پڑھتا اور مستفید ہوتا۔ تصرف اور ایجاز سے مصنف کے تخیل کی بلند پروازی اس کے پر زور اخلاقی خیالات اور حکیمانہ نکات اور زور قلم کا بہت سا حصہ حذف ہو گیا ہے۔ دوسرا تصرف قابل مؤلفین نے یہ کیا ہے کہ اصل ڈراما ٹریجڈی (المیہ) تھا، انھوں نے اسے کامیڈی (بزمیہ) کر دیا ہے۔ لیکن اس تصرف میں انھوں نے بڑے سلیقے سے کام لیا ہے۔ ان تصرفات سے انھوں نے جرمن ڈراما کو ہندوستانی ناٹک بنا دیا ہے۔ یہاں تک کہ نام بھی بدل دیئے ہیں۔

باوجود ان تصرفات کے ان کی یہ کوشش قابل تعریف اور لایق داد ہے۔ اس ڈراما کی زبان پہلے دو ڈراموں کے مقابلہ میں زیادہ فصیح زیادہ شاندار ہے اور اصل مصنف کے خیالات (جہاں تک اس میں باقی ہیں) اور زور قلم کو بڑے حسن و خوبی سے ادا کیا ہے۔ یہ ڈراما درحقیقت ایک اخلاقی اور مذہبی ڈراما ہے۔ اور بعض خاص کیرکٹر جن پر ڈرامے کا دارومدار ہے، ان کے خیالات اور دلی جذبات، ان کی کمزوری اور قوت کی تصویر اس حسن و خوبی کے ساتھ کھینچی ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ باپ کی محبت اور اس محبت کی کمزوری عجیب و غریب ہے۔ بڑا بیٹا حالات و زمانہ کی ناسا عدت اور مایوسی سے گھبرا کر قزاقوں میں جا ملتا اور ان کا سردار ہو جاتا ہے۔ باپ کو اس کا حال معلوم نہیں مگر چھوٹا بیٹا کینہ سازشوں اور بد طینتی سے باپ کو بڑے بھائی سے برگشتہ کر دیتا ہے اور فریب سے اس کی موت کا یقین دلاتا ہے۔ باپ بیٹے کی محبت میں بیقرار ہے، زندگی دوبھر ہے۔ چھوٹا بیٹا اگرچہ اس عیاری سے وارث ہو جاتا ہے مگر جب تک باپ زندہ ہے مال و دولت پر قابض نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ باپ کو حقیقی معنوں میں زندہ در گور کر دیتا ہے۔ یعنی ایک قسم کے چاہ سلیمان میں قید رکھتا ہے۔ ابھی مرنے نہیں پاتا کہ قزاق کا گروہ درحقیقت بڑا

بیٹا ہے) ہاتھوں قید سے مخلصی پاتا ہے لیکن جب اُسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے بیٹے پر انتقام کی آنچ آنے والی ہی تو وہ بیقرار ہو کر تڑپنے لگتا ہی اور نہایت لجاجت سے رحم کی التجا کرتا ہے۔ جب اُس سے یہ کہا جاتا ہی کہ ایسا نالائق بیٹا۔ رحم کا مستحق نہیں تو وہ کس محبت سے کہتا ہی کہ "نالائق بیٹا، پھر بھی میرا بیٹا ہی" قزاق اگرچہ بری صحبت میں ہی۔ ڈاکوؤں لٹیروں کا سردار ہے مگر اس کے دل میں شرافت کا نور ابھی باقی ہے وہ باوجو اس ناشائستہ صحبت کے مظلوموں کی حمایت کرتا اور ظالموں کو اُن کے اعمال کی سزا دیتا ہی۔ وہ اُس قانون کی جو مظلوموں اور بیکسوں کو کچلے ڈالتا ہی، علانیہ مخالفت کرتا ہے اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر دنیا کی چول ٹھیک ٹھیک بٹھانا چاہتا ہی۔ لیکن قزاقی آخر قزاقی ہے۔ ایک خاطی کی سزا کے لئے بیسیوں بے گناہ مارے جاتے ہیں، ایک مظلوم کے انتقام کے لئے بیسیوں معصوموں کا خون ہوجاتا ہے۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہی۔ آخر میں متنبہ ہوتا ہی۔ چھوٹے بھائی کی بدطینتی، کمینہ سازشیں، بیدردی اور بے رحمی، قزاق کی شرافت کو اور نمایاں کردیتی ہیں۔ بُرائی کو حقیقی رنگ میں دکھانا نیکی کی خدمت ہی۔ جمیلہ (ایمیلیا) ان کی چچازاد بہن ہی۔ بڑے بیٹے یعنی قزاق پر عاشق ہے۔ چھوٹا بیٹا جب امارت حاصل کرلیتا ہے تو یہ اُس کی دست نگر اور محتاج ہوجاتی ہی اور وہ اپنی حکومت اور دباؤ سے چاہتا ہی کہ جمیلہ کو اپنے قبضے میں لے آئے۔ مگر اس کی محبت ایسی سچی اور مستقل ہی کہ وہ اُس کی امارت اور حکومت کی مطلق پرواہ نہیں کرتی۔ یہ تمام کیریکٹر ایسی خوبی سے بیان کئے گئے ہیں کہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

اصل ڈراما نہایت ہی ہولناک ٹریجڈی ہے۔ اُس اڈیشن میں جو تھیٹر کے لئے تیار کیا گیا تھا، اسے بہت کچھ نرم کردیا ہی لیکن ہمارے مترجم مؤلفین نے انجام کو بالکل بدل کر اُسے اچھی خاصی کامیڈی (بزمیہ) بنادیا ہی آخر میں میں اِن دونوں صاحبوں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ آیندہ جب دوبارہ طبع کی نوبت آئے تو اُس ڈراما کا تمام وکمال ترجمہ اُردو میں کردیں اور میں اُنھیں یقین دلاتا ہوں کہ اُن کے ترجمہ کی ضرور قدر ہوگی۔ میرے بار بار اصرار کرنے کا مقصد یہ ہی کہ میں چاہتا ہوں کہ دنیا کے بہترین ڈراموں کے کامل اور صحیح ترجمے اہل وطن کے سامنے پیش کئے جائیں تاکہ وہ صحیح طور پر اندازہ کرسکیں کہ ڈراما کسے کہتے ہیں اور ممکن ہی کہ اُن میں جو جوہر قابل ہیں وہ اپنی زبان میں ویسے یا اُن سے بہتر ڈرامے تصنیف کرسکیں۔ اگر ہم اپنے ترجموں کی بدولت ایک آدھ شخص بھی

ایسا پیدا کرسکیں تو اُردو ادب پر کیا کم احسان ہوگا؟ خصوصاً یہ زمانہ ڈرامے کے لئے بہت موزوں ہے ملک میں انقلابی حالت پیدا ہوگئی ہے، خیالات میں ہیجان اور دل و دماغ میں حرکت دکھائی دیتی ہے، سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی حالت میں تغیر عظیم پیدا ہوگیا ہے اور جدھر نگاہ اُٹھائیے ڈرامے کے لئے اچھا خاصا سامان نظر آتا ہے۔ حالات و واقعات پکارے کہہ رہے ہیں کہ بس ایک جادو نگار قلم اور بلند خیال دماغ کی ضرورت ہے۔

خنجر ہلال۔ یہ ایک تاریخی ڈراما ہے جو منشی غلام قادر صاحب فرخ امرتسری نے ترکوں کے معاملاتِ حال پر لکھا ہے۔ اِس میں محاربۂ عظیم یورپ کے بعد ٹرکی کی بے بسی، اتحادیوں کی ریشہ دوانیاں، یونانیوں کی دست برد، ترکوں کی احیا اور کامیابی کا مرقع کھینچا ہے۔ ڈرامے کے لئے مضمون بہت اچھا ہاتھ آیا ہے، فرخ صاحب مشاق شاعر اور ناثر ہیں۔ چنانچہ اِس ڈرامے میں اُن کی نظم و نثر اس کی شاہد ہے۔ اُردو میں ڈرما نویسی کا فن نہایت پست حالت میں ہے۔ اِس وقت یہ آخری ڈراما ہے جو اُردو میں لکھا گیا ہے ترجمہ نہیں، غیر زبان کے کسی ڈرامے سے ماخوذ نہیں؛ بلکہ فرخ صاحب کی اپنی تصنیف ہے۔ لیکن اِس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک اُردو ادب کے اس شعبۂ لطیف نے کوئی ترقی نہیں کی۔ ڈرامے میں اصل چیز کیرکٹر ہے۔ خاص اشخاصِ ڈراما کی خصوصیات اِس خوبی سے بیان کی جاتی ہیں کہ وہ زندہ اور جیتے جاگتے نظر آتے ہیں۔ یہ ڈراما نویس کا خاص کمال ہے کہ جوں جوں ڈراما ترقی کرتا جاتا ہے یہ خصوصیات بھی ساتھ ساتھ نمایاں ہوتی جاتی ہیں۔ چنانچہ بعض مشہور ڈراموں کے کیرکٹر تاریخی مشاہیر سے بھی زیادہ معروف اور مقبول ہیں۔ خنجر ہلال میں یہ بات بالکل مفقود ہے اِس کے اشخاص بالکل بے جان معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ غازی مصطفےٰ کمال جو اِس ڈرامے کے خاص کیرکٹر ہیں وہ بھی بے رنگ نظر آتے ہیں ہم چونکہ روزانہ اخبارات اور رسالات پڑھتے رہتے ہیں اِس وجہ سے پہلے سے ہمارے دل میں اُن کی بے انتہا وقعت ہے ورنہ اگر کوئی نیا شخص اس ڈرامے کو پڑھے تو کبھی اس کے دل میں وہ حرمت و وقعت پیدا نہیں ہوسکتی اِس ڈرامے میں بہت اچھا موقع تھا کہ قابل مصنف اُن کے کمالات اور خصوصیات کو رفتہ رفتہ اُبھارتے اور ترقی دیتے۔ مجھے اِس میں بھی شبہ ہے کہ یہ ڈراما بغیر کمی بیشی اور کاٹ چھانٹ کے اسٹیج پر بھی کامیاب ہوسکتا ہے یا نہیں بعض سین غیر دلچسپ اور بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں۔ اِس بات کا خیال نہیں رکھا گیا کہ کون سی باتیں ترک کردینی چاہئیں اور کون سی نمایاں کرکے دکھانی چاہئیں۔ شاعر اور خاص کر ڈراما نویس کا بڑا کمال یہی ہے کہ وہ سب کچھ

دیکھتا ہے مگر اس کی نظر وہی چیز انتخاب کرتی ہے جو سارے معاملے کی جان ہو۔ انھیں وجوہ سے ہم نے "قزاق" کے تبصرے میں اعلیٰ درجے کے ڈراموں کے بے کم و کاست ترجمہ کی ضرورت خیال کی ہو۔

ڈرامے کی شروع میں دو تصویریں بھی ہیں۔ ایک غازی مصطفےٰ کمال کی اور دوسرے جس میں غازی موصوف اور اُن کے وزرائے حکومت ہیں۔ یہ دونوں تصویریں اس قدر خراب ہیں کہ اگر نہ ہوتیں تو اچھا ہوتا چھپائی اور کاغذ بھی بہت معمولی ہو۔ قیمت (عہ) منیجر صاحب دار الاشاعت امرت سر سے مل سکتا ہو۔

زندۂ جاوید۔ یہ نظم سیدہ انیس الفاطمہ بیگم صاحبہ (مسز محمود) کی تصنیف ہو جس میں مصنفہ نے امام حسینؑ کی شہادت کا واقعہ بیان کرکے اُسے موجودہ حالات سے مطابق کیا ہے اور اُسی ایثار و صداقت کی ترغیب دی ہو۔ کاش ہمارے مرثیہ گو شاعر رونے رُلانے کے بجائے اِس عظیم الشان اور بے مثل سانحہ سے اخلاقی کام لیتے۔ اگرچہ یہ نظم اعلیٰ درجہ کی نہیں ہے تاہم قابل مصنفہ قابل شکر گذاری ہیں کہ انھوں نے قوم کے ابھارنے کے لئے اپنی شاعری سے ایسا مفید کام لیا۔ شروع میں آٹھ صفحہ کا ایک مقدمہ بھی ہے اِس کتاب کا کُل منافع مصیبت زدگان اناطولیہ کے امدادی سرمایہ میں داخل کیا جائے گا۔ گویا اِس کا خریدنا اور پڑھنا ایک پنتھ دو کاج ہو (چھوٹی تقطیع تعداد صفحات ۲۳ قیمت (۵ر) ذیل کے پتہ سے مل سکتی ہو۔

سیدہ انیس الفاطمہ بیگم صاحبہ۔ مکان حاجی مولوی علی بخش صاحب مرحوم محلہ مسلع پور ڈاکخانہ مہندرو۔ پٹنہ (عظیم آباد)

درسِ عمل۔ یہ مولوی محمد حسین صاحب محویؔ صدیقی لکھنوی کے چند نظموں کا مجموعہ ہو جو دائرۂ ادبیہ لکھنؤ نے شائع کیا ہو۔ اس میں کل دس نظمیں ہیں جن کے عنوان یہ ہیں۔ نوائے درد، نوائے ملّت، نالۂ غم، سہرۂ عمل صلائے عمل، فغانِ دل، حامیانِ قوم سے خطاب، فریاد معصوم (ایک یتیم موپلا بچے کی زبان سے) جوانِ ترک، اِن ناموں سے نظموں کی کیفیت عیاں ہو۔ یہ سب کی سب نظم کی اُس قسم میں سے ہیں جو ہمارے ہاں قومی نظم کہلاتی ہو۔ محویؔ صاحب کی نظم و نثر سے اہلِ زبان ناواقف نہیں اور اس لئے کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔ کتاب چھوٹی تقطیع پر اچھی چھپی ہو۔ قیمت (۴ر) ہے۔

جوئے شیریں (مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ)

محمود شاہ خاں صاحب بی اے ال ال بی کی فرہادوار کوشش کا نتیجہ ہے۔ یعنی ایک ہی نظم (اور پھر نثر)

میں سے الگ الگ چار نظمیں تراشی ہیں جس کا نمونہ ذیل میں درج ہے:-

یادؔ خدا کی دل سے کر پھیر نہ منہ اِدھر اُدھر	عمر کر اس طرح بسر جیسے کسی کا ہو سفر
دہر کی ہے ہوا یہی رسم جہاں بھی ہے یہی	جشن میں دل کہیں لگا اور کہیں ہی چشم تر
دستِ قضا نے مجھکو جب رہروِ زندگی کیا	مایۂ لذتِ فنا دل کے لئے بنی سپر
آگ لگا کے شوق کی کس نے دلِ خراب میں	پھونک دیا کلیم کا ایک ہی آنچ میں جگر
عیش پہ خاک ڈال کر بامِ فلک کی سیر ہو	آج یہ افسوں گری اے دلِ ناصبور کر
باغِ وفا میں دیکھ آ، کر کے نثار جان و دل	وعدۂ وصل پر نہ جا مان یہ قولِ معتبر
شاخِ نہال آرزو خشک ہی انتظار میں	بادِ سحر کو یہ خبر دے کہیں جا کے نامہ بر
عہدِ قلمروِ الست بھول گیا ہر ایک مست	حیف کہ دل سا رازدار وہ بھی خطا کری اگر
دیکھئے یہ ادا نئی دلبرِ بے نیاز کی	پھول کو خود گرا دیا صحنِ چمن میں توڑ کر

ان دس شعروں میں جن الفاظ پر ہم نے نشان ۱ بنا دیا ہے ان کو جمع کرنے سے پہلی مثنوی کا پہلا مصرعہ پیدا ہوگا۔ ع

"یاد ہے لذتِ پیمانِ الست"

نشان ۲ کے الفاظ جمع کرنے سے دوسری مثنوی کا پہلا مصرعہ بن جائے گا۔ ع

"دہر میں کس نے یہ افسوں گری"

اسی طرح ۳ اور ۴ کے تحت میں جو الفاظ یا جزو الفاظ آئے ہیں ان کو یکجا کرنے سے دو مصرع تیار ہو جاتے ہیں

(۱) کسی نے مجھکو کل آکر خبر دی اور

(۲) اے مایۂ عیشِ جاودانی

اسی طور پر ایک ہی نظم سے چاروں مثنویوں کے مصرعے نکلتے چلے آتے ہیں۔ آگے جا کر نظم کے بجائے نثر کی عبارت آگئی ہے اور پھر ایک دوسری نظم اور نثر ہے لیکن وہ چاروں مثنویاں اسی طریق پر مرتب ہوتی چلی جاتی ہیں جس کا نمونہ اوپر پیش کیا گیا ہے۔

اِس دشوار اہتمام سے نظم اور مثنویوں میں کہیں کہیں بہت تکلف پیدا ہوگیا ہے جس کا خود فاضل مصنف کو اعتراف ہے۔ نیز معنوی اعتبار سے بعض شعر (خاص کر چوتھی مثنوی کے) بالکل خلاف محل اور محض قافیہ پیمائی نظر آتے ہیں۔ بایں ہمہ یہ جدید اور لطیف صنعت مصنف کی ذہانت و قدرتِ شعر گوئی کا بہترین ثبوت ہے اور اِسی لئے ہمیں ان سے یہ شکایت کرنے کا حق ہے کہ وہ اپنی ان خداداد قوتوں سے کوئی اور مفید کام کیوں نہیں لیتے کہ اُنھیں اِس قسم کی "سنگ تراشی" بلکہ کوہ کنی میں صرف کر رہے ہیں جس میں اعجوبیت کے سوا اور کوئی خاص خوبی نہیں ہے۔

سفرنامہ

۱۔ مشرقی ترکستان (دائرہ ادبیہ لکھنؤ۔ قیمت ۶؍)

سر اوریل آسٹائن مشہور سیاح وسط ایشیا جب دوسرے سفر سے واپس ہوئے تو انھوں نے رائل جغرافیکل سوسائٹی لندن میں اپنی سیاحت اور تحقیقات کے متعلق ایک لکچر دیا۔ اور اپنے ایران و ہندوستان و افغانستان و ترکستان کے اُن دوستوں کے لئے جو انگریزی نہیں جانتے فارسی میں ترجمہ کرایا۔ اِس فارسی ترجمہ سے سید محمود اعظم فہمی صاحب نے اُردو میں ترجمہ کیا۔ سر اوریل کا اصل سیاحت نامہ دو ضخیم جلدوں میں ہے۔ یہ لکچر انھوں نے ۱۹۰۹ء میں دیا تھا۔ اِس کا ترجمہ اب اُردو میں چھپا ہے جب کہ تیسرے سیاحت سے بھی وہ کامیاب اور مالا مال ہو کر واپس آ چکے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا اگر اُس تیسری سیاحت کی بھی مختصر سی کیفیت اس کے آخر میں درج کی جاتی۔ وہ اس پر بھی کئی لکچر دے چکے ہیں۔ تاہم اِس کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ یہ پیرِ جواں ہمت کیسے کیسے خطرناک اور دشوار گزار مقامات پر پہونچا ہے جہاں آدمی کا جانا ممکن نہیں معلوم ہوتا اور وہاں سے کس قدر غیر معمولی محنت و مشقت کے بعد آثار قدیمہ کی وہ لازوال دولت لے کر آیا جو صدہا سال سے انسان کی آنکھوں سے پوشیدہ تھی۔ اِس نے قدیم کتابوں اور قدیم صنعتوں اور تحریروں اور عجائبات کے سَو اونٹ لاد کر بھیجے اور یہ سب چیزیں اُس نے صحرائے لق و دق میں سے کھود کھود کر نکالیں یا ایسے خفیہ مقامات سے ڈھونڈھ کر نکالیں جن کا پتہ کسی کو نہ تھا۔ اِس شخص کی حیرت انگیز ہمت و استقلال خطرات اور دشواریوں سے صابرانہ مقابلہ

اپنے مقصد کی رو سے نہایت قابلِ تعریف اور سبق آموز ہے۔

۲- سیاحتِ ہوا (دائرۂ ادبیہ لکھنؤ- قیمت ع۸ر)

"سیاحتِ زمین" کے طرز پر یہ دوسرا ناول بھی دائرۂ ادبیہ لکھنؤ نے انگریزی سے ترجمہ کرا کے شائع کیا ہے اور اس میں بھی قصّے کے پیرائے میں ہوائی جہازوں کے متعلق بہت کچھ معلومات جمع کی ہے اور اگرچہ اس سے اصلی فائدہ یورپ و امریکہ والے ہی اُٹھا سکتے ہیں پھر بھی اہلِ ہند کے لئے ایسی کتابیں دلچسپی سے خالی نہیں لیکن کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل فرانسیسی ناول بیس بائیس سال پہلے لکھا گیا تھا اور اسی لئے اس میں فنِ پرواز کے متعلق بعض ایسے پرانے مباحث پائے جاتے ہیں جنھیں علمی دُنیا طے کر چکی اور جنھیں ایسی شدّ و مد کے ساتھ تازہ کرنے کا اب کوئی موقع نہیں ہے۔

قابل مترجم نے کتاب میں کہیں کہیں جغرافی اور تاریخی حواشی لکھنے میں کافی محنت و دردسری اُٹھائی ہے لیکن ہمارے خیال میں بہتر ہوتا کہ وہ اتنا وقت خود ترجمے کو زیادہ صاف و سہل بنانے میں صرف کرتے۔ بحالتِ موجودہ کتاب کی بعض عبارتیں پیچیدہ اور ہمارے روزمرّہ کے بہت خلاف نظر آتی ہیں اور بعض غیر ضروری مضامین بھی ہمارے ذوق اور معاشرت سے اِس قدر بعید و بیگانہ ہیں کہ شاید معمولی اُردو خواں اِن کا کوئی لطف حاصل نہیں کر سکتے۔ بہتر ہوتا کہ انھیں ترجمے سے حذف کر دیا جاتا۔

لغاتِ اُردو (جلد اوّل و دوم- مؤلفہ خواجہ محمد عبد الرؤف صاحب عشرتؔ لکھنوی- قیمت ۱۲ا ر و ۸ ر)

اُردو لغت کے یہ دو رسالے ہیں- پہلی جلد میں مصادر مفردہ کے لغوی اصطلاحی معانی اور محاورے ہیں اور دوسرے میں مصادر مرکبہ معاون فعل کے لغوی اصطلاحی معنی اور اُن کے استعمال کی مثالیں درج ہیں۔ یہ رسالے اگرچہ محققانہ نہیں ہیں مگر صحت اور احتیاط سے لکھے گئے ہیں اور طلبہ اور عام پڑھنے والوں کے لئے جو زبان سیکھنا چاہتے ہیں بہت مفید ہیں- ہمیں دیباچے میں یہ پڑھ کر بہت ہی افسوس اور رنج ہوا کہ خواجہ صاحب نے دوبارہ اُردو زبان کی کامل لغت تیار کی اور دونوں بار مسودے تلف ہو گئے۔ ایک مسودہ تو طغیانی کے نذر ہوا، اور دوسرا ایک سرپرست کے ہاتھوں ضائع ہو گیا۔ اب یہ تیسری بار ہے- اور اس وجہ سے انھوں نے لغت کو چھوٹے چھوٹے رسالوں میں شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ مصادر

مفرد او رمصادر مرکبہ کو الگ الگ دو رسالوں میں کیوں شائع کیا۔ مفرد مصادر کے ساتھ مرکب مصادر بھی آسکتے تھے اور ایک جگہ ہونے سے ناظرین کو آسانی ہوتی۔ اب یہ بڑی دقّت ہی کہ مفرد تو ایک جلد میں ہیں اور مرکب دوسری جلد میں اور تیسری جلد میں مصدر مرکب کی قسم دوم کا بیان ہوگا، گویا ایک مشکل اور بڑھ جائے گی۔ خواجہ صاحب کو مغالطہ ہوا ہی۔ وہ دیباچے میں فرماتے ہیں "مصادر کے معانی لکھنے میں اہلِ لغت نے یہ فرق کر دیا ہی کہ مصدر مفرد اور مصدر مرکب کے ایک ہی معنی سمجھ کر مفرد مصدر کے معنی کی مثال مصدر مرکب سے پیش کی ہی جن میں درحقیقت زمین آسمان کا فرق ہے۔ لغت دیکھنے والے فائدے کے بدلے نقصان اُٹھاتے ہیں اور یہ تقلید بھی انگریزی زبان کی ہی" اوّل تو یہ انگریزی کی تقلید نہیں، دوسرے اگر کسی نے ایسا کیا ہی کہ باوجود فروق معانی کے ایک ہی معنی لکھدیئے ہیں تو غلطی کی، آپ اس کی تقلید نہ کریں۔ مگر اس سے مصادر کی تین الگ الگ جلدیں لکھنے کا جواز نہیں نکلتا۔ اگر دوسرے لغت نویسوں نے اس معاملے میں تفریط کی ہی تو خواجہ صاحب نے بھی افراط سے کام لیا ہی۔ مثلاً "تاپا کرنے" کے معنی "سینکتے رہنا"۔ اس کے لکھنے سے کیا حاصل۔ ایسے بیسیوں مصادر ہیں جن کے ساتھ کرنا استمراری معنی دیتا ہے۔ مثلاً پیا کرنا، لکھا کرنا پڑھا کرنا وغیرہ وغیرہ صرف دیباچے میں یہ بتا دینا کافی ہی کہ کرنا جب امدادی فعل ہوتا ہے تو اس سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں۔ ہاں اگر اس کے خلاف کوئی نئے معنی پیدا ہوں تو لکھنا لازم ہے۔ تاپا کرنے کے نیچے "تانا کرنا" ہے اس کے معنی داغنا، طعنہ دینا لکھا ہے۔ لیکن "تاننا" کے معنی بھی تو یہی ہیں۔ فرق کیا ہوا۔ غالباً یہاں لکھنے میں سہو ہوا ہی۔ کیوں کہ مثال سے صحیح معنی معلوم ہوگئے ہیں۔ اِسی طرح جانا، ہونا، لگنا وغیرہ متعدد امدادی فعل ایسے ہیں کہ جب دوسرے مصادر کے ساتھ آتے ہیں تو معنی میں ایک خاص بات پیدا ہوجاتی ہے۔ اِس کا بتا دینا کافی ہے۔ اب ہر مصدر کے ساتھ بلا وجہ ان افعال کو لگا کر تعداد بڑھانا فضول ہے۔ بھلا فرمانے لگنا بھی کوئی محاورہ ہی جو لغت میں لکھنے کے قابل ہی۔ مگر خواجہ صاحب نے یہ اور ایسے بہت سے مصادر مرکبہ (معاون فعل) درج لغت فرمائے ہیں۔ جب تک خاص معنی پیدا نہ ہوں اُن کا لغت میں لکھنا غیر ضروری ہی۔ اِس پر بھی جدید جلد قایم کرنے کی ضرورت ثابت نہیں ہوتی۔

"پا جانا" کے معنی صرف "ملنا" لکھے ہیں۔ اصطلاحی معنی رہ گئے ہیں۔ یعنی مطلب

مگر پالینا رہ گیا ہے۔ پھوٹ نکلنا کے معنی اثر ہونا لکھا ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا مثال یہ دی ہے۔ خدا کرے میرا نمک پھوٹ نکلے۔ اس کے معنی اثر ہونے کے نہیں بلکہ یہ دعا ہے کہ میرا نمک کھاکر جو مجھ سے بیوفائی کی ہے تو اس نمک حرامی کی سزا ملے۔ بھڑنا کے اصطلاحی معنی مقابل ہونا بتائے ہیں۔ یہ اصطلاحی معنی نہیں بلکہ لغوی معنی ہیں ہندی میں بھڑنے اور بھٹنے کے لغوی معنی ملنے کے ہیں۔ مدھ بھیڑ یا منٹھ بھیڑ میں یہی لفظ ہے اوندھنا کے معنی اُلٹا ہونے کے بتائے ہیں۔ مثال دی ہے کہ لوٹا اوندھا ہے سیدھا کر دو۔" یہاں اوندھا صفت ہے بعینہٖ جیسے سیدھا۔ اوندھا استعمال میں نہیں آتا۔ اوندھانا البتہ درست ہے۔ ہنکارنا بمعنی چیخنا۔ لیکن اس کے اصطلاحی معنی نہیں لکھے۔ جولاف مارنا ہیں۔ اسی طرح برسنا کے اصطلاحی معنی لکھنے سے رہ گئے ہیں۔ پھسلنا کے صرف ایک اصطلاحی معنی لکھے ہیں دوسرے معنی چھوڑ دیئے ہیں۔ اُبنا لکھا ہے مگر ابنا نہیں لکھا۔ شاید غیر فصیح سمجھا گیا ہے۔ اسی طرح تیورانا مصدر بھی اس رسالہ میں درج نہیں کیا گیا۔ شاید آج کل اس کا استعمال معیوب خیال کیا جاتا ہو یا متروک ہوگیا ہو بہر حال میر انیس تو استعمال کرتے تھے جچنا کے ایک معنی تخمینہ ہونا تو لکھا ہے مگر دوسرے معنی پسند آنا نہیں لکھے۔

یہ چند خفیف فروگزاشتیں ہیں جو سرسری نظر میں ہمیں معلوم ہوئیں مگر ان سے کتاب کی اصل خوبی پر کوئی حرف نہیں آتا اور اُمید ہے کہ آیندہ ان کی اصلاح ہو جائے گی۔ لیکن دو باتوں کی طرف ہم خاص طور پر خواجہ صاحب کی توجہ مبذول کرنا چاہتے ہیں۔ ایک اعراب بڑے احتیاط کے ساتھ لگائے جائیں۔ بعض جگہ جہاں اعراب کی ضرورت تھی نہیں لگائے گئے اور بعض مقامات پر غلط اعراب لگے ہوئے ہیں۔ دوسرے الفاظ کے درج کرنے میں ترتیب کا مطلق لحاظ نہیں کیا گیا۔ ہر حرف کے نیچے الفاظ بلا ترتیب لکھ دیئے گئے ہیں۔ مثلاً الف کے تحت میں سب سے اوّل آزمانا اس کے بعد اُنکنا آنکنا، آنا اور پھر اُبلنا درج ہے۔ ایک لفظ کی تلاش میں ساری ردیف دیکھنی پڑتی ہے۔ اُمید ہے کہ آیندہ طبع میں اس کی اصلاح فرما دی جائے گی۔

مذہب

اسلام میں کوئی فرقہ نہیں - اِس کتاب میں خواجہ کمال الدین صاحب امام مسجد ووکنگ (انگلستان) مشہور اسلامی مشنری نے بدلائل اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام میں دوسرے مذاہب کی طرح فرقے نہیں۔ یعنی اصول میں کہیں اختلاف نہیں، اگر ہی تو فروعی امور اور جزئیات میں ہے یعنی یہ ایسے امور ہیں جن میں اختلاف کرنے سے کوئی شخص اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ اِس مسئلہ پر انھوں نے اس کتاب میں بہت اچھی بحث کی ہے۔ چوں کہ خواجہ صاحب انگلستان میں تبلیغ اسلام کا کام کر رہے ہیں اکثر لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہوتا تھا کہ وہاں کے نومسلموں کو کس فرقے کی تعلیم دی جاتی ہی کہیں وہ احمدی تو نہیں بنائے جاتے۔ اِس کا جواب بھی خواجہ صاحب نے تفصیل سے دیا ہے اور اپنے عقیدے کو بھی صاف صاف بتا دیا ہے۔ حکیم اجمل خاں صاحب نے بھی یہی سوال خواجہ صاحب سے کیا تھا۔ خواجہ صاحب نے اِس کے جواب میں ایک طویل خط جناب حکیم صاحب کے نام لکھا ہی جو اس کتاب میں درج ہے۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں بیشک احمدی ہوں۔ لیکن میں جناب مرزا صاحب مرحوم کو مجدد، ولی اور پیر و مرشد سمجھتا ہوں، نبی نہیں سمجھتا۔ خود حضرت میرزا صاحب نے بھی کبھی نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ چنانچہ وہ ایک جگہ فرماتے ہیں ع

"من نیستم رسول ونیاوردہ ام کتاب"

اور جہاں کہیں انھوں نے اپنے لئے نبی کا لفظ استعمال کیا ہی تو اس کے معنی حقیقی نبی کے نہیں ہیں، وہ اس سے ظلّی، مجازی، بروزی، جزوی نبوت مراد لیتے ہیں۔ چنانچہ مرزا صاحب اُن اولیائے کرام کے متعلق جن میں سے وہ اپنے آپ کو بھی سمجھتے تھے یہ فرماتے ہیں۔

"واِیشاں را رنگ انبیا دادہ می شود۔ درحقیقت انبیا نیستند۔ زیراکہ قرآن حاجت شریعت رابکمال رسانیدہ است"۔

خواجہ صاحب احمدیوں کے اُس فرقے کو بہت بُرا بھلا کہتے ہیں جو مرزا صاحب کو نبی مانتے ہیں۔ اور خود مرزا صاحب ہی کے اقوال سے اس کی تردید کرتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ احمدی فرقہ میں کوئی بات ایسی نہیں جو اسلام کے عقائد و اصول کے خلاف ہو۔ البتہ بعض جزئیات میں اختلاف ہے اور وہ ایسی ہیں کہ جس کے ماننے والے سلف صالحین میں بھی تھے۔ خواجہ صاحب انگلستان میں خالص اسلام اور کلمۂ توحید کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان کی تبلیغ کو کسی فرقے سے لگاؤ نہیں اور نہ وہ اسلام میں فرقہ بندی کے قائل ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان سے بدگمانی کریں اور خواہ مخواہ احمدیوں کو اسلام سے خارج سمجھیں یا اُن پر تبرّا کہیں اور کفر کے فتوے دیں۔

خواجہ صاحب نے جو خط حکیم اجمل خاں صاحب کو لکھا ہے اس میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں "بیشک میں پختہ کار احمدی ہوں اور فطرتاً اس امر کو چاہتا ہوں کہ دُنیا میں احمدیت پھیل جائے۔ لیکن میری احمدیت کا مقدم حصّہ یہی ہے جو میں نے اسلامک ریویو میں تبلیغ کیا اور جس سے کسی غیر احمدی نے بھی آج تک اختلاف نہیں کیا" جب یہ ہے تو پھر بیچ میں احمدیت کو لانے یا اسلامی تعلیم کو اس سے منسوب کرنے کی ضرورت ہے؟ خواجہ صاحب پختہ کار احمدی ہوں اس سے کسی کو اختلاف کا حق نہیں۔ لیکن ہماری رائے میں یہی ایک تھوڑی سی خامی اُن میں ہے۔ جو شخص اسلام سے فرقہ بندی مٹانا چاہتا ہے سب سے پہلے خود اُسے اس قید سے آزاد ہونا چاہیے ورنہ اِس بحث کا نام نہ لے۔

(کتاب دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ بہت اچھے کاغذ پر چھپی ہے۔ تقطیع چھوٹی صفحات ۲۰۸ قیمت قسم اوّل (عہ) قسم دوم (عہ) مسلم بک سوسائٹی۔ عزیز منزل لاہور سے مل سکتی ہے)

جدید رسالے

الفلاح۔ یہ نیا رسالہ مہینے میں دو بار انجمن اشاعت اسلام جالندھر کی سرپرستی میں شائع ہوتا ہے اڈیٹر غازی رحمت اللہ صاحب ہیں۔ اِس رسالہ کا مقصد دعوت و تبلیغ، انتقاد مذاہب، تصحیح عقائد اور اصلاح اعمال ہے۔ اس رسالہ میں جو دوسرا نمبر ہے، وید، اسلام و مسلم، بقیۂ شعبان و تہنیۂ رمضان، مسلم (نظم) اور

روئداد زنانہ مدرسۃ القرآن کے مضامین ہیں۔ تبلیغ وغیرہ کے متعلق کسی قسم کی کوئی خبر یا اطلاع درج نہیں ہے۔ مضامین معمولی درجے کے ہیں۔ یہ رسالہ غالباً ہندو مسلم اختلاف کے زمانہ کی پیداوار معلوم ہوتا ہے۔ رسالہ کے اس نمبر کی ضخامت ۴۰ صفحہ ہی لیکن معمولاً ۳۲ صفحہ ہوتی ہے سالانہ چندہ چار روپیہ ہی۔

نوائے ہند۔ یہ رسالہ انگلستان کی انجمن اُردو کا ہی جو انجمن ترقی اُردو کی شاخ ہی۔ اور ہندوستان کے طلبۂ مقیم انگلستان نے مرتب کیا ہی۔ تمام مضامین نظم و نثر انھیں صاحبوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان کی یہ کوشش بہت قابل قدر ہے۔ وطن کی یاد کا اس سے بہتر وہ اور کیا ثبوت دے سکتے تھے۔ وہاں وہ سب خواہ کسی ملت و مذہب کے ہوں، ہم زبان و ہم خیال ہیں۔ خدا کرے جب وہ اپنے وطن واپس آئیں تو یہ جذبہ اُن میں اور قوی ہو اور اپنے بدنصیب ہموطنوں کے لئے مثال بنیں۔ یہ رسالہ انجمن ترقی اُردو کی معرفت مُسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپا ہی۔ کاغذ اعلیٰ درجہ کا، لکھائی چھپائی اِس قدر نفیس اور پاکیزہ ہی کہ میری نظر سے اِس زمانے میں کوئی کتاب یا تحریر اس پایہ کی نہیں گزری۔ قابل یہ ہی۔ اِس کے لئے انسٹی ٹیوٹ پریس کے مستعد اور قابل منیجر مولوی محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی قابل ستایش ہیں۔ سال میں دو بار شائع ہوگا۔ قیمت فی پرچہ ۸/ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد، دکن سے مل سکتا ہے۔ میں اس کی خریداری کی بطور خاص سفارش کرتا ہوں آپ دیکھکر بہت خوش ہوں گے۔

علی گڑھ میگزین۔ یہ کوئی جدید رسالہ نہیں۔ علی گڑھ کالج سے یہ پہلے پہل، جسے غالباً تیس سال ہوتے ہیں، علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے ضمیمے کے طور پر نکلا تھا۔ کچھ دنوں بعد الگ شائع ہونے لگا۔ ایک حصہ اُردو دوسرا انگریزی ہوتا تھا۔ اِس کی ترتیب میں اُستاد شاگرد دونوں کا ہاتھ ہوتا تھا۔ مگر اِس کی حالت کبھی اچھی نہ تھی اور شرم معلوم ہوتی تھی کہ علی گڑھ کالج سے ایسا رسالہ نکلتا ہی۔ چند سال ہوئے دفعتہً اس نے کینچلی بدلی اور نئے رنگ روپ سے نکلا۔ اس کی تجدید و ترقی کا سہرا رشید احمد صاحب صدیقی ایم اے کے سر ہے انھوں نے اسے بنایا، بڑھایا، خود لکھا دوسروں سے لکھوایا۔ اپنی ظرافت نگار قلم سے کام لیا اور صاحب ذوق احباب سے مضمون بہم پہنچائے۔ چند ہی روز میں اِس کا شمار اُردو کے بہترین رسالوں میں ہونے

لگا۔ جب صدیقی صاحب طالب علمی کے حلقے سے نکل کر پروفیسری کے طبقے میں پہونچے (خوشی کی بات ہی کہ وہ آج کل یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر ہیں) تو یہ امانت یونیورسٹی کے ہونہار طالب علم خواجہ منظور حسین صاحب سلمہٗ کے تفویض ہوئی۔ خواجہ صاحب نے اسے اور چمکایا اور اس کی ترقی و تربیت میں ایسی مستعدی اور محنت سے کام کیا کہ ماشاء اللہ اب اسے نظر لگتی ہی اور ہر مہینے اس کا ظاہری اور باطنی جمال عروج پر نظر آتا ہی۔ خواجہ صاحب کی محنت لایق داد ہی اور اُن کا تقاضا قابلِ رشک۔ مضمون کے لیئے وہ اس طرح پنجے جھاڑ کے پیچھے پڑتے ہیں کہ بغیر جھوٹے سچے وعدے کے اُن سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہی اور وعدے کے بعد اُن کے ہاتھوں سے صحیح سلامت بچکر نکل آنا محال ہی مجھے کالج میگزین کی ایسی اچھی حالت دیکھکر حقیقی مسرت ہوتی ہی اور جب کبھی میں اپنے زمانے اور اِس زمانے کے میگزین کا مقابلہ کرتا ہوں تو بے اختیار میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ شاید یہی فرق اُس زمانے اور اِس زمانے کے طالب علموں میں بھی ہی۔

ترقیِ اُردو کے متعلق ایک نئی تحریک

اس میں شبہ نہیں کہ پنجاب کی ادبی زبان اب اُردو ہوگئی ہے اور اہلِ پنجاب نے جس شوق اور محنت سے اس کے حاصل کرنے اور ترقی دینے میں کوشش کی ہی وہ ہر لحاظ سے قابلِ شکریہ ہی۔ لاہور اِس صوبے کا علمی مرکز ہی۔ وہاں سے اِس قدر اُردو اخبار اور رسالے نکلتے ہیں اور اُردو کتابیں شائع ہوتی ہیں کہ ہندوستان کا کوئی شہر اِس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ علاوہ اِس کے مختلف انجمنیں خیالات و زبان کی ترقی کے لئے قایم ہیں۔ اہلِ لاہور کو اُردو زبان سے جو دلچسپی رہی ہی اور اِس وقت ہی وہ کسی تفصیل کی محتاج نہیں۔ ہمارے ایک عنایت فرمانے ہمیں اطلاع دی ہی کہ حال ہی میں ایک نئی تحریک اُردو زبان کی ترقی کے متعلق لاہور میں ہوئی ہے جس کا مقصد یہ ہی کہ پنجاب کو دلّی و لکھنؤ کے اہلِ زبان کی نام نہاد سیادت سے آزاد کیا جائے، اور اُن کی پیروی صرف اُس دور تک کی جائے جو اتیسؔر اور داغؔ پر ختم ہوگیا ہے نئے الفاظ حسبِ ضرورت تجویز کیے جائیں۔ اور دلّی اور لکھنؤ کی زبان میں جہاں اختلاف ہو وہاں تبرِ محاورہ

اختیار کیا جائے۔ اِس تحریک کو عمل میں لانے کے لئے عنقریب ایک ماہوار رسالہ بھی جاری ہونے والا ہے جس میں تمام مضامین صرف ادبائے پنجاب کی قلم سے ہوں گے۔ مختلف مضامین مختلف حضرات کے سپرد کیے گئے ہیں۔ وہ ان کا مطالعہ خاص طور پر کریں گے۔ پنجابی اور اُردو زبان میں جو محاورے یکساں استعمال ہوتے ہیں یا جن میں بہت تھوڑا فرق ہے اُن کی ایک لغت مرتب کی جائے گی۔

اس تحریک سے اہلِ لاہور کا شوق اور دلچسپی ظاہر ہے۔ ہم خوش ہیں کہ وہ اُردو زبان کی ترقی اور اصلاح میں مصروف ہیں۔ اہلِ دہلی و لکھنؤ کو بُرا ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ ضرورت ہو تو ان کی مدد کرنی چاہیئے۔ یہ وقت ایسا ہے کہ اُردو کی ترقی کے لئے جو کوشش بھی کی جائے (خواہ وہ کہیں ہو) اُسے غنیمت سمجھا جائے اور اس کی قدر کی جائے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں اور چند مقامی الفاظ کے لئے جھگڑے کرنا زبان کی ہمدردی نہیں بلکہ دشمنی ہے۔ ہم اہلِ لاہور کو مبارک باد دیتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ اُن کی سعی بارآور ہوگی بشرطیکہ اُن کی تحریک عامیانہ اور معاندانہ بحثوں سے پاک رہی۔

[illegible] ہر قسم کی کتابیں ... بذریعہ وی پی [illegible]

امیر مینائی مرحوم
- امیر اللغات ۲ جلد
- صنمخانۂ عشق
- مرآۃ الغیب
- خیابان آفرینش
- محامد خاتم النبیین
- مینائے سخن

منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذین
- حاجی بغلول
- میٹھی چھری
- پیاری دنیا
- کایا پلٹ
- طلسمی فانوس

پنڈت رتن ناتھ سرشار
- فسانۂ آزاد ۴ جلد
- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- کامنی

جلال لکھنوی مرحوم
- مضامین دلکش
- نظم نگارین
- سرمۂ زبان اردو
- رسالہ تذکیر و تانیث

مولانا عبدالحلیم شرر
- ابوبکر شبلی
- خواجہ معین الدین چشتی
- صقلیہ میں اسلام
- قیس و لبنیٰ
- مقدس نازنین
- ایام عرب ۲ جلد
- یوسف و نجمہ
- فتح اندلس
- ماہ ملک
- حسن کا ڈاکو ۲ جلد
- دربار حرامپور ۲ جلد
- فاتح مفتوح
- فلپانا
- لعبت چین
- عزیزہ مصر
- غیب دان دلہن
- فردوس بریں
- فلورا فلورنڈا
- روضۃ الکبریٰ
- تذکرہ مشاہیر عالم

شبیر حسن جوش ملیح آبادی
- روح ادب
- مقالات زرین
- آوازۂ حق
- اوراق سحر
- جذبات فطرت

حکیم محمد علیخان مرحوم
- رام پیاری کامل
- عبرت کامل
- حسن سرور کامل
- دیول دیوی
- گورا
- نیل کا سانپ
- جعفر و عباسہ
- اختر حسینہ کامل

منشی محمد الابرار شاد برق
- مرنالنی
- مار آستین
- بنگالی دولہن
- پرتاب
- معشوقۂ فرنگ

منشی احمد علی شوق قدوائی
- عالم خیال
- قاسم و زہرہ
- سیکفرن ودوسی

خواجہ عشرت لکھنوی
- لغات اردو
- اصول اردو
- شاعری کی پہلی کتاب
- شاعری کی دوسری کتاب
- شاعری کی تیسری کتاب

نواب مرزا داغ مرحوم
- آفتاب داغ
- انشائے داغ معہ یادگار داغ
- فریاد داغ
- انتخاب داغ

مولوی سید احمد دہلوی مرحوم
- راحت زمانی
- رسوم دہلی
- تسخیر شوہر
- مہر افروز بیگم
- انشائے ہادی النساء معہ تحریر
- لغات النساء
- علم اللسان

مرزا حیرت دہلوی
- سیر الرسول ۲ حصے
- کتاب شہادت ۲ حصے
- قصہ حاجی بابا اصفہانی
- روز الیبرٹ کامل
- مضامین حیرت

مولوی سجاد مرزا بیگ دہلوی
- الانسان
- الاستدلال
- حکمت عملی
- تسہیل البلاغت
- تمنائے دید

مولانا شہری مرحوم
- حیات انیس
- ایشیائی شاعری
- نور جہاں بیگم
- ٹیپو سلطان
- حیدر علی سلطان

مولوی بشیر الدین احمد دہلوی
- واقعات دار الحکومت دہلی
- تاریخ بیجاپور
- شمع ہدایت
- لخت جگر ۲ حصے
- اصلاح معیشت
- حسن معاشرت
- اقبال دولہن

مولانا اسلم جیراجپوری
- حیات حافظ
- حیات جامی
- علوم عرب
- خواتین
- تاریخ الامت ۲ جلد

مولوی مصباح الدین احمد
- الہارون
- محاربۂ فرانس و پرشیا
- الباب الاحادیث
- گلستان عرب

مولوی عبدالرزاق کا[نپوری]
- البرامکہ
- نظام الملک طوسی مجلد

حکیم احمد حسین الہ[آبادی]
- مترجمہ تاریخ ابن خلدون جلد [اول]
- جلد دوم
- جلد سوم
- جلد چہارم
- جلد پنجم
- جلد ششم
- جلد ہفتم
- دو جلد ہشتم و نہم
- جلد دہم
- جلد یازدہم
- سلطان صلاح الدین
- سلطان نجم الدین محمد

پروفیسر احسان [اعجاز]
- ترجمہ قرآن مجید
- تاریخ الاسلام
- الاسلام
- زاہرہ
- نشتر سخن

مولوی سعید احمد [مارہروی]
- آثار اکبری
- حیات خسرو

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

جسٹس محمود مرحوم
- کتاب الطلاق
- کتاب الشفعہ
- شرح قانون شہادت

مولوی عزیز مرزا مرحوم
- خیالات عزیز
- دکرم اروسی

خواجہ غلام الثقلین مرحوم
- روزنامہ سیاحت
- فلسفیانہ لکچر اسلام پر

مولوی عبدالغنی وارثی
- مسلمانان اندلس
- تنقیح حقوق نسوان

پروفیسر نواب علی ایم اے
- تذکرۃ المصطفٰے
- معارج الدین
- صحف سماوی
- فیع سخن

خواجہ عبداللہ اختر بی اے
- مشاہیر اسلام
- بیشق
- بغداد
- صدیق اکبر

محمد ہادی الحسن بی اے
- امراؤ جان ادا
- شریف زادہ
- خونی عاشق
- خونی مصور
- خونی شہزادہ
- لیلیٰ مجنوں (ڈراما)
- مثنوی امید و بیم

مولوی ظفر علی خاں بی اے
- معرکہ مذہب و سائنس مجلد
- خیابان فارس جلد اول
- فلسفہ ابن سینا
- ڈراما جنگ روس و جاپان
- جنگل میں منگل

مولوی عبدالماجد بی اے
- مکالمات برکلے
- زود پشیمان

پروفیسر فیروزالدین مراد
- تحفہ سائنس
- خونابہ عشق
- حکایات شرلک ہومز

منشی احمد علی بی اے
- شباب لکھنو
- مرقع اودھ

ڈاکٹر اقبال ایم اے
- ملت بیضا
- مکمل ترانہ
- شکوہ
- جواب شکوہ
- نالہ یتیم
- فریاد امت
- بلال
- شمع و شاعر
- خضر راہ

مسٹر سجاد حیدر یلدرم
- خیالستان مجلد
- زہرا
- ثالث بالخیر

منشی محمد لطیف مرحوم
- اکبر
- اورنگ زیب
- لارڈ کلایو
- رنجیت سنگھ

پیر تیرتھ رام فیروزپوری
- فسانہ لندن ۴ جلد
- وطن پرست
- منزل مقصود
- روحوں کا خراج
- خونی ہیرا

مولوی محمد علی ایم اے
- سیرۃ خیر البشر
- النبوت فی الاسلام
- جمع قرآن
- مقام حدیث

مفتی انوار الحق ایم اے
- تذکرۃ الحبیب
- حقائق اسلام
- اثبات واجب الوجود
- تاریخ ابو البشر
- قوت خیال

مسٹر عنایت خاں بی اے
- دعوت اسلام
- ارض نہرین
- زلفی

مسٹر الیاس برنی ایم اے
- اسرار حق
- معارف ملت
- مناظر قدرت
- جذبات فطرت

مسٹر ظفر عمر بی اے
- مستقبل اسلام
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری
- چوروں کا کلب

مولوی سید سلیمان ندوی
- ارض القرآن جلد دوم
- حیات امام مالک
- اہل السنۃ والجماعۃ
- خلافت و ہندوستان
- دروس الادب

مولوی عبدالسلام ندوی
- اسوۂ صحابہ ۲ جلد
- امام مسلم
- انقلاب امم

پروفیسر عبدالباری ندوی
- مبادی علم انسانی
- برکلے کا فلسفہ
- مذہب عقلیات

پروفیسر محمود علی
- دین و دانش
- الایمان

مولوی محمد حلیم انصاری
- تمدن اسلام ۲ جلد
- الاسلام والنصرانیہ
- اسلام اور سوشل ریفارم
- جواہر قرآنی
- فلاح دارین
- فتح اندلس

مولوی عبداللہ العماد[…]
- کتاب المعارف
- محکمات
- تاریخ عرب قدیم
- علم الحدیث
- مناظرۃ العرب
- محرم کی بدعتیں

مولوی سید ممتاز[…]
- تذکرۃ الانبیا
- شیخ حسن

نیاز فتح پور[…]
- گہوارۂ تمدن
- ترجمہ گیتان جلی
- جذبات بھاشا
- کیوپڈ اینڈ سائکی

سیماب اکبرآباد[…]
- خدیجۃ الکبریٰ
- بنت الرسول
- سیرۃ الحسین
- جام کوثر

بابو شیو چرن[…]
- سوانح ٹالسٹا[…]
- ٹالسٹائے کی کہا[…]
- ہماری مشکلات

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

ٹ شائقین کی خدمتمیں بادب التماس ہے کہ فرمائش بھیجتے وقت اس اشتہار کا حوالہ ضرور دیں اور ایک روپیہ سے کم کا مال بذریعہ وی پی نہ منگائیں

اشرف علی تھانوی
- طیب فی ذکر النبی الحبیب
- تعلیم الدین
- تیر اثبات التقدیر
- اصلاح الرسوم
- مثنوی ۲ جلد
- مناجات مقبول
- بہشتی زیور ۱۰ حصے
- بہشتی گوہر
- شوق العلم
- انقلابات امت

مولوی فتح محمد جالندھری
- ترجمہ کلام مجید
- ارشادات القرآن
- خلاصۃ القصص والحکایات
- الاسلام
- مصباح القواعد

منشی خلیل الرحمن
- ترجمہ تاریخ الخلفا
- تاریخ الاندلس
- مختصر تاریخ اسلامی

منشی نوازش علیخان
- سفرنامہ ابن بطوطہ
- قسطنطنیہ
- ڈیوٹی

جسٹس سید کرامت حسین مرحوم
- علم الاخلاق
- افراد کا سسیہ

علامہ سید احمد لکھنوی
- حمایۃ الاسلام ۲ حصے
- فن ہیئت
- فن کیمسٹری
- حیات فردوس مکان

مرزا سلطان احمد
- اساس الاخلاق
- علوم القرآن
- مشیر وطن
- النظر
- نبوت
- النساء فی الاسلام

مہاشی پرکاش دیو
- حضرت محمد صلعم
- مہاتما بدھ
- سیرۃ المستورات
- بچوں کی کہانیاں

وجاہت حسین جھنجھانوی
- حضرت بلال
- فتوح عبدالحمید خان
- قومی ماتم

مولوی حبیب الرحمن خان شروانی
- سیرۃ الصدیق
- علمائے سلف
- اسلامی اخلاق
- نقش وفا

نواب علی حسن خان
- فطرت الاسلام مجلد
- المدنیۃ فی الاسلام
- اسرار حسن
- نالۂ دل

مولانا عبدالشکور کاکوروی
- ترجمہ ہدایۃ الغایہ جلد
- علم الفقہ ۲ حصے
- ترجمہ تاریخ طبری

مولوی نجم الغنی رامپوری
- تاریخ اودھ ۴ حصے
- بحر الفصاحت
- مختصر الاصول
- مذاہب الاسلام

حافظ عبدالرحمن امرتسری
- سفرنامہ بلاد اسلامیہ
- سفر یورپ ۲ حصے
- کتاب الصرف
- کتاب النحو

نواب حاجی اسمٰعیل خان
- فلاح دارین
- حالات زمین
- خدا با صدا
- ترکی کہانیاں

مولوی شبیر احمد انصاری
- تحریر المراۃ
- المدنیۃ والاسلام

قاضی محمد سلیمان منصور پوری
- رحمۃ للعالمین ۲ جلد
- مہر نبوت

مولوی شیخ عبدالرؤف
- دلائل فضائل الاسلام
- البرہان علی فلسفۃ القرآن

سید رفیع رضوی موہانی
- مخزن الفوائد
- تاج و نشان
- گنج شائگان
- دستار و کلاہ
- کنز الطغری

ملک محمد الدین آعوان
- سیرۃ عائشہ صدیقہ
- خاتون جنت

منشی محمد حسن خان
- ہاجرہ
- ترکوں کی معاشرت

سید افتخار عالم مارہروی
- حیات النذیر
- وکیل نسواں

مولانا راشد الخیری دہلوی
- صبح زندگی
- شام زندگی
- شب زندگی ۲ حصے
- نوحہ زندگی
- عروس کربلا
- جوہر قدامت
- ماہ عجم
- یاسمین شام
- الزہراء
- مودودہ
- بنت الوقت
- سراب مغرب
- منازل السائرہ
- سات روحوں کے اعمالنامے

مولوی سید تصدق حسین قرار
- قرار اللغات
- قرار الاصطلاحات
- قرار المحاورات

خواجہ حسن نظامی دہلوی
- سیپارہ اول
- میلاد نامہ
- محرم نامہ
- یزید نامہ
- محفل نامہ گیارھویں
- فاطمی دعوت اسلام
- کرشن جیون
- کم تو موت
- بیوی کی تعلیم
- بیوی کی تربیت
- اولاد کی شادی
- آتالیق خطوط نویسی
- خطوط حسن نظامی
- جگ بیتی کہانیاں
- غدر دہلی کے افسانے ۸ جلد

مسز سلطان حیدر جوش
- ابن مسلم
- نواب فرید

مولوی محمد حسین محوی
- ازدواج الانبیا
- انسانی قربانیاں

صفدر مرزاپوری
- مرقع ادب
- مشاطۂ سخن

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مطبوعات انجمن

تاریخ تمدن۔ سرٹامس بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا
ترجمہ ہے۔ الف سے یے تک تمدن کے ہر مسئلہ پر کمال
جامعیت سے بحث کی گئی ہے اور ہر اصول کی تائید میں تاریخی
اسناد سے کام لیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے معلومات میں
انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے حصہ اول عہر
کلدار حصہ دوم عا، کلدار

مقدمات الطبیعات۔ یہ ترجمہ ہے مگر انگلستان
کے مشہور سائنس داں حکیم ہکسلی کی کتاب کا جس کا نام
کتاب کی کافی ضمانت ہے اس میں بظاہر فطرت کی بحث
درج ہے لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ہے۔ عا کلدار

القول الاظہر۔ امام ابن مسکویہ کی معرکۃ الآرا تصنیف
فوز الاصغر کا یہ اردو ترجمہ ہے یہ کتاب فلسفہ الہین کے
اصول پر لکھی گئی ہے اور مذہب اسلام پر انھیں اصول
کو منطبق کیا گیا ہے۔ قیمت عہ کلدار

رہنمایان ہند۔ مشہور کتاب پروفیٹس اوف انڈیا
کا ترجمہ ہے۔ ہندو مذہب کے برگزیدہ عقاید کا بیان
فاضلانہ مگر دلکش پیرایہ لکھا ہے۔ اس کے بعد سری کرشن جی
مہاراج گوتم بدھ وغیرہ کے حالات ہیں عہر کلدار

القمر۔ قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت
کے بعد چاند کے متعلق جو جدید انکشافات ہوئے ہیں
اُن سب کو جمع کر دیا ہے۔ طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک
نعمت ہے۔ ۱ر کلدار

البیرونی۔ کمالات ذہنی میں ابوریحان بیرونی کا مرتبہ
تعریف سے مستغنی ہے۔ دسویں صدی کا فاضل ہے۔ مگر
تبحر علمی اور دقیق النظری میں بیسویں صدی کا محقق معلوم
ہوتا ہے۔ البیرونی اس کے حالات زندگی اور کمالات علمی
پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلد عا کلدار

قاعدہ و کلید قاعدہ۔ یہ قاعدہ مدت کے غور و خوض
کے بعد اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے جن اصول اور طریقہ
پر اس کی تعلیم ہونی چاہیئے اُن کی تشریح کے لئے ایک کلید
بھی تیار کی گئی ہے۔ قاعدہ ۲ر کلدار کلید قاعدہ ۴ر کلدار

فلسفۂ تعلیم۔ ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلہ تعلیم
کی آخری کتاب ہے۔ غور و فکر کا بہترین کارنامہ والدین و
معلم کے لئے چراغ ہدایت ہے تربیت کے ربانی قوانین
کو اس قدر صحت کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے
اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے۔ قیمت (سے) کلدار

نپولین اعظم۔ ایبٹ کی مستند کتاب کا اردو ترجمہ کتاب
کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ نپولین کی زندگی بشری جدوجہد
کا آخری باب ہے۔ واقعات کی داد یا تو سکندر کی زبان
ادا کرسکتی ہے یا تیمور کی زبان۔ ترجمہ آسان اور
عام فہم ہے۔ قیمت [illegible] کلدار

دریائے لطافت۔ ہندوستان کے مشہور سخن سنج
میر انشاء اللہ خاں کی تصنیف ہے اردو صرف نحو اور محاورات
اور الفاظ کی پہلی کتاب ہے۔ اس میں زبان کے متعلق بعض
عجیب وغریب نکات درج ہیں قیمت [illegible] کلدار

طبقات الارض۔ اس فن کی پہلی کتاب ہے تین سو
صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قلمبند کئے ہیں۔ کتاب کے
آخر میں انگریزی مصطلحات اور اُن کے مرادفات کی
فہرست بھی منسلک ہے۔ قیمت [illegible] کلدار

مشاہیر یونان و روما۔ ترجمہ ہے سیرت نگاری اور
انشاء پردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے
آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہے۔ ادبیان عالم بلکہ شکسپیر تک
نے اس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہے۔ وطن پرستی اور بے نفسی
عزم و جوانمردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ معمور ہے
جلد اول غیر مجلد (سے) کلدار جلد دوم غیر مجلد [illegible] کلدار

اسباق النحو۔ ملک کے ادیب کامل مولانا حمید الدین
صاحب بی اے کی تالیف ہے۔ اختصار کے باوجود عربی
صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے قیمت [illegible] کلدار

علم المعیشت۔ اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر
محمد الیاس صاحب برنی ایم اے نے ملک پر بہت بڑا احسان
احسان کیا ہے۔ معیشت پر یہ کتاب جامع و مانع ہے۔ مبہم
و مشکل مسائل کو پانی کر دیا ہے۔ اس کے اکثر باب نہایت
عجیب و غریب ہیں۔ اشتراکیت کا باب قابل دید ہے
حجم ۵۲۵ قیمت مجلد [illegible] کلدار

تاریخ اخلاق یورپ۔ اصل مصنف پروفیسر لیکی کا نام
علم و تبحر، تحقیق و صداقت کا مرادف ہے یہ کتاب کئی ہزار
برس کے تمدن معاشرت، اصول اخلاق مذاہب و
خیالات کا مرقع ہے حصہ اول (سے) حصہ دوم مجلد [illegible] کلدار

تاریخ یونان قدیم۔ یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے
مستند کتابوں کا خلاصہ ہے۔ اور زبان کے لحاظ سے سلاست
و شگفتگی کا نمونہ اس کا نقطۂ خیال خالصاً ہندوستانی ہے
ایف اے کلاس کے طلباء جو یونانی قدیم تاریخ سے گھبراتے ہیں
اس کتاب کو انتہا درجہ مفید پائیں گے مجلد [illegible] کلدار

انتخاب کلام میر۔ میر تقی میر تاج شعرائے اردو کے
کلام کا انتخاب ہے مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی
اردو نے یہ انتخاب ایک مدت کی سعی و محنت کے بعد کیا ہے
اور شروع میں میر صاحب کی خصوصیات شاعری پر ۴۰ صفحہ کا
ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے۔ قیمت [illegible] کلدار

رسالہ نباتات - اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے
علمی اصطلاحات سے معرّا، سلاست و روانی سے مملو
اور دلچسپ و مفید ہے - طلبا ٔ نباتات جس مسئلہ کو انگریزی
میں نہ سمجھ سکیں وہ اس رسالہ میں مطالعہ کریں قیمت مجلد ۱۲ کلدار

دیباچہ صحت - اس کتاب میں مطالبات صحت مثلاً
ہوا، پانی، غذا، لباس، مکان وغیرہ مبسوط اور دلچسپ
بحث کی گئی ہے - زبان عام فہم اور پیرایہ مؤثر و دل پذیر ہے
ملک کی بہترین تصنیف ہے اس کا مطالعہ کئی ہزار نسخوں سے
زیادہ قیمتی ثابت ہوگا - حجم ایک ہزار صفحے قیمت مجلد للعہ

قواعد اُردو - ارباب فن کا اتفاق ہے - کہ اُردو زبان
میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھے گئے - بسط و شرح کے
علاوہ اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی قواعد کا تتبع
نہیں کیا گیا ہے - قیمت عما کلدار

نکات الشعرا - یہ اُردو کا تذکرہ استاد الشعرا میر تقی مرحوم
کی تالیف سے ہے - اس میں بعض ایسے شعرا کے حالات
بھی ملیں گے جو عام طور پر معروف نہیں، نیز میر صاحب
کی رائیں اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل
ہیں - مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی صدر الصدور
امور مذہبی سرکار عالی نے اس پر ایک ناقدانہ اور
دلچسپ مقدمہ لکھا ہے - قیمت مجلد ۱۲ کلدار

فلسفۂ جذبات - کتاب کا مصنف ہندوستان کا
مشہور نفسی ہے - جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت
پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھ بحث کی گئی
ہے متعلمان نفسیات اسے نہایت مفید پائیں گے - مجلد
۱۲ کلدار غیر مجلد عما کلدار

وضع اصطلاحات - یہ کتاب ملک کے نامور انشا پرداز
اور عالم مولوی وحید الدین سلیم (پروفیسر عثمانیہ کالج) نے
سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعہ کے بعد تالیف کی ہے
بقول فاضل مولف "یہ بالکل نیا موضوع ہے - میرے علم
میں شاید کوئی ایسی کتاب نہ آج تک یورپ کی کسی زبان
میں لکھی گئی ہے نہ ایشیا کی کسی زبان میں" اس میں وضع اصطلاحات
کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول
قائم کئے گئے ہیں - مخالف موافق رایوں کی تنقید کی گئی ہے اور
زبان کی ساخت اور اس کے عناصر ترکیبی مفرد و مرکب اصطلاحات
کے طریقے سابقوں اور لاحقوں اردو مصادر اُن کے مشتقات
غرض سینکڑوں دلچسپ اور علمی بحثیں زبان کے متعلق آگئی ہیں"
اُردو میں بعض اور بھی ایسی کتابیں ہیں جن کی نسبت یہ کہا
جا سکتا ہے کہ زبان میں اُن کی نظیر نہیں - لیکن اس کتاب نے
زبان کی جڑیں مضبوط کر دی ہیں اور ہمارے حوصلہ بلند کر دئے
ہیں - اس سے پہلے ہم اُردو کو علمی زبان کہتے ہوئے جھجکتے
اور اس کی آیندہ ترقی کے متعلق دعوے کرتے ہوئے ہچکچاتے
تھے مگر اس کتاب کے ہوتے یہ اندیشہ نہیں رہا - اس نے

حقیقت کا ایک باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہی۔ تعداد صفحات ۵۰۲ قیمت مجلد ۱۲ کلدار

نفح الطیب ۔ یہ کتاب اسلامی عہد کی تاریخ اسپین کی معلومات کا خزانہ ہے۔ خلافت اسپین کے ہر مورّخ کو اس کی خوشہ چینی کرنی پڑی ہی۔ علامہ مقریزی کی نامور اور مشہور آفاق کتاب ہے جو پہلی دفعہ اُردو میں ترجمہ ہوئی ہے۔ یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں بھی داخل ہے۔ صفحات ۴۰۶ قیمت مجلد (۴) کلدار

محاسنِ کلامِ غالب ۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کا معرکۃ الآرا مضمون ہی۔ اُردو زبان میں یہ پہلی تحریر ہے جو اس شان کی لکھی گئی ہی یہ مضمون اُردو کے پہلے نمبر میں طبع ہوا تھا صاحب نظر قدر دانوں کے اصرار سے الگ طبع کیا گیا ہے۔ غیر مجلد قیمت ۱۲ کلدار

دیوانِ غالب جدید و قدیم ۔ یہ وہ نایاب کلام ہی جس کی اشاعت کا اہل ملک کو بیحد انتظار تھا اس میں میرزا غالب کا قدیم و جدید تمام کلام موجود ہے۔ میر صاحب کے قدیم کلام ملنے کی کسے توقع تھی۔ یہ محض حسن اتفاق تھا کہ ہاتھ آگیا اور اب ریاست بھوپال کی سرپرستی میں چھپکر شایع ہوا ہی۔ معہ مقدمہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن غیر مجلد ۱۲ مجلد ۵ کلدار (بلا مقدمہ غیر مجلد ۱۲ کلدار مجلد ۱۲ کلدار)

مللِ قدیمہ ۔ ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہی۔ اس میں بعض قدیم اقوام سلطنت کلدانی، آشوری بابل بنی اسرائیل و فنیقیہ کی معاشرت عقاید صنعت و حرفت وغیرہ کے حالات دلچسپی اور خوبی کے ساتھ دئے ہیں۔ اُردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے ان قدیم اقوام کے حالات صحیح طور سے معلوم ہو سکیں اس لئے انجمن نے اسے خاص طور پر طبع کرایا ہے۔ حالات کی وضاحت کے جابجا تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ صفحہ ۴۷۲ قیمت ۱۲ کلدار

بجلی کے کرشمے ۔ یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خاں صاحب بی اے نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھی ہے۔ برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہی اور سہل زبان میں لکھی ہے۔ ہمارے بہت سے ہم وطن یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے کہاں سے آتی ہی کیا کام آ سکتی ہے۔ یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے لڑکے لڑکیوں کے لئے بھی مفید ہی۔ مجلد قیمت ۱۲ کلدار

ملنے کا پتہ :۔ صدر دفتر انجمن ترقی اُردو۔ اورنگ آباد (دکن)

حقیقت کا ایک باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہی۔ تعداد صفحات ۵۰۰ قیمت مجلد ۱۲ روپے کلدار

نفح الطیب ۔ یہ کتاب اسلامی عہد کی تاریخ اسپین کی معلومات کا خزانہ ہے ۔ خلافت اسپین کے ہر مؤرخ کو اس کی خوشہ چینی کرنی پڑی ہی ۔ علامہ مقریزی کی نامور اور مشہور آفاق کتاب ہے جو پہلی دفعہ اُردو میں ترجمہ ہوئی ہے ۔ یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں بھی داخل ہے ۔ صفحات ۴۰۰ قیمت مجلد (۴ روپے) کلدار

محاسنِ کلامِ غالب ۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کا معرکۃ الآرا مضمون ہی ۔ اُردو زبان میں یہ پہلی تحریر ہے جو اس شان کی لکھی گئی ہی یہ مضمون اُردو کے پہلے نمبر میں طبع ہوا تھا صاحب نظر قدر دانوں کے اصرار سے الگ طبع کیا گیا ہے ۔ غیر مجلد قیمت ۱۲ کلدار

دیوانِ غالبؔ جدید و قدیم ۔ یہ وہ نایاب کلام ہی جس کی اشاعت کا اہل ملک کو بیحد انتظار تھا اس میں میرزا غالب کا قدیم و جدید تمام کلام موجود ہے ۔ میر صاحب کے قدیم کلام ملنے کی کسے توقع تھی ۔ یہ محض حسن اتفاق تھا کہ ہاتھ آگیا اور اب ریاست بھوپال کی سرپرستی میں چھپکر شایع ہوا ہی ۔ معہ مقدمہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن غیر مجلد للعہ مجلد صہ کلدار (بلا مقدمہ غیر مجلد ۱۲ کلدار مجلد ۴ روپے کلدار)

مللِ قدیمہ ۔ ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہی ۔ اس میں بعض قدیم اقوام سلطنت کلدانی ، آشوری بابل بنی اسرائیل و فنیقیہ کی معاشرت عقاید ، صنعت و حرفت وغیرہ کے حالات دلچسپی اور خوبی کے ساتھ دئے ہیں ۔ اُردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے ان قدیم اقوام کے حالات صحیح طور سے معلوم ہوسکیں اس لئے انجمن نے اسی خاص طور پر طبع کرایا ہے ۔ حالات کی وضاحت کے جابجا تصویریں بھی دی گئی ہیں ۔ صفحہ ۴۰۰ قیمت ۱۲ کلدار

بجلی کے کرشمے ۔ یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خاں صاحب بی اے نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھی ہے ۔ برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہی اور سہل زبان میں لکھی ہے ۔ ہمارے بہت سے ہم وطن یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے کہاں سے آتی ہی کیا کام آسکتی ہے ۔ یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے لڑکے لڑکیوں کے لئے بھی مفید ہی ۔ مجلد قیمت ۱۲ کلدار

ملنے کا پتہ :۔ صدر دفتر انجمن ترقی اُردو ۔ اورنگ آباد (دکن)

اردو

۱۔ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کریگا۔

۲۔ یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان و ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

حجم کم سے کم ۱۵۰، اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰ صفحہ ہوگا۔

۳۔ قیمت نو روپئے بارہ آنے سالانہ معہ محصول ڈاک اور ارکانِ انجمن ترقی اردو سے آٹھ روپئے بارہ آنے۔

۴۔ تمام خط و کتابت آنریری سکرٹری انجمن ترقی اردو و اڈیٹر اردو اورنگ آباد سے ہونی چاہیئے۔

(باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپا اور دفتر سے شائع ہوا)